آزاد کی کہانی

خود

آزاد کی زبانی

حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

آزاد کی کہانی
خود
آزاد کی زبانی

مولانا ابوالکلام آزاد

سول ایجنٹ بمبئی

اے۔ آر۔ تلمیائی اینڈ سنس

۲۰۵ پاٹکا مینشن۔ بمبئی ۳

آزاد کی کہانی
خود
آزاد کی زبانی

بہ روایت: ملیح آبادی

حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی

بار اوّل	۱۸ اپریل ۱۹۵۸ء
تعداد طباعت	دو ہزار
قیمت	چھ رُوپے

مطبوعہ

یُونین پرنٹنگ پریس دہلی

ترتیب

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد!

آنسو!

مختصر حالِ چشم و دل یہ ہے　　　اِس کو آرام، اُس کو خواب نہیں!

کہہ رہے ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد چل بسے۔ دنیا سے رخصت ہو گیے، مرحوموں میں مِل کر مرحوم ہو گیے۔

کیوں نہیں ہ، مولانا پر اَن گنت الٰہی رحمتیں ہمیشہ برساکیں۔ برستی ہی چلی گئیں اور آخر میں مولانا کی خود ذات ہی رحمت الٰہی بن گئی!

یہ مرتبۂ بلند مِلا، جس کو مل گیا

لیکن میرا عہد ہے — اپنے ضمیر سے، اپنے مولانا سے، اپنے خدا سے کہ جیتے جی، مولانا کو نہ "مرحوم" تسلیم کروں گا، نہ "مرحوم" کہوں گا، نہ "مرحوم" لکھوں گا!

غافل دنیا! کیا مولانا سچ مچ مر چکے ہیں؟ کہتے رہو، لیکن جانتا ہوں، یقین سے جانتا ہوں کہ مولانا مرے نہیں ہیں۔

ہاں، ہاں دہلی کی جامع مسجد کے سامنے ایک مزار بھی بن چکا ہے۔

مرجع علائق بھی ہو چکا ہے خود یہ بد نصیب آنکھیں بھی ۔ کاش آنکھیں ہی نہ ہوئی ہوتیں ۔ اُس قبر پر آنسو بہا چکی ہیں ، اور زبان سے بے اختیار چیخ نکل گئی تھی !

تنہا گیے کیوں ؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور !

اور پھر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی ، جس کا کسی زبان میں کوئی نام نہیں :

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

مگر میرے پیے تو مولانا مرے نہیں ہیں ۔ یہ دیکھو ، میرے دل کی آنکھوں کے سامنے جیتے جاگتے بیٹھے ہیں ۔ اُسی شان سے ، اُسی سنجیدگی سے ، اُنکی تمام رعنائیوں کے ساتھ بیٹھے ہیں ۔ وہی مَن موہن مکھڑا ہے ۔ وہی ہشاش بشاش چہرہ ہے ، ہونٹوں پر وہی دلفریب تبسّم کھیل رہا ہے ۔ باتیں ہو رہی ہیں ، پھول جھڑ رہے ہیں ۔ موتی ہیں کہ بکھرتے چلے جا رہے ہیں ۔ ادھر گنج گنج زبان ہے ۔ ہاں ، ہوں ہو رہی ہے ۔ اُدھر فصاحت و بلاغت کے سمندر ہیں کہ بڑے موجیں مار رہے ہیں !

تو اب خدارا ، کوئی مجھے بتا دے کہ اپنے آپ کو ، اپنے دل کو ، اپنے ضمیر کی آنکھوں کو جھٹلا دوں ، تو کیونکر جھٹلا دوں ؟

دوستو ، مولانا مرے نہیں ہیں ۔ مر سکتے بھی نہیں ۔ مرنے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئے تھے ۔ زندہ ہیں ۔ زندہ رہیں گے ۔ رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے ۔

میرے دِل میں زندہ رہیں گے۔ تمہارے دِل میں بھی زندہ رہیں گے سارے جہان کے دلوں میں زندہ رہیں گے۔

ہاں بس اتنا ضرور ہوا ہے کہ ہم سے ذرا اُوجھل ہو گیے ہیں۔ آسمان کے سورج نے زمین کے "سورج" سے خوشامد کی! کچھ اِدھر کا بھی اشارہ چاہیے ہم سے بھی کچھ سرگوشیاں ہو جائیں!

ستارے اُتر کر راہ میں بچھ گیے۔ دَھنک کی سواری حاضر تھی۔ کہکشاں نے رکاب تھام لی، اور مولانا، ہم سے چھپ گیے!

اور یہ کوئی عجیب، انوکھی، اَن ہونی بات بھی نہیں۔ مولانا اپنی مادّی زندگی ہی میں حقیقتِ کبریٰ کے اِس سِدرۃُ المُنتہیٰ تک پہنچ چکے تھے۔ اِس ماجرے کا کچھ حال خود مولانا کی زبان سے سنیے؛ حالانکہ ہر لفظ کے معنیٰ کچھ اور ہی ہیں:

"وہی دنیا جس کے میکدہ خود فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے، اپنے ہر جلوے سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمے سے کانوں کو سرمستی و سرشاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں، اب اُس کا کونہ کونہ، چپّہ چپّہ ہشیاری و بینش کا مُرقّع تھا۔ بصیرت و معرفت کا درس تھا۔ ذرّے ذرّے کو گرمِ گفتار پایا۔ پتّے پتّے کو مکتوب و مسطور دیکھا۔ پھولوں نے زبان کھولی۔ پتھروں نے اُٹھا اُٹھا کر اشارے کیے۔ خاکِ پامال نے اُڑ اُڑ کر گہر افشانیاں کیں۔ آسمانوں کو بار ہا اُترنا پڑا، تاکہ سوالوں کا جواب دیں۔ زمین کو کتنی ہی مرتبہ اچھالنا پڑا، تاکہ فضائے آسمانی کے تارے توڑ لائیں۔ فرشتوں نے بازو تھامے کہ لغزش نہ ہو جائے۔ سورج، چراغ

لے کر آیا کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ سب نے نقاب اُتار دیے۔ سارے پردے چھلنی ہو گیے۔ سب کی ابروؤں میں اشارے تھے۔ سب کی آنکھوں میں حکایتیں بھری تھیں۔ سب کے ہاتھ بخشش و قبولیت کے لیے دراز تھے۔ بادل کو پکڑا، تو سازِ ہستی کا طنبورہ نکلا۔ بجلی کو پاس بُلایا، تو لب ہائے راز کا ایک تبسّم آشکارا نکلی۔ ہوا کے جھونکے مُٹھیوں میں آ گیے، مگر پھر بھی خالی رہیں۔ سمندر نے اپنی ساری موجیں خرچ کر دیں، مگر پھر بھی ہمارے ہاتھوں کا پیالہ نہ بھرا۔ رات معدوم تھی۔ ظلمت کی بڑی ڈھونڈ ہوئی، مگر نہ ملی۔ خوابِ غفلت کا لاکھ پتہ پوچھا، مگر کسی نے نہ بتلایا۔ جب کبھی آنکھیں بند کیں، تماشے دیکھے۔ جب کبھی کان بند ہوے، صداؤں اور نواؤں سے بھر گیے۔ سورج نے کہا، دو لاکھ میل دُور ہوں، قطبِ شمالی سے روشنی اُتری اور بولی، ایک سکنڈ میں ایک لاکھ نوّے ہزار میل طے کرتی ہوں، مگر آنکھوں نے کہا، یہ تو تارِ نگاہ کی پہلی منزل ہے، اور دل ہنسا کہ اپنا پیامِ محبّت جب شوق کے پروں پر اُڑتا ہے، تو بھلا روشنی کی لنگ پائی کب اُس کا ساتھ دے سکتی ہے! غرضکہ ہمّتِ خوابیدہ جاگ اُٹھی اور دلِ رفتہ پھر نئی نئی طاقتوں اور نیئے نیئے ارمانوں کے ساتھ واپس آ گیا۔ عالمِ آفاق و انفس میں جو کچھ ہے، اُس میں سے کوئی بھی نہ تھا۔ جس کی ابرو پر گرہ یا آنکھوں میں غمزہ نہ ہو۔ سب کی زبانیں گویا، سب کے اشارے آشکارا، سب کی سطریں اُبھری ہوئی تھیں۔ نہ کوئی لب بند رہا، نہ کوئی جلوہ مستور۔ نہ آنکھوں نے دیکھنے میں کمی کی، نہ کانوں نے سننے میں۔ چشم و گوش نے جو کچھ بہم پہنچایا، دل کی وسعت نے سب کو سمیٹ لیا۔ اِس سے زیادہ اور کیا کہا جائے؟

"اللہ اللہ، دولتِ سعادت و قبولیت کی فراوانی، اور سبحان اللہ بخشش و لطفِ غیبی کی بے پایانی! سمندر اُس کی وسعتِ فیض کا ایک قطرہ، مگر یہ گستاخی ہے۔ سورج اُس کے انوارِ کرم کی ایک شعاع، مگر یہ بھی نادانی ہے"

نہیں، یہ بات نہیں کہ "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" پر ایمان نہیں۔ ایمان ہے، پکّا ایمان۔ یقین ہے، حق الیقین، عین الیقین۔ مشاہدہ ہے، عمر بھر کا مشاہدہ۔ بے شک سانس لینے والے بھی اور سانس نہ لینے والے بھی، سبھی کے لیے موت مقرر ہے، حتمی ہے۔ اٹل ہے۔

یہ سب سچ ہے۔ حق ہے۔ شک سے بالا ہے، مگر کیا نفوسِ قدسیہ بھی مرجایا کرتے ہیں؟ کیا ابراہیمؑ، نوحؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، ذکریاؑ، یحییٰؑ مر چکے ہیں؟

کیا ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، علی مرتضیٰؓ، حسین ابن علیؓ پر موت چھا چکی ہے؟

کیا اب ہمیں جنید بغدادی، اویس قرنی، سری سقطی، ابن ادھم، محی الدین چشتی کہیں دکھائی نہیں دیتے؟

کیا یہ واقعہ ہے کہ خالد بن الولید، صلاح الدین ایوبی، طارق بن زیاد، اور خود ہمارے اپنے زمانے کے سید احمد شہید، محمد علی جوہر فنا ہو چکے ہیں؟

نہیں، ہرگز نہیں۔ نفوسِ زکیہ میں سے کسی نفس پر بھی موت کبھی طاری نہیں ہوئی۔ ہو بھی نہیں سکتی۔ موت کی مجال ہی نہیں کہ اپنا بے رحم

ہاتھ نفوسِ قدسیہ کی طرف بڑھا سکے!

بات یہ ہے کہ راہِ حق کے مسافر، انسانیت کے علم بردار، علم و فکر کے معلّم مرتے نہیں۔ مر جائیں، تو علم بھی مر جائے۔ فکر بھی ناپید ہو جائے۔ انسانیت ہی کا خاتمہ ہو جائے۔

طاغوت کی کوشش رہی ہے کہ امر انسانوں کو مار ڈالے۔ زمین کے نُور کو بُجھا ڈالے۔ سقراط کو زہر کا پیالہ پلایا گیا۔ افلاطون کو بے وطن ہونا پڑا۔ ابراہیم خلیل اللہ کو دہکتی آگ میں جھونک دیا گیا۔ حضرت مسیح کو سولی پر لٹکا دیا گیا مگر کیا یہ برگزیدہ ہستیاں مرکھپ چکی ہیں؟ مٹ گئی ہیں؟ فنا ہو چکی ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ ہزار بار ہرگز نہیں۔ انسانیت کے علم بردار، علم و معرفت کے پیام بر، بشری رفعتوں کے معمار آج بھی زندہ ہیں۔ اپنی جسمانی زندگی میں جیسے زندہ تھے، اُس سے کہیں زیادہ توانائی و شادابی کے ساتھ اِس وقت بھی زندہ ہیں۔ ہمارے آپ کے دلوں میں زندہ ہیں، اور ہماری آنے والی نسلوں کے دلوں میں قیامت تک زندہ رہیں گے۔ انسانی ہیروؤں پر موت طاری نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ تو خود خدا کے ساتھ زندہ رہیں گے، کیونکہ خدائی علوم کے وارث ہیں۔

× × ×

اور مولانا؟ اللہ اکبر! مولانا نے ہمیں کیا نہیں دیا؟ موت کی سی بے حسی ہم پر چھائی ہوئی تھی؟ اجنبی حکومت کی غلامی پر ہم فخر کرتے تھے۔ انگریز کی وفاداری ہی میں اپنی قومی زندگی یقین کرتے تھے۔ برطانیہ کو سب سے

بڑی "اسلامی سلطنت" کہا کرتے تھے۔ سیاسیات میں ہم صفر تھے اور ہندستان میں ہماری حیثیت، بے بس غلاموں بے شعور چوپایوں سے زیادہ نہ تھی۔

اور ہم مسلمان ہی کہاں تک تھے ؟ قرآن کو جزدانوں میں لپیٹ کر گھروں میں رکھنا ہی ہمارا اسلام تھا، یا پھر اندھی تقلید تھی۔ ٹونے ٹوٹکے تھے۔ قبریں تھیں۔ مزار تھے۔ پیرانِ ریاکار کے جال تھے، ڈھیلی دجالوں کے چنگل تھے۔

زمانے کی ضرورتوں سے ہم بے خبر تھے۔ باخبر ہونا بھی نہیں چاہتے تھے۔ حد یہ ہے کہ اسلامی دنیا سے بھی غافل تھے۔ بس "سلطان روم" کو جانتے تھے، اور چین میں "سلطان روم" کے ہاتھ کٹ جانے کے بعد پھر سے نکل آنے پر عش عش کیا کرتے تھے!

دفعتاً ایک صور کی زلزلہ انگیز آواز نے نیند کے ماتوں کو دہلا ڈالا اور ہم آنکھیں ملتا بھی بھول کر دفعتاً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اب ہم مسلمان تھے۔ انسان تھے!

اسلام کا درد پیدا ہو گیا۔ دین کی محبت جاگ اُٹھی۔ وطن کی عزت و عظمت کے جذبے سے ہم بھر پور ہو گئے۔ جہاد کے ولولوں نے ہمارا خواب خور حرام کر دیا۔ اسلامی دنیا سے رشتے جُڑ گئے، اور وہی برطانیہ عظمیٰ، جو ہمیں بھیڑوں کا گلہ، یا گاجر مولی سمجھنے کا عادی چلا آرہا تھا، ہمارے خوف سے کپکپانے، تھرانے لگا!

یہ صورِ قیامت کس نے پھونکا؟ ابوالکلام کے سوا کون ہو سکتا تھا؟ سنئے تو:

"میں وہ صور کہاں سے لاؤں، جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دے۔ میں اپنے ہاتھوں میں وہ قوت کیسے پیدا کروں کہ اُن کی سینہ کوبی کے شور سے سرگشتگانِ خوابِ موت، بیدار ہو جائیں؟ آہ کہاں ہیں وہ آنکھیں، جن کو دردِ ملّت میں خونباری کا دعویٰ ہے؟ کہاں ہیں وہ دل جن کو زوالِ اُمّت کے زخموں پر ناز ہے؟ کہاں ہیں وہ جگر جو آتشِ غیرت و حمیّت کی سوزش کے لذّت آشنا ہیں؟ اور پھر آہ، کہاں ہیں اِس برہم شدہ انجمن کے ماتم گُسار، اس برباد شدہ قافلے کے نالہ ساز؟ اِس صفِ ماتم کے فغاں سنج اور اِس کشتیٔ طوفانی کے مایوس مسافر، جن کی موت و حیات کے آخری لمحے جلد جلد گزر رہے ہیں اور وہ بے خبر ہیں یا خاموش! روتے ہیں یا مایوسی سے چپ و راست نگراں، مگر نہ اُن کے ہاتھوں میں اضطراب ہے۔ نہ پاؤں میں حرکت۔ نہ ہمتوں میں اقدام، نہ ارادوں میں عمل کا ولولہ۔ دشمن شہر کے دروازوں کو توڑ رہے ہیں اور اہلِ شہر رونے میں مصروف ہیں۔ ڈاکوؤں نے قفل توڑ دیے اور گھر والے سوتے ہیں" (الہلال)

اور سنیے:

"آہ! تمہاری غفلت سے بڑھ کر آج تک کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوئی اور تمہاری نیند کی سنگینی کے آگے پتھروں کے دل چھوٹ گیے۔ میں

کیا کروں اور کہاں جاؤں اور کس طرح تمہارے دلوں کے اندر اُتر جاؤں؛ اور یہ کس طرح ہو کہ تمہاری روحیں پلٹ جائیں اور تمہاری غفلت مر جائے؛ یہ کیا ہو گیا کہ پاگلوں سے بھی بدتر ہو گئے ہو؛ اور کیوں تمہاری عقلوں پر ایسا طاعون چھا گیا ہے کہ سب کچھ کہتے ہو اور سمجھتے ہو پر نہ تو راست بازی کی راہ تمہارے آگے کھلتی ہے اور نہ گمراہوں کے نقش قدم چھوڑتے ہو؛"

× × ×

ابراہیم علیہ السلام فرد واحد تھے۔ مگر پوری ایک اُمت بھی بہت بڑی اُمت۔ پوری انسانی اُمت! اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ کَانَ اُمَّةً وَّاحِدَةً" اور فرد واحد ابراہیمؑ سے نہ جانے کتنی اُمتیں پھوٹ نکلیں؛ اِسی شجرۂ طیبہ ابراہیمیہ کی ایک شاخ مولانا آزاد بھی تھے۔ فرد واحد تو تھے مگر اپنے وجود میں پوری ایک اُمت رکھتے تھے اور اُس اُمت کو پیدا بھی کر گیے۔

تو اب بتاؤ، ہم کیسے تصور کر سکتے ہیں مولانا ابوالکلام مر گیے ہیں، اور وہ آواز خاموش ہو چکی ہے، جو پورے پچاس برس ہندستان میں اور ساری اسلامی دنیا میں زلزلوں پر زلزلے ڈالے رہی ہے؛ وہ زبان ساکت ہو چکی ہے، جو علم و حکمت، شعر و ادب، معارف الٰہیہ کے موتی بکھیرتی رہی ہے؛

کیا یہ ممکن ہے؛ نہیں بالکل نہیں۔ قطعاً نہیں!

لیکن وائے افسوس، دل چاہے یا نہ چاہے، اِس واقعے سے تو انکار بھی ممکن نہیں کہ مولانا اپنے مادی جسم میں آج ہم میں موجود نہیں۔ یہ تو کیسے کہوں، ہم سے روٹھ گیے ہیں، روٹھ جاتے، تو ہم بدبخت واقعی اِس سزا

کے مستحق بھی تھے، مگر وہ کوہِ وقار، پیکرِ عفو و حلم، روٹھنا، بگڑنا، برہم ہونا، طیش میں آجانا جانتا ہی نہ تھا، وہ تو عفوِ مجسم تھا، حلم و کرم کا نمونہ تھا۔

سہل الخلیقۃ لا تخشی بوادرہ

تزینہ الاثنتان! الحلم والکرم!

مگر دیکھو تو! اِس بدنصیب شخص کو دیکھو تو! بیچ مچ سب سے بڑے بدنصیب شخص کو دیکھو تو! ——— آج یہی شخص مولانا پر نوحہ کرنے بیٹھا ہے! ہاں، ہاں ساتھ رہا ہے۔ بہت لمبا ساتھ رہا ہے، مگر اِس شرف و عزت کی کیا یہی سزا مقرر تھی کہ ماتم بھی کروں؟ خدارا اِس بدنصیب کو ذرا سا سہارا دیدو۔ مجھے کچھ کہنا ہے، مگر کہوں تو کیا کہوں؟ دم بخود ہوں۔ سرنگوں ہوں، نہ جانے کیا کیا کہنا ہے! لیکن اِس وقت کہنا چاہوں بھی تو کیا کہہ سکتا ہوں "ایاز! قدرِ خود بشناس!"

غافل! اِن مہ طلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہیے؟

ابوالکلام کی نسبت زبان کھولنے کا حق صرف ابوالکلام ہی کو ہے۔

کاش یہ زبان پہلے ہی گنگ ہو چکی ہوتی، اور قلم ٹوٹ پھوٹ چکا ہوتا، لیکن دِل میں جوش ہے۔ بے پناہ جوش۔ مولانا سے پہلے بھی گستاخ تھا، اب پھر گستاخانہ مگر درد بھرے دل سے کہے بغیر رہا نہیں جاتا:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور

تنہا گیے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اور!

مولانا! کیا عہد تھا؟ آپ تو قول کے دھنی، بات کے پکے، وعدے کے پورے تھے، پھر یہ ناگہانی فراق کیسا؟ میں بھی جانتا ہوں، آپ بھی جانتے ہیں، خدا بھی جانتا ہے کہ پچھلے اڑتیس سال کی رفاقت میں ایک لمحہ بھی بے وفائی میرے پاس نہیں پھٹکی، پھر مجھے اور اپنے سب چاہنے والوں کو چھوڑ کر آپ کیسے چلے گیے؟

اچھا! مولانا، آپ مسکرا رہے ہیں! ہمیشہ کی طرح کہئے نا، "مولوی صاحب آپ بڑے سادہ لوح ہیں!" جی ہاں بڑا سادہ لوح ہوں، بڑا نادان ہوں کہ ابھی تک سانس چل رہی ہے، مگر کیا آپ بھول گیے —— حالانکہ آپ کبھی بھی کچھ بھولتے نہ تھے، کہ محبت نادان ہوتی ہے۔ نادان ہی رہے گی۔ محبت کے ساتھ دانائی نہ جمع ہوئی ہے نہ جمع ہو گی۔

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا!

آہ! مولانا، آپ کے بعد جانتے ہیں کیا ہو گیا ہے؟

گویا نہ وہ زمین ہے نہ وہ آسماں ہے اب!

لیکن مولانا کی یہ محبت مجھے کہاں سے کہاں لیے چلی جا رہی ہے؟ اسی طرح لکھتا رہا تو دیباچہ خود کتاب بن جائے گا۔

یوہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

مولانا کے بارے میں لکھا جائے گا۔ بہت کچھ لکھا جائے گا۔ کتابیں تصنیف ہوں گی۔ میں بھی نہ جانے کیا کیا لکھوں گا۔ دوسرے اہلِ قلم بھی نہ جانے کیا کیا

لکھیں گے۔ مولانا کی تحریروں اور تصنیفوں کی ترتیب کے لیے ایک کمیٹی بھی بن چکی ہے۔ کمیٹی کے نتائجِ عمل کا انتظار کرنا چاہیے۔

لیکن دیباچہ تشنہ رہ جائے گا اگر مولانا سے اپنے تعلقات کا کچھ تذکرہ نہ کردں۔ ایک بڑی کتاب اپنے آپس کے تعلقات پر بہت پہلے لکھ رکھی تھی اور طے تھا کہ میری موت کے بعد چھپے گی۔ یقین کیا معنی، حق الیقین، عین الیقین تھا کہ مولانا سے بہت پہلے، برسوں نہیں، صدیوں پہلے کسی قبر میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا ہوں گا، لیکن ہوا کیا؟ وہی، جو ہم آپ جانتے ہیں!

اجازت دیجیے کہ اپنی قلمی کتاب کی ابتدائی سطریں یہاں نقل کردوں کہ نئے سرے سے کچھ لکھنے سے زیادہ روشنی باہمی تعلقات پر پڑے گی، لیکن یہ بھی کردں، تو کیوں کردں؟

تھی وہ اِک شخص کے تصور سے — اب وہ رعنائی خیال کہاں

شانِ نزول

"آزادی کی کہانی" کی شانِ نزول یہ ہے کہ ۱۹۲۱ء میں ہم سب جیل کے چرند پرند بن چکے تھے۔ جیل کی عجیب زندگی کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو جیل میں رہ چکے ہیں۔ اکتا ڈالنے والی زندگی۔ اور ہم سیاسی قیدی تھے اور "اے۔ کلاس" کے۔ کوئی کام کرنے کا نہ تھا۔

میں نے مولانا کو اکسانا شروع کیا کہ "تذکرہ" کی دوسری جلد لکھا دیں۔ "ہفتوں "میرے بھائی"، "میرے بھائی" کہہ کر ٹالتے رہے مگر میں بھلا

پیچھا چھوڑنے والا تھا۔ تقاضا جاری رکھا۔ آخر راضی ہو گیے اور یہ کتاب لکھانا شروع کردی۔
بولتے جاتے تھے اور میں پنسل سے گھسیٹتا جاتا تھا۔ رات کو مسودہ صاف
کرلیتا تھا۔ مولانا نے یہ کتاب اِس طرح لکھوادی کہ سامنے نہ کوئی نوٹ ہوتا تھا اور نہ کبھی
مجھ سے پوچھا "کل کیا لکھوایا تھا" دوسرے دن بیٹھے نہیں کہ بولنے کا رشتہ فوراً مل گیا۔
خیر مولانا کتاب لکھاتے رہے۔ لکھاتے رہے۔ پھر میرے دل میں گدگدی پیدا
ہوئی۔ مولانا نے "تذکرہ" میں اپنی "جوانی دیوانی" کا تذکرہ اِس طرح کیا ہے کہ اردو
ادب قیامت تک فخر کرے گا۔ میں یہاں اپنے مولانا کی "اُس" زندگی کی تصویر خود اُنھی
کے فتان قلم سے پیش کرتا ہوں:

"آنکھیں کھُلیں تو عہدِ شباب کی صبح ہو چکی تھی، اور خواہشوں اور دلوں
کی شبنم سے خارستانِ ہستی کا ایک ایک کانٹا پھولوں کی طرح شاداب تھا۔ اپنی
طرف دیکھا تو پہلو میں دِل کی جگہ سیماب کو پایا۔ دنیا پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اِس
صبحِ فریب کے لیے نہ تو سوز و تپش کی دوپہر ہے، نہ نا اُمیدی و ناکامی کی شام۔
یہ سارا شہرستانِ اُمید اور نگار خانۂ نظر فریب صرف ایک ہمارے ہی دیدہ و دل
کی کامجوئیوں کے لیے بنا ہے، اور گویا گوشہ گوشہ اور ذرہ ذرہ ہماری ہوسناکیوں
کے لیے چشم براہ ہے۔ جس طرف کان لگایا، یہی صدا سُنائی دی۔ معلوم نہیں اپنے
ہی گنبدِ غفلت اور ہنگامۂ ہوس کی گونج تھی، یا تو گرفتارِ طلسمِ شباب کی ہوشربائیاں
کے لیے خود سازِ ہستی کا نوائے فریب ہی یہی ہے:

غفلت و مدہوشی نے افسوں پھونکا، سرمستی و سرگرانی نے جام بھرے،
جنونِ شباب نے ہاتھ پکڑا، اور دلوں اور ہوسوں نے جو راہ دکھلائی، دِل

کی خود فروشیوں نے اُسی کو منزلِ مقصود سمجھا۔ ہوش و خرد کو گو پہلے حیرانی ہوئی لیکن پھر اُس نے بھی آگے بڑھ کر اشارہ کیا، راہ ہے تو یہی راہ ہے اور وقت ہے تو اسی کا!

ساقیا مرنج از من عالم جوانی ہاست!

جس طرف نظر اُٹھائی ایک صنم آبادِ الفت و پرستش نظر آیا، جس میں مندروں اور مورتیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہر مندر جبینِ نیاز کا طالب، ہر مورتی دل فروشی و جاں سپاری کے لیے وبالِ ہوش۔ ہر جلوہ برقِ تمکین و اختیار۔ ہر نگاہ بلائے صبر و قرار:

الفراق اے صبر و تمکیں! الوداع اے عقل و دیں!

جس راہ میں قدم اٹھایا، زنجیروں اور کمندوں نے استقبال کیا۔ جس گوشے میں پناہ لی، وہی زندانِ ہوش و آگہی نکلا۔ ایک قید ہو تو ذکر کیجیے۔ ایک زنجیر ہو تو اُس کی کڑیاں گنیے، دل ایک تھا مگر تیر ہزاروں ہاتھ میں تھے۔ نظر ایک تھی مگر جلوؤں سے تمام عالم معمور تھا۔ ہر کشش نے اپنا تیر چلایا۔ ہر رہزن نے اپنی کمند پھینکی، ہر فسوں ساز نے اپنا افسونِ محبت پھونکا۔ ہر جلوۂ ہوشربا نے صرف اپنے ہی دامِ اُلفت میں اسیر اور اپنی ہی فتراکِ اسیری کا نخچیر رکھنا چاہا“

تو میں نے مولانا کو ”پھسلانا“ شروع کیا ”پھسلانے“ کا لفظ جان بوجھ کر لکھا ہے۔ بھلا مولانا کو کون پھسلا سکتا تھا، مگر دل کی محبت کا عالم اور ہی ہوتا ہے۔ آخر راضی ہو گیے اور ”تذکرہ“ میں جن ”معاملات“ کا اجمال ہے، اُن کی شرح بھی آگئی!

مگر، ہوا کیا؟ دوسرے دن صبح ہی مسودہ لوٹا لیا۔ فرمایا ”نظرِ ثانی“ کروں!

عرض کیا، آپ کی "نظرِ ثانی" کا حال معلوم ہے۔ یعنی مسودہ غائب، اور ہوا بھی یہی!

× × ×

یہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مولانا نے اپنے والد مرحوم کے حالات بھی لکھوا دیے ہیں اور خود اپنے حالات بھی چار سال کی عمر سے۔ اِسی کتاب سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مولانا کس ماحول میں پیدا ہوئے۔ بڑھے پلے۔ پروان چڑھے اور بتدریج مگر حیرت انگیز تیز رفتاری سے، ہوتے، ہوتے "ابوالکلام" بن گئے۔ بڑے آدمیوں کی سوانح میں سب سے زیادہ کھوج اِسی بات کا مؤرخ لگاتا ہے کہ ماحول کیا تھا، اور ذہنی ترقی کے مدارج کی رفتار اور تاریخ کیا تھی۔ مولانا نے اپنے حالات لکھا کر مؤرخ کو اس جستجو سے اور جستجو کی دشواریوں سے نجات دے دی ہے۔

آپ کتاب نہیں پڑھ رہے ہیں۔ دیکھیے ایک ننھا سا بچہ ہے۔ دلفریب چہرے پر بوڑھوں کی سنجیدگی چھائی ہوئی ہے، "ابوالکلام" بنتا چلا جا رہا ہے۔ اور آپ ہیں کہ اِس خارق عادت ذہانت و فطانت پر حیرت میں ڈوبتے اور عش عش کرتے چلے جا رہے ہیں۔

اِس کتاب کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ مولانا کی روزمرہ کی بات چیت قلمبند ہو گئی ہے۔ مولانا کے قلم کی گل کاریاں تو بہت کچھ محفوظ ہو چکی ہیں۔ مولانا کی معجز بیانیاں بھی ہماری موجودہ نسل کے کانوں میں برابر گونجتی رہیں گی اور کوئی کوئی تقریر قلم بند بھی ہو چکی ہو گی، مگر مولانا، گھر میں، نجی میں بیٹھ کر کس طرح

گفتگو کرتے تھے، اُن کی یہ گفتگو ہو بہ ہو اِس کتاب میں محفوظ ہو چکی ہے، اور یہ ایک بڑی بات ہے۔ پبلک تقریروں کی زبان الگ ہو جاتی ہے اور تحریر بھی روزمرہ گفتگو کا ساتھ نہیں دیتی، لیکن گھریلو بول چال اگر کسی بڑے آدمی کی مل جائے تو ہم اُس سے بڑے آدمی کی نفسیات کی اسٹیڈی میں بڑی مدد حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کتاب میں بعینہٖ وہی کچھ ہے جو مولانا کی زبان سے نکلا تھا۔ میں نے اِس میں کسی قسم کا بھی تصرف یا تغیر و تبدل کرنا خلافِ دیانت سمجھا ہے۔

عجائباتِ روزگار میں سے یہ کتاب بھی اس لحاظ سے ایک عجوبہ ہے کہ مولانا اپنی پوری زندگی میں شاید کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بھولے نہیں ———، مگر لکھا دینے کے بعد اِس کتاب کو بالکل ہی بھول گئے۔ مجھے حق الیقین ہے، کتاب یاد آجاتی، تو "نظرِ ثانی" کے بہانے ضرور چھین لیتے، اور کتاب اُن کے بے شمار مسودوں کی طرح ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتی۔ قوتِ حافظہ کا عجب عجب سے بڑھ کر کس پر ہو سکتا تھا۔ ہر ملاقات پر دل دھڑکتا، کہیں کتاب مانگ نہ بیٹھیں۔ خود میں بھی اپنی جگہ "بڑا" کائیاں" تھا۔ کتاب کا معاملہ اِس طرح غائب رکھا، جیسے موجود ہی نہیں۔ آپ کو کئی جگہ حاشیے میں نظر آئے گا "مسودے میں جگہ خالی ہے" اِسی لیے کہ مولانا کو یاد ہوا نہیں، اور کتاب سے دنیا محروم ہو گئی۔

یہاں اِس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ موجودہ زمانے میں مولانا اگر یہی کتاب اپنے قلم سے لکھتے یا اس پر نظرِ ثانی کر لیتے تو اس کی شکل ضرور مختلف ہوتی۔ یہ کتاب ۱۹۲۱ء میں لکھائی گئی تھی یعنی

۳۰ سال پہلے کی یادگار ہے۔ زمانہ بدل چکا ہے۔ زمانے کے حالات بھی بدل چکے ہیں۔ مولانا کے، مولانا کے والد کے، مولانا کے خاندان کے حالات تو لازمی طور پر وہی ہیں، وہی رہیں گے بھی، جو کتاب میں درج ہیں، لیکن ممکن ہے اس زمانے میں مولانا، بعض وہ خیالات پبلک میں لانا پسند نہ کرتے — ، جو آپ کو کتاب میں ملیں گے۔

میں اپنے مولانا سے انتہائی ادب، انتہائی عجز، بلکہ شاید انتہائی معذرت کے ساتھ یہ ورق شایع کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ دل ڈوبا جارہا ہے۔ آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہیں۔ پورا وجود متزلزل ہے!

وما کان قیس ھلکہ ھلک ولکنہ بنیان قوم تہدما

مگر اس مصیبت عظمیٰ میں بھی ہم یہی کہیں گے اور میرے مولانا بھی ایسے موقع پر یہی کہتے "القلب یحزن والعین تدمع ولا نقول الا ما یرضی ربنا" لیکن مجبور ہوں، دوستو، بخدا بالکل مجبور ہوں، مگر اس المیہ کو ختم ہی کردینا ہے۔ کیوں نہ مولانا ہی کی ایک رباعی پر ختم کروں؟

تھا جوش وخروش اتفاقی ساقی ... اب زندہ دلی کہاں ہے باقی ساقی
میخانے نے رنگ وروپ بدلا ایسا ... میکش میکش رہا نہ ساقی ساقی

ملیح آبادی

نوٹ:۔ مولانا کے سن شباب کی تصویر، نادر تصویر ہے اور مولانا مہر محمد خان صاحب — شہاب مالیر کوٹلوی کی عنایت سے حاصل ہوئی ہے۔ مولانا شہاب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں

مولانا آزاد کا خاندانی سلسلہ

شیخ جمال الدین دہلوی

میرے خاندانی سلسلے میں سب سے پہلے شیخ جمال الدین معروف بہ "بہلول دہلوی" کا نام بہت ممتاز نظر آتا ہے۔ ان کا وطن، دہلی مرحوم تھا، اور عہدِ اکبری کے مشاہیر علما اور اصحابِ سلوک و طریقت میں سے تھے۔ سلوک و طریقت کی تکمیل، شیخ محمد داؤد جہنی وال(۱) رح کی خدمت میں کی تھی، اور علوم معقول و منقول میں سید رفیع الدین سلامی شیرازی کے شاگرد تھے، جو بیک واسطہ حافظ

---

(۱) شیر شاہی و سلیم شاہی عہد کے اکابر اولیاء اللہ میں تھے۔ آبائی وطن، عرب تھا۔ خود ملتان میں پیدا ہوئے۔ جب خلق اللہ کے ارشاد و ہدایت کی طرف توجہ ہوئی، تو موضع جہنی علاقہ لاہور میں گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ یہ اُس عہدِ پُرفتن و فساد کے اُن مخصوص بزرگانِ حق میں

ابنِ حجر عسقلانی، صاحب فتح الباری کے شاگرد حدیث تھے۔ اس طرح شیخ جمال الدین حافظ عسقلانی کے بہ دو واسطہ شاگرد تھے۔ یہ ایک ایسی فضیلت و مزیت ہے، جس کی قدر اہل علم جانتے ہیں۔

بقیہ صفحہ ہیں، جو مدت العمر اپنی بوریائے فقر پر قانع رہے اور دنیائے فانی کی دل فریبیاں اُن کی جمعیت خاطر کو پراگندہ نہ کر سکیں۔ منتخب التواریخ، اخبار الاخیار، تذکرۃ الواصلین، طبقات اکبری، روضۃ العلما وغیرہ میں اِن کے مفصل حالات درج ہیں، اور سب کے سب یک زبان ہو کر لکھتے ہیں کہ اعلانِ حق اور امر بالمعروف میں تیغ بے نیام تھے، علی الخصوص ان عالمانِ بے عمل اور صوفیانِ ریاکار سے سخت بے زار تھے، جو حبِ جاہ اور عشقِ مال و متاعِ دنیوی میں برگشتہ و ہلاک ہو گئے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ جن علمار نے پادشاہوں اور امیروں کو اپنا قبلہ و کعبہ بنا لیا ہے، اُن سے وہ مکھی ہزار درجہ افضل ہے، جو نجاست پر بیٹھتی ہے۔ پھر یہ رُباعی پڑھتے:

آن کس کہ ز غو غانہ رہد، وائے برد   بر خلق جہاں بدہد، وائے برد
در دست فقیر نیست نقلے جز دقت   آن نیز گر از دست دہد، وائے برد

اسی حق گوئی کی وجہ سے مخدوم الملک وغیرہ علمارِ دربار کو ان سے سخت عداوت تھی، چنانچہ یہ الزام لگایا کہ اُن کے مرید "یاداؤد" کہتے ہیں۔ سلیم شاہ بادشاہ نے طلب کیا، مگر مل کر بہت متاثر ہوا اور کہا "ازیں روئے دروغ نیاید"۔ بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ اُن پر مہدوی ہونے کی تہمت لگائی گئی تھی (ماخوذ از تذکرہ)

شیخ جمال الدین، دہلی میں رہتے تھے، اور درسِ علوم نقلیہ و عقلیہ میں اُستاذ وقت تسلیم کیے جاتے تھے، علی الخصوص علوم دینیہ کی تدریس میں اپنا عدیل نہیں رکھتے تھے۔ درس و تدریس کے ساتھ ارشاد و طریقت کا سلسلہ بھی اُن سے قائم و جاری تھا، اور دُور دُور سے لوگ آکر فیض یابِ صحبت ہوتے تھے۔ اُس زمانے میں دار الحکومت، آگرہ تھا، لیکن علم و اصحابِ علم کا مرکز ہمیشہ دہلی مرحوم ہی رہی۔ علی الخصوص وہ علمائے حق، جو دربارِ شاہی کے تعلقات کی ابتلاؤں سے بچنا چاہتے تھے، اور حرص و طمع دنیا کی آلودگی سے پاک دامن تھے، اس گوشۂ علم کے سکون کو دار الحکومت کے شور و غوغا پر ترجیح دیتے تھے۔

دربارِ شاہی سے تصادم

لیکن جب خاندانِ مُبارک[1] کو دربارِ حکومت میں عروج ہوا، اور دربارِ شاہی کی مذہبی حالت دگرگوں نظر آئی، تو ہندستان سے قطع تعلق کر کے مکّہ معظمہ چلے گیے۔ اس سفر کا سبب، تذکرۃ الواصلین میں یہ لکھا ہے کہ "جب بعض علمائے عصر نے اکبر کے امام وقت ہونے کا محضر تیار کیا، اور تمام علمائے دار الحکومت نے اُس پر مہریں کیں، تو وہ محضر دہلی میں بھی آیا، اور ان سے تصدیق و امضا کے لیے کہا گیا، لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جس قدر ہو چکا ہے، کافی ہے۔ ہم فقیروں اور گوشہ نشینوں کو کیوں تکلیف دی جاتی ہے؟ اگر ایسا

---

[1] فیضی و ابو الفضل کے والد۔

ہی ہے تو تمام علمائے ہند سے استصواب کر لیا جائے۔ اس کے بعد جب علمائے مشرق نے بادشاہ کے برخلاف فتویٰ دیا اور لکھا کہ اکبر، شریعت سے منحرف ہو گیا ہے، تو بعض علمائے دہلی کی نسبت دربار حکومت کو شبہ ہوا کہ علمائے مشرق سے نامہ و پیام رکھتے ہیں۔ انھی میں شیخ موصوف بھی تھے۔ جب حالات روز بروز مخدوش ہونے لگے، تو انھوں نے حج کا ارادہ کیا، اور اپنے تلامذہ و مریدین کی ایک جماعت ساتھ لے کر مکہ معظمہ چلے گیے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعض علمائے وقت، خصوصاً شیخ الاسلام مولانا عبد اللہ سلطان پوری کو شیخ سے سخت حسد و عناد تھا۔ سبب اِس کا یہ تھا کہ شیخ موصوف پر میر سید محمد جونپوری رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت منکشف ہوا تھا کہ وہ کبار اولیاء اللہ اور صاحبان مدارج و مقامات عالیہ میں سے ہیں، اور اُن کے احوال و مقامات کی نسبت لوگوں کو بوجہ قصورِ فہم دھوکا ہوا ہے۔ جو علمائے وقت ان کی تکفیر و تذلیل کے درپے ہیں، سخت غلطی کر رہے ہیں۔

یہ بات علمائے دربار پر سخت گراں گزری، کیونکہ وہ برابر طائفۂ مہدویہ کے قتل و تعزیر میں کوشاں رہتے تھے اور اس دار و گیر میں بڑے بڑے فقرا و اہل اللہ کی اذیت و مصیبت کا باعث ہوئے تھے۔ جب بعہد سلیم شاہ، مولانا عبد اللہ کے ایما و سعی سے شیخ عبد اللہ نیازی اور ان کی جماعت کے فقرا، مبتلائے محن ہوئے، تو شیخ جمال الدین نے فرمایا کہ اِن مظلموں کا خون عنقریب رنگ لائے گا، اور افغانیوں کی حکومت زیادہ عرصے باقی نہیں رہے گی۔

یہ بات مشہور ہوئی، تو معاندین نے شیخ کو بھی مہدویت سے متّہم کیا اور

بہت کلفت و تعب کا باعث ہوئے۔ یہ حال دیکھ کر شیخ نے ایک کتاب تحریر کی اور اُس میں دلائل و شواہد قاطعہ سے ثابت کیا کہ حضرت سید محمد جونپوری کی ولایت، حق ہے، لیکن ان کے مہدی موعود ہونے کا اعتقاد باطل ہے، اور ہماری جماعت کو اِس اعتقادِ باطل سے متہم کرنا، مخالفین کا عناد اور منکرین کی شقاوت ہے

اِس کتاب کے مطالعے سے اگرچہ اربابِ حق و صلاح کو اطمینان خاطر بہم پہنچا، لیکن معاندین کا خلاف و عناد اور بڑھ گیا۔ بایں ہمہ حق تعالیٰ ناصر و یاور تھا، اس لیے کوئی گزند نہ پہنچا سکے، اور بالآخر مخالفین کو شرم ساری و خواری نصیب ہوئی۔

بہرحال خواہ اکبر کے محضرِ امامت کا معاملہ ہو، خواہ اتہامِ مہدویت کا، یہ دونوں معاملے ایسے تھے، جن کی وجہ سے بلاشبہ شیخ موصوف پر ہندستان میں رہنا دشوار ہو گیا، چنانچہ انھی اسباب سے ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور مکہ معظمہ چلے گیے۔ صاحبِ تذکرہ لکھتے ہیں کہ چند سالوں کے بعد خانِ اعظم مرزا کوکلتاش حج کے لیے گیے۔ اِن کو شیخ موصوف سے نہایت درجہ حُسنِ اعتقاد تھا۔ سخت اصرار و التجا کر کے اپنے ہمراہ ہندستان واپس لائے، لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ دہلی پہنچنے کے چند ماہ بعد انتقال کر گیے، گویا قضا کو اسی کا انتظار تھا!

اگر شیخ موصوف، محضرِ امامت کے واقعے کے بعد مکہ معظمہ تشریف لے گیے ہیں تو یہ واقعہ ۹۸۶ھ میں ہوا تھا۔ خانِ اعظم، دربارِ اکبری کی مذہبی بے قیدیوں اور بدعتوں سے بگڑ کر ۱۰۰۱ھ میں مکہ معظمہ گیے اور ۱۰۰۲ھ میں واپس آئے۔

اور شیخ کی واپسی انہی کی معیت میں ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم و بیش بارہ تیرہ برس تک وہاں قیام رہا۔ اتنے عرصے تک وہاں بے نیازانہ مقیم رہ جانے سے ثابت ہوتا ہے کہ شیخ موصوف کا حال، عہد اکبری کے اُن دنیا پرست عالموں سے کس درجہ مختلف تھا، جو پہلے دربار شاہی سے روٹھ کر خانۂ خدا کا رستہ لیتے، لیکن جب حرصِ دنیا، چین سے بیٹھنے نہ دیتی، تو تھوڑے ہی دنوں کے بعد ہندستان کی طرف دیوانہ وار دوڑتے، اور اُس گھر کو پیٹھ دکھاتے، جس کے لیے دنیا کو پیٹھ دکھائی تھی۔ مولانا عبد اللہ سلطان پوری، مخدوم الملک، اور شیخ عبد النبی صدر کو خود اکبر نے مکہ معظمہ بھجوایا، لیکن پورے تین سال بھی وہاں ٹک نہ سکے۔ پھر اس کا جو نتیجہ نکلا معلوم ہے۔

مولانا جمال الدین کا اکبر کی امامت کے محضر پر دستخط نہ کرنا، اُن کی قوتِ ایمانی اور استقلال و استقامت کا ایک بیّن ثبوت ہے، ورنہ اُس زمانے میں کس کی مجال تھی کہ دہلی میں بیٹھ کر اِس محضر پر دستخط کرنے سے انکار کر دے، چنانچہ تمام علما نے طوعاً و کرہاً مہریں ثبت کر دیں۔ مُلا عبد النبی صدر، مخدوم الملک، قاضی القضاۃ جلال الدین ملتانی، اور شیخ عبد الحی مفتی وغیرہ، کسی کو بھی انکار کی ہمت نہ ہو سکی، حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جو نہایت مُتقشف، متشدد، اور اپنے تئیں حامیانِ دینِ متین کہتے تھے!

معاصر علما کی شہادت

تمام تاریخیں متفق ہیں کہ شیخ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں تیغ

بے نیام تھے۔ ان کی زندگی، لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَائِمٍ کی کامل تصویر تھی۔
ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں کسی عالم حق کے مہدوی ہونے کے لیے اس سے
بڑھ کر اور کون سی دلیل تھی؛ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے ایک اشارے سے بھی
اس کی تصدیق ہوتی ہے " شیخ قطب عالم می گفت کہ چوں بملازمت او رسیدم،
بجہت غلبۂ وعظ ونصیحت بخاطر خطور کرد کہ مگر شیخ، طریقۂ مہدویہ دارد۔ بمجرد ایں
خطور، بے سابقۂ تقریبی سر برآوردہ وفرمود۔ مہدویہ فرقۂ ضالہ اند"

تذکرۃ الواصلین میں لکھا ہے کہ مولانا جمال الدین، علم وطریقت اور ظاہر و
باطن کے جامع تھے۔ تمام علوم وفنون کے درس وتدریس میں استادِ وقت تسلیم
کیے گیے، علی الخصوص علم حدیث کے درس واشاعت میں اپنا جواب نہیں رکھتے
تھے۔ دہلی میں اُس وقت صرف وہی ایک بزرگ تھے، جن کے یہاں بطریقِ
محدثین، کتبِ صحاح کی تعلیم ہوتی تھی۔ طلبہ دوسری جگہوں سے فراغت حاصل
کرکے اُن کی خدمت میں پہنچتے اور علم حدیث میں استفادہ کرتے۔ اس امر کی اِس
سے بھی تائید ہوتی ہے کہ مولانا ممدوح، شیخ رفیع الدین سلامی شاگرد حافظ سخاوی کے
شاگرد تھے؛ اور شیخ موصوف پہلے شخص ہیں، جن کی وجہ سے ہندستان میں
علم حدیث کے درس ونظر کا چرچا ہوا۔

ملا بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے " علم حدیث را خوب ورزیدہ
در صحبتِ اہلِ فقر وفنا رسیدہ، مدتِ مدید لیست کہ لذت آں وادی دریافتہ،
دتوفیق استقامت واستدامت بران رفیق اوگشتہ، باہلِ دنیا کارے ندارد،
دبافادہ وافاضۂ طلاب علم مشغول است،" (ج ۳ ص ۱۱۳)

دوسری شہادت، شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی ہے کہ اُن کے معاصر ہیں، اور اُن کی زندگی ہی میں لکھ رہے ہیں " جامع میان علم شریعت وطریقت، از اول فطرت بر نشأۂ عبادت وتقویٰ وصلاح برآمدہ، و برعصمت ذاتی نشوونما یافتہ، بعد تحصیل علم دینی بہ تہذیب اخلاق وتبدیل صفات موافق شد۔ الحق دریں زمان در زمرۂ علماء وفضلاء این چنین مردم در سلوک این طریق و رسوخِ قدم واتباعِ سنّتِ حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نادر و عزیز الوجود اند "

شاہ عبدالحق محدث، جس دور علم وتعلّم کے بانی ہوئے، اُس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ علم حدیث کے متعلق فارسی زبان میں کہ ملک کی عام زبان تھی، تصنیف و تراجم کی بنیاد ڈالی۔ خود شاہ صاحب نے مشکوٰۃ وغیرہ کا ترجمہ کیا۔ پھر اُن کے صاحبزادے شیخ الاسلام نور الحق نے صحیح بخاری کا، لیکن تذکرۃ الواصلین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ بھی مولوی جمال الدین ہی کا شروع کردہ ہے۔ اُنھوں نے صحیح بخاری کی فارسی میں ایک شرح لکھی تھی، جو کتاب النکاح تک مکمّل ہوئی تھی، اور اُس زمانے میں نہایت مشہور و متداول تھی۔ اُن کی دوسری تصنیف، اصول بزدوی کی شرح ہے۔ صاحب تذکرہ نے شاہ عبدالحق کا قول نقل کیا ہے " واز تصنیفات اوست شرح اصولِ بزدوی کہ امروز در تمام دیار ہند مشہور ست و در طلبہ من مقبول "

زہد و قناعت میں مشہور تھے۔ صاحب تذکرہ لکھتے ہیں کہ ناصر الملک پیر محمد خاں خانخاناں اور خان اعظم کوکلتاش کو شیخ جمال الدین سے بہت عقیدت تھی۔ بارہا اُنھوں نے چاہا کہ مال وجاہِ دنیوی میں سے کچھ قبول کریں، لیکن ہمیشہ انکار کیا، اور فرمایا کہ گھر بناتے ہوئے ڈرتا ہوں، کہیں دِل نہ ویران ہو جائے!

شیخ محمد

شیخ جمال الدین کے لڑکے شیخ محمد تھے، جن کا تذکرہ، جہانگیر نے تزک جہانگیری میں دو جگہ نہایت تعظیم و تکریم سے کیا ہے۔ ان پر تصوف و سلوک کا غلبہ تھا، اور دِلّی میں حضرت سید احمد سرہندی مجدّد کے خلیفہ تھے۔ اِس سے اُن کے فضل و مرتبے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ شاہزادہ خُرّم کو، جو بعد میں "شاہ جہاں" کے لقب سے بادشاہ ہوا، اِن سے از حد عقیدت تھی، اور اِنھوں نے اُسے اُس وقت تخت و تاج کی بشارت دی تھی، جب وہ اپنے باپ، جہانگیر سے بگڑ کر الہ آباد چلا گیا تھا، اور حالات ایسے خراب ہو گیے تھے کہ بظاہر اس کے بادشاہ بننے کی امید نہ تھی۔ مجدّد صاحب کے مکتوبات کے تیسرے حصّے میں ان کے نام، دو خط ہیں: ایک فارسی میں اور دوسرا عربی میں۔ پہلا خط اِن کے ایک مراسلے کے جواب میں ہے، جس میں اِنھوں نے شیخ الاسلام نورالحق

بن شاہ عبدالحق محدث کے اُن دس اعتراضوں کو لکھ کر بھیجا تھا، جو اُنھوں نے مجدد صاحب پر کیے تھے۔ مجدد صاحب کا جوابی مکتوب نہایت طویل ہے اور اس میں اُن اعتراضات کے جوابات دیے ہیں۔

شیخ محمد کو بھی اپنے والد سے، علاوہ زہد و تقویٰ اور قناعت و صبر و شکر کے، حمایتِ حق کا وصف، وراثت میں پہنچا تھا۔ مجدد صاحب کا خلیفہ ہونا اِس کا سب سے بڑا ثبوت ہے، کیونکہ اُس زمانے میں دربار حکومت، مجدد صاحب کو بُری نظر سے دیکھتا تھا، اور اُن کے وجود کو سلطنت کے لیے سخت خطرناک خیال کرتا تھا، جیساکہ تزکی اور دوسری کتابوں سے بخوبی معلوم ہوتا ہے، اِسی لئے اُن کے تمام رفقار، مریدین اور وابستوں کو ناپسند کرتا تھا، اور اُن پر شبہہ کی نظریں رکھتا تھا، خصوصاً مجدد صاحب اور جہانگیر کی تاریخی ملاقات کے بعد تو حالات اور بھی نازک ہو گیے تھے، اور اس سے بھی زیادہ اُس وقت جب مجدد صاحب دوسری مرتبہ دلی بُلائے گیے، اور کورنش کے مسئلے نے بہت طول پکڑا۔ اس وقت دلی کے اندر کسی کا مجدد صاحب کی حمایت میں زبان ہلانا بھی بغاوت کے مترادف تھا، مگر شیخ صاحب موصوف نے اس کی کچھ پروانہ کی۔ علانیہ اُن کی حمایت کرتے اور اُن کے ساتھ وابستگی کا اعلان کرتے رہے۔ اسی قدر نہیں، بلکہ اُن کے حریف، شیخ الاسلام نورالحق سے اُن کے معاملے میں بہت کچھ مراسلت کی، اور صاف صاف لکھ دیا کہ بادشاہ کو سجدۂ تعظیمی کرنا درحقیقت ناجائز اور حرام ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمائے دربار، حکام، اور خود بادشاہ اُن سے

ناراض ہو گیا ، مگر شاہزادہ خرم چونکہ غایت درجہ حسن عقیدت رکھتا تھا، اِس لیے اُنھیں کوئی خاص نقصان نہ پہنچ سکا۔

اِس کے بعد یہ خاندان برابر دِلّی میں قائم اور عزت واحترام سے رہتا رہا۔

قاضی سراج الدین

والدِ مرحوم کے نانا، مولانا منور الدین کے والد، قاضی سراج الدین، ہرات کے مشہور خاندان قضاۃ سے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ ہندستان آئے۔ احمد شاہ نے جب صوبہ پنجاب کا الحاق، کابل کے ساتھ کرلیا اور واپس ہونے لگا، تو قاضی صاحب کو پنجاب کا قاضی القضاۃ، اور نائب السلطنت نور الدین کا مشیر مقرر کیا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نور الدین گورنر پنجاب و کشمیر کو، جو عہدِ مغلیہ سے چلا آتا تھا، ملکی مصالح کی بنا پر بدستور باقی رکھا، مگر اس پر کامل بھروسہ نہ تھا۔ اس لیے انھیں اُس کا نگراں بنایا۔ چنانچہ وہ برابر اس ذمہ دارانہ عہدے کے فرائض، لاہور میں ادا کرتے رہے، مگر مستقل سکونت، قصور میں اختیار کی جہاں کا نواب ان کا نہایت معتقد تھا، اور اُسی نے اُن کے قیام و رہائش کا نہایت عمدہ طور پر انتظام کیا تھا۔

اسی اثنا میں سکھوں نے پھر زور پکڑا اور صوبہ لاہور و پنجاب کے اکثر حصے پر قبضہ کرلیا۔ پنجاب کے مسلمان چاہتے تھے کہ پھر اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ چنانچہ اُنھوں نے بارہا کوششیں کیں کہ زمان شاہ بن احمد شاہ دوبارہ پنجاب پر قبضہ کرے، مگر وہ سخت ناکارہ اور بے حمیت تھا۔ اُن کے سخت اصرار سے دو مرتبہ پشاور تک آیا اور واپس چلا گیا، لیکن جب سکھوں کا ظلم و جور، حد سے زیادہ بڑھ گیا اور مسلمانوں کے لیے پنجاب کی سرزمین میں رہنا دشوار ہو گیا، تو قاضی صاحب خود کابل تشریف لے گئے، اور شاہ زمان کو بہت غیرت دلائی کہ یہ کیا ہے کہ مسلمان، واغوثاہ! واغوثاہ! پکارتے ہیں اور تم ان کی فریاد نہیں سنتے۔

شاہ زمان اِن کی سفارش سے بہت متاثر ہوا اور اِن کی دعوت کے بموجب عمل کا وعدہ کیا۔ چنانچہ ایک سال کی تیاری کے بعد اُس نے یورش کی، جب پشاور پہنچا تو، قاضی صاحب، علمائے پنجاب کی ایک بہت بڑی جماعت لے کر اُس کے استقبال کو پشاور پہنچے، مگر وہاں دیکھا کہ وہ سکھوں کے ایجنٹوں سے بات چیت کر رہا ہے، تاکہ ایک معقول رقم لے کر کابل واپس جائے[۱]

قاضی صاحب نے اس پر بہت لعنت و ملامت کی اور بڑی سختی سے غیرت دلائی۔ آخر وہ پھر آمادۂ کار ہو گیا۔ پٹھانوں اور سکھوں میں زبردست جنگ ہوئی۔ قاضی صاحب نے بھی جنگ میں حصہ لیا اور فتح مسلمانوں کی ہوئی۔

مگر جوں ہی زماں شاہ واپس گیا، سکھوں کا پھر عروج ہو گیا۔ یہاں تک کہ

---

(۱) یہ حالات سرلیپل گریفن نے تاریخ پنجاب میں اور منشی عبدالکریم نے بھی اپنی تاریخ پنجاب میں لکھے ہیں
(نوٹ از مولانا رحم)

رنجیت سنگھ نے ایک سازش کے ذریعہ راتوں رات قلعۂ لاہور پر قبضہ کر لیا، مگر وہ ہوشیار اور زمانہ شناس آدمی تھا اور خوب جانتا تھا کہ سکھوں میں انتظامی قابلیت نہیں ہے۔ انتظامی مدد صرف مسلمانوں سے مل سکتی ہے۔ ساتھ ہی قاضی صاحب کے مسلمانانِ پنجاب پر عالمگیر اثر، نیز شاہ زماں کے تعلقات سے باخبر تھا، اِس لئے اِس قبضے کی رات کی صبح ہی کو انہیں بلایا اور زمانہ سازی کی راہ سے کہا کہ اگرچہ میں نے قلعۂ لاہور پر قبضہ کر لیا ہے، مگر اصلی مالک آپ ہیں۔ جس طرح چاہیں، انتظام کریں۔

انہوں نے دیکھا کہ تمام مسلمانانِ پنجاب کی زندگی، ناموس، اسلامی مساجد و مدارس کی حفاظت اور آئندہ مواقع کی امید اِسی پر موقوف ہے کہ اُس کی خواہش منظور کر لیں، چنانچہ اس وقت رضامند ہو گیے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاہور اُن بربادیوں سے بچ گیا، جو بٹالہ اور فیروزپور وغیرہ پر سکھوں کے ہاتھوں سے نازل ہوئی تھیں، لیکن رنجیت سنگھ آخر تک اُن سے کھٹکتا ہی رہا اور یقین کرتا رہا کہ وہ اِسلامی حکومت کے اعادے کے کسی موقعے کو ہاتھ سے جانے نہ دینگے، مگر باوجود اِس علم کے اُن سے بگاڑنا نہ چاہتا تھا، کیونکہ اُن کا اثر پنجاب سے کابل تک پھیلا ہوا تھا، بلکہ اُس نے اُن کی تالیفِ قلب کے لیے اجازت دے دی تھی کہ عین اس کی نشست گاہ کے دروازے کے سامنے اپنی پالکی سے اترا کریں۔

جہاد بالسّیف

اُسی زمانے میں مظفر خاں نے، جو کابل کی طرف سے ملتان کا گورنر تھا،

اور بارہ سال سے برابر سکھوں کا مقابلہ کر رہا تھا، زیادہ پائداری حاصل کی اور سکھوں کی مقاومت میں از سرِ نو سرگرم ہوا۔ قاضی صاحب نے جب یہ صورتِ حال دیکھی اور پنجاب میں اسلامی حکومت کے اعادے کی امید نظر آئی، تو اُن کی پرجوش طبیعت بے چین ہو گئی اور وہ اپنے تمام اعزاز و اکرام اور گھر بار چھوڑ کر فوراً ملتان چلے گئے۔ مظفر خاں کی تشجیع کی اور مسلمانانِ پنجاب کو اس کی حمایت و اعانت پر اکسایا۔ چنانچہ جوق در جوق مسلمان اُس کی مدد کو آنے لگے۔ ساتھ ہی اُن کے اثر و سعی سے کابل میں بھی حرکت ہوئی اور زماں شاہ مدد پر آمادہ ہوا، مگر چونکہ اِدھر اُس نے ایران سے لڑائی کر رکھی تھی، اور اپنے بھائیوں سے خانہ جنگی میں مصروف تھا، اس لیے دیر ہوئی۔ اُدھر رنجیت سنگھ اپنی تمام سکھ راجوں اور قوموں کی متفقہ قوت سے میدان میں اچانک آ گیا، اور ملتان کا نہایت سختی سے محاصرہ کر لیا۔ مظفر خاں بڑی پامردی سے مقابلہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ جب محاصرے کو کئی ماہ گزر گیے اور اندر کی تمام رسد ختم ہو گئی، تو بہت سے لوگوں نے اطاعت قبول کر لینے کا ارادہ کیا، مگر قاضی صاحب کی غیور طبیعت اور اسلامی حمیت نے اس ذلت کو گوارا نہ کیا، اور اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ شہر کے دروازے کھول دیے جائیں اور سب لوگ میدان میں نکل کر آخری اور فیصلہ کن جنگ کریں، چنانچہ بالآخر یہی ہوا، اور پنجاب میں سکھوں اور مسلمانوں کا وہ آخری معرکہ واقع ہوا، جس میں مظفر خاں اور قاضی سراج الدین دونوں شہید ہو گیے۔ قاضی صاحب کی قبر ملتان میں لاہوری دروازے کے باہر اب تک موجود ہے۔

پیش کردہ

مولانا منوّر الدین خلیق انجم

اِنھوں نے ابتدائی تعلیم، علمائے لاہور سے حاصل کی۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ دِلّی میں شاہ عبدالعزیز صاحب کا حلقۂ درس نہ صرف ہندستان بلکہ تمام عالمِ اسلامی کے لیے ایک تعلیمی مرکز کا حکم رکھتا تھا، اور دُور دُور سے تشنگانِ علم آتے اور اس سرچشمے سے سیراب ہوتے تھے۔ مولانا منورالدین کے لیے اگرچہ لاہور میں پورا سامانِ تعلیم کا موجود تھا، لیکن اُن کا شوقِ علم اِس پر قانع نہ تھا۔ شاہ صاحب کے فضل و کمال کی خبریں تمام پنجاب میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اِن کو بھی شوق ہوا کہ وہیں جاکر علوم کی تکمیل کریں، لیکن اِن کے والد نے سخت مخالفت کی کیونکہ اُنھیں اپنے سے جدا نہ کرنا چاہتے تھے، اور چونکہ اُن کی حیثیت ایک رئیس کی تھی، اُنھوں نے کہا، ہم گھر بیٹھے اچھے اچھے مولویوں کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ تم باہر نہ جاؤ۔ جب اِنہیں اِس طرف سے مایوسی ہوئی، تو فیصلہ کیا کہ مخفی گھر سے نکل جائیں۔ اُس

وقت اِن کی عمر صرف سولہ سترہ برس کی تھی، چنانچہ ایک دن تنہا گھر سے نکل گیے اور روانگی کے وقت جو کچھ پاس تھا، وہی ساتھ لے لیا۔

یہ زمانہ شمالی ہندستان کی تاریخ کا سب سے زیادہ خونریز زمانہ ہے۔ پنجاب کی آخری سرحد تک سکھوں کی لوٹ مار جاری تھی، اور جمنا سے اِدھر انگریزوں اور مرہٹوں میں لڑائی جاری تھی۔ پنجاب سے نکلتے ہی مرہٹی فوجوں سے مڈبھیڑ ہوتی تھی۔ جن کا دستور تھا کہ خود بار بردار اور مزدور اپنے ساتھ نہ رکھتے تھے، بلکہ جو راہ گیر مل جاتا، پہلے اُسے لوٹتے، پھر اُس پر اپنا سامان لاد کر بیگار میں لگا لیتے۔ اُن کا دلّی پر بھی قبضہ تھا اور لارڈ لیک اور کیپٹن ؏ یہ دونوں مرہٹوں کے تعاقب میں دو مختلف سمتوں سے لگے ہوئے تھے۔

اِسی حالت میں مولانا منورالدین کا گھر سے نکل جانا، تنہا ہونا، صرف سولہ سال کی عمر کا ہونا، واقعی نہایت درجہ اُولوالعزمی کی بات تھی۔ اس سفر کے حالات خود اُنھوں نے اپنے مکاتبات میں لکھے ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور سے سرہند تک تو کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی اور ہر جگہ مختلف منزلوں پر سواریاں اور قافلے ملتے گیے، لیکن سرہند سے جوں ہی آگے بڑھے، سکھوں نے اُنہیں لوٹ لیا اور بیالکل تہی دست رہ گیے، مگر ایسے نہ تھے کہ گھر واپس جاتے۔ پیدل سفر کرنے لگے۔ جوتے پھٹ گیے اور ننگے پاؤں روانہ ہوئے۔ رات ہوئی تو کسی دیہات میں پڑ رہتے۔ اگر وہاں کسی مسلمان کا جھونپڑا مل جاتا

؏۱ یہ جگہ مسودہ میں خالی ہے

تو جُونی بھوسی کھا لیتے، ورنہ بھُوکے ہی سو جاتے۔ اِس طرح شوقِ علم میں یہ مصائب برداشت کرتے رہے۔

مرہٹہ فوج کی قید میں

کچھ آگے روانہ ہوئے، تو مرہٹوں کے ہاتھ میں پڑ گئے، اور اگرچہ انھوں نے اُس فوج کا نام نہیں لکھا ہے، جو اُنھیں ملی تھی، مگر تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فوج وہی تھی، جو دِلّی میں تھی اور انگریزوں کی آمد کی خبریں سُنکر بھاگی تھی۔ اُس نے حسبِ دستور انھیں پکڑ لیا۔ جو ایک آدھ کپڑا پاس تھا، وہ بھی چھین لیا، اور بے گار میں کام لینے لگی۔ اِن سے تین کام لیے جاتے تھے: گھوڑوں کی سائیسی، چھکڑوں کا کھینچنا، اور کبھی خچّروں کی نگہداشت۔

انھوں نے لکھا ہے کہ اِس حال پر ایک ہفتے تک برابر اِس فوج کے ساتھ رہے۔ کرنال سے جب آگے بڑھے، تو اچانک انگریزوں کی ایک فوج نظر آئی۔ گو انھوں نے اس کا نام بھی نہیں لکھا ہے، مگر یہ وہی تھی، جو کپتان... ...کی سرکردگی میں مرہٹوں کا تعاقب کر رہی تھی۔ چونکہ مقابلہ بالکل خلافِ توقع ہو گیا تھا، اس لیئے مرہٹے گھبرا کر بھاگ گیے اور اپنا تمام سامان چھوڑ گیے۔ اب وہ مرہٹوں کی قید سے چھوٹ کر انگریزوں کی قید میں آئے۔ خوش قسمتی سے یہ فوج دِلّی جا رہی تھی۔ اس میں بھی وہ بحیثیت بیگار کے کام کرتے رہے، مگر مرہٹوں کے مقابلے میں وہ اِس فوج اور اِس کے افسروں کی نرمی کی تعریف کرتے ہیں، ساتھ ہی اِن لفظوں میں تعجب کرتے ہیں کہ انگریزوں کے متعلق جو بات مشہور ہے۔

اُس کے خلاف دیکھا۔ دیہاتوں کو لوٹتے اور بلا قیمت ہر قسم کا غلہ وغیرہ لے لیتے ہیں۔

۱۰ اپریل ۱۸۰۳ء کو یہ فوج دہلی پہنچی اور لارڈ لیک کی فوج کے ساتھ شامل ہو گئی۔ لارڈ لیک اب تک اِس دھوکے میں محاصرہ کیے پڑا ہوا تھا کہ مرہٹے اندر ہیں، حالانکہ اُن کی اصلی فوج بھاگ چکی تھی۔ بالآخر یہ دونوں فوجیں شہر میں داخل ہو گئیں۔ اِس فوج کے محاصرے اور انگریزی و مرہٹی فوجوں کے حالات، عادات و اطوار، طریقِ جنگ، انتظامِ فوج، اور دِلّی کی اُس حالت اور آبادی، اِن سب باتوں کو اُنھوں نے چشم دید مفصل لکھا ہے۔ اُن کی تحریریں ایسے حالات ملتے ہیں، جو اور تاریخوں میں نہیں ملتے۔ اُنھوں نے جابجا انگریزوں کے حُسنِ انتظام اور قواعد دانی پر بڑے تعجب کے ساتھ اظہارِ تحسین کیا ہے، اور مرہٹوں کے حالات کی بہت وحشیانہ تصویریں کھینچی ہیں۔

شاہ عبد العزیز سے تلمذ

اِس طرح مولانا منوّر الدین دہلی پہنچے اور شاہ عبد العزیز صاحب کے حلقۂ درس میں داخل ہو گیے۔ اُن کے ہم درس، مولوی رشید الدین، مولوی برہان الدین، مولانا اسمٰعیل شہید، شاہ احمد سعید، اور مولانا محمد وجیہ وغیرہ تھے، اور یہ جماعت، شاہ صاحب کے اوّلین حلقۂ تلامذہ کی تھی۔

مولانا منوّر الدین برابر تحصیل میں مشغول رہے اور مکان پر کسی کو اپنی خبر نہ دی، یہانتک کہ چھ سال بعد جب والد کے شہید ہونے کی خبر آئی، تو قصور واپس گیے اور وہاں سے اپنے اعزہ کو لاکر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

تکمیل کے بعد خود اپنا حلقۂ درس قائم کیا جو تھوڑے ہی عرصے میں اتنا مشہور ہو گیا کہ بنگال اور دوسرے اطراف ہند سے طلبہ آ آ کر فیض یاب ہونے لگے۔ اِن کے مشاہیر تلامذہ میں بعض کے نام یہ ہیں: مولانا سدید الدین کہ جن کی اعانت سے لارڈ ہسٹینگز نے مدرسہ عالیہ (کلکتہ) قائم کیا، اور یہ اُس کے پہلے پرنسپل ہوئے۔ مولوی محبوب علی، جو غدر سے پہلے دہلی کے مشہور عالم تھے۔ مولوی فضل امام، جو مولوی فضل الحق خیر آبادی کے والد تھے، مولوی فضل رسول بدایونی، اور مولانا محمد علی گوپامئوی صاحبِ کشّافِ اصطلاحات الفنون وغیرہ۔

رُکنُ المدرّسی

بالآخر جب اِن کی شہرت بہت ہوئی اور علم کے علاوہ سلوک و طریقت میں بھی مشہور ہوئے، جس کا سلسلہ اُنھیں اپنے والد اور شاہ عبدالعزیز سے پہنچا تھا، تو شاہ عالم ثانی کے عہد آخر میں اُن کو مغلیہ سلطنت کا رکن المدرسین بنایا گیا۔

سلطنت مغلیہ میں علم و پیشوائی کے چار سب سے بڑے خطاب تھے، جو حکومت کی جانب سے دیے جاتے تھے:

مَلِکُ العلماء، سب سے بڑے عالم کو دیا جاتا تھا،

نقیبُ الاولیاء، صوفی صاحب طریقت کو،

ملکُ الاطباء، شاہی طبیب کو،

رکن المدرسین، سب سے بڑے صاحب درس و تلامیذ عالم کو، جس کا

حلقۂ درس سب سے زیادہ وسیع، اور بہ حیثیت ایک بڑے مدرس کے ملک میں تسلیم کیا جاتا ہو۔

یہ صرف خطاب ہی نہ تھے، بلکہ اِن کے ساتھ بہت بڑے منصب بھی وابستہ تھے۔ تمام علما کا دربار سے تعلق، مَلِکُ العلماء کے توسط سے ہوتا تھا۔ تمام اصحابِ طریقت کا نقیبُ الاولیاء کے ذریعہ سے، تمام اطباء کا، مَلِکُ الاطبا کے ذریعہ، اور اِسی طرح تمام اصحابِ درس و تعلیم کا رُکنُ المدرسین کے ذریعہ۔

رُکنُ المدرسی اُس عہد میں ایک طرح کی وزارت تعلیم تھی۔ تمام ہندستان میں جس قدر مدرسے اور پرائیویٹ درس گاہیں تھیں، یا علما اپنی اپنی مساجد میں یا مکانوں میں درس دیا کرتے تھے، ان سب کی نگرانی، نظم و نسق، اور وظائف و مناصب اور اوقاف وغیرہ کا انتظام، رُکنُ المدرسین ہی کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ چاروں خطاب، بیک وقت صرف چار ہی آدمیوں کو ملتے تھے۔

اگرچہ لارڈ لیک کے قبضۂ دہلی کے بعد سلطنت مغلیہ کا عملاً خاتمہ ہو چکا تھا، اور محض برائے نام شاہ عالم اور اکبر شاہ ثانی کی حکومت تھی، تاہم سلطنت کے دیگر کارخانوں کی طرح یہ عہدے بھی بدستور قائم تھے، اور جو شخص اِن میں سے کسی پر مقرر ہو جاتا تھا، اُس کا ایک قسم کا غیر سرکاری اثر تمام ملک میں پھیل جاتا تھا۔ مولانا منور الدین کے عالمگیر اثر کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ شاہ صاحب کے شاگرد، مولانا صدر الدین نے جب بہار ضلع بردوان میں مدرسہ قائم کیا، اور بحر العلوم کو بلانا چاہا، تو اُنھوں نے مدراس جانے کی وجہ سے معذوری ظاہر کی، البتہ لکھا کہ مولانا منوّر الدین سے مدد لو۔ چنانچہ دہلی آدمی آیا اور مولانا

نے اُن کے مدرسے کے لیئے اساتذہ وغیرہ منتخب کر دیے۔

اُن کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ اُن کے خاص مدرسے کے، جو خود اُن کے مکان میں تھا، پچاس سے زائد مدرسے دِلّی اور اطراف میں ایسے تھے، جن کے وظیفے اُن کے توسط سے قلعۂ دہلی سے ملتے تھے، اور اگرچہ اُس وقت بادشاہ خود ایسٹ انڈیا کمپنی کا وظیفہ خوار تھا اور کوئی بڑی مدد نہ مل سکتی تھی، تاہم اُنھوں نے اپنے ذاتی اثر سے کام لے کر امرا داعیان کو آمادہ کر کے بہت سے تعلیمی انتظامات انجام دیے۔

جامع مسجد کے مدرسے اور بعض اطراف کے مدرسوں میں تقریباً پانچسو طلبہ کی ضروریات کا انتظام ہوتا تھا۔ شاہ صاحب کے انتقال کے بعد اُنھوں نے شاہ صاحب کے پنج کے حلقۂ درس کو، جو شاہ ولی اللہ کے وقت سے چلا آتا تھا، ایک باقاعدہ مدرسہ کی صورت میں "مدرسۂ عزیزیہ" کے نام سے بنا دیا، اور اس میں طلبہ کی بہت بڑی جماعت کے قیام وغیرہ کا انتظام کیا۔ مختلف مساجد، جو غیر آباد تھیں، اُنھوں نے اُن میں مدرسے قائم کیے، چنانچہ بیگم اورنگ کی مسجد میں بھی ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جو اب حصار کے متصل چھاؤنی کے احاطے میں آگئی ہے۔ یہ مسجد چھوٹے پیمانے پر جامع مسجد کے نمونے پر ہے۔ اِس میں دو رُویہ تقریباً ساٹھ حجرے ہیں اور لکھا ہے کہ اِن سب میں طالب علم تھے، اور شاہ عبدالقادر مترجم قرآن، اِس کے منتظم تھے۔

جامع مسجد کے تینوں دروازوں کے بالائی حجروں میں شاہجہاں نے

مدرسہ قائم کیا تھا، اور اوپر کی گیلری بھی مدرسے کے کام آتی تھی۔ شاہ عبدالرحیم اس مدرسے میں درس دے چکے ہیں، لیکن تنزلِ حکومت کے بعد یہ مدرسہ بالکل بند ہوگیا تھا، مگر انھوں نے اپنے زمانہ رُکنُ المدرسی میں از سرِ نو اسے جاری کیا اور مفتی صدرالدین، جو اُس وقت نئے نئے فارغ ہوئے تھے، اِس کے مہتمم و صدر مدرس قرار پائے۔ یہ درس گاہ غدر سے کچھ پہلے تک رہی اور گزشتہ عہد کے بعض مشہور علما اِس سے نکلے۔ اِس کے تمام مصارف، مولانا خود اپنی جیبِ خاص سے دیتے تھے۔ اُن کی ہجرت کے بعد غالباً مفتی صدرالدین اِس کے کفیل ہوئے۔

اِستغنا

مولانا منورالدین اگرچہ شاہی تعلقات کی وجہ سے ایک شاہی منصب رکھتے تھے، تاہم اُن کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی زندگی نہایت ہی بے تعلقی اور بے باکانہ حق گوئی اور فقر و استغنا میں بسر کی۔ امرا اگرچہ اُن سے نہایت عقیدت رکھتے تھے، لیکن یہ بھی اُن کے اصولِ زندگی میں سے تھا کہ کسی امیر کے مکان پر نہ جاتے اور نہ ضیافت قبول کرتے۔ وہ لوگ خود اِن کے یہاں آتے۔ البتہ فقرا کے یہاں بے تکلف جاتے اور انھیں اپنے یہاں بلاتے۔ مغلیہ سلطنت کے تنزل کے بعد اطراف دہلی میں سات خود مختار ریاستیں قائم ہوگئی تھیں، جو "ریاست ہفت گانہ" کے نام سے مشہور تھیں، جن میں سے ریاست دوجانہ اب تک موجود ہے۔

ان میں سب سے زیادہ قوی اور صاحب اثر ریاست جھجھر کی تھی اور قلعۂ دہلی کے تنزل کے بعد دہلی کے علما و فقرا کی اعانت زیادہ تر وہیں سے ہوتی تھی۔ نواب جھجھر نے بارہا کوشش کی، حتیٰ کہ اکبر شاہ ثانی کو درمیان میں ڈالا اور سفارش کرائی کہ مولانا اُس کے لڑکے کی شادی میں چند لمحے کے لیے آجائیں، مگر اُنھوں نے انکار کر دیا اور بادشاہ کی درخواست رد کر دی۔ اِسی قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں، جن سے اُن کے علوِ نفس اور قناعت کا پتہ چلتا ہے۔

ڈولے کی رسم پر بادشاہ کو توبیخ

اُن کے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حال اس واقعے سے معلوم ہوگا:

شہنشاہ اکبر نے ہندو راجاؤں کی لڑکیوں سے مناکحت کا قاعدہ سیاسی اغراض سے جاری کیا تھا۔ جس وقت تک حکومت عروج پر تھی، اودے پور کے سوا تمام راجے بڑے فخر سے اپنی لڑکیاں پیش کرتے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ بعض لڑکیاں تو نکاح سے پہلے مسلمان ہو جاتی تھیں اور پھر اسلامی طریقے پر اُن سے نکاح ہوتا تھا، جیسا اورنگ زیب نے کیا، لیکن زیادہ تر یوں ہی محض قبضہ و تملیک، عقد نکاح کے قائم مقام ہوتی تھی۔ غالباً دنیا پرست علما نے یہ حیلہ پیدا کر لیا تھا کہ یہ لونڈیوں کے حکم میں ہیں، اور قبضے کی موجودگی میں نکاح کی ضرورت نہیں، حالانکہ یہ بالکل خلاف شرع تھا۔

اول تو مشرکات سے نکاح ناجائز، پھر اگر وہ ملکِ یمین قرار دی جائیں، تو ظاہر ہے کہ ہندو، ذمّی تھے۔ استرقاق کے لیے حربی ہونا شرط ہے۔

بہرحال اکبر کے وقت سے یہ رسم جاری تھی اور بڑے بڑے بادشاہ اسی طرح پیدا ہوئے، اس لیے معاملہ بہت نازک ہوگیا تھا۔ کیونکہ اگر اس عدم جواز پر زور دیا جاتا تو معنیٰ یہ تھے کہ جہانگیر، شاہ جہاں دارا شکوہ، شجاع اور فرخ سیر تک کی پیدائش معرضِ بحث میں آجاتی، اِس لیے یہ ایک ایسا موضوع تھا کہ علمائے دنیا کبھی اِس طرف اشارہ تک نہ کرتے۔ اور اِسے اپنے لیے موجبِ ہلاکت تصور کرتے تھے۔

تنزلِ حکومت کے بعد اب اِس کا موقع نہ رہا تھا کہ بڑے بڑے راجہ لڑکیاں پیش کرتے، لیکن چھوٹے چھوٹے زمیندار اور رئیس، شاہی تقرب کے لیے اب بھی ایسا کرتے تھے اور اس طریقے کو "ڈولا" کہا جاتا تھا، اور قلعہ میں کوئی شاہزادہ نہ تھا، جس کے لیے ڈولے نہ آتے ہوں۔

ایک دن قلعے میں کوئی تقریب تھی۔ بادشاہ نے درخواست کی کہ مولانا منوّر الدین وعظ کہیں۔ قاعدہ یہ تھا کہ جب کبھی ایسی تقریب ہوتی، تو دربار عام میں مجلس ہوتی۔ تمام امراء و سلاطین[1] اس میں بیٹھتے اور بادشاہ اپنے جھروکے میں بیٹھتے۔ مولانا منوّر الدین ہمیشہ ڈولے کی رسم کی علانیہ مخالفت

---

(۱) یعنی شاہزادے۔

کرتے اور اُسے حرام بتاتے تھے۔ حکیم احسان اللہ خاں کو خیال ہوا کہ مبادا مولانا اِس شاہی مجلس میں بھی ڈولے کا ذکر نہ چھیڑ دیں، اِس لیے اُنھوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر چپکے سے اُن کے کان میں کہا، آج ہی ایک ڈولا قلعے میں آیا ہے، جس کے لیے بادشاہ کو بہت اہتمام تھا۔ خیال رہے کہ اُن کی طبیعت پر آپ کی کوئی بات گراں نہ گزرے۔

مولانا نے جب یہ سُنا تو محسوس کیا کہ اب سب سے مقدم یہی معاملہ ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا یہی وقت ہے، چنانچہ انھوں نے سورۂ مومنون کا پہلا رکوع پڑھا، جس میں ہے " وَالْحَافِظِیْنَ لِفُرُوْجِھِمْ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِھِمْ اَوْمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَاِنَّھُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ " اور اِسی پر وعظ بیان کرنے لگے اور نہایت صفائی سے بتایا کہ ان دو طریقوں کے علاوہ اور تمام طریقے حرام ہیں۔ ڈولا نہ نکاح ہے اور نہ ملک یمین، اس لئے زنا کے حکم میں ہے۔

حکیم احسان اللہ کا بیان ہے کہ جب مولانا نے یہ کہنا شروع کیا، تو مجھ پر ایسی پریشانی طاری ہوئی اور میں سمجھا کہ آج نہ صرف اِن پر بلکہ ہم سب پر سخت آفت آئے گی، حتیٰ کہ میں آخر میں بالکل مبہوت ہوگیا اور نہ معلوم ہو سکا کہ کب اُنھوں نے وعظ ختم کیا۔

لیکن اس کا نتیجہ بالکل برعکس تھا۔ بادشاہ از حد متاثر ہوئے، حتیٰ کہ اُن کے رونے کی آواز باہر والوں نے سُنی۔ پھر بے اختیار چلمن سے نکل آئے اور اپنا دوشالہ، مولانا کے کاندھے پر ڈال دیا، اور کہا، آپ گواہ رہیں کہ میں نے

اِس فعل سے توبہ کی، اور آج کی تاریخ سے حکم دیتا ہوں کہ یہ رسم بالکل اُٹھا دی جائے!

چنانچہ مولانا کی حق گوئی اور جراءت کی بدولت یہ قبیح رسم یک لخت بند ہو گئی۔ جن سلاطین کے گھروں میں ڈولے تھے، اُنھوں نے یا تو الگ کر دیے اور یا نکاح کر لیا۔

بہادر شاہ سے تصادم

ایسا ہی ایک واقعہ بہادر شاہ کے زمانے میں بھی پیش آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی بالکل مٹ چکی تھی اور لکھنؤ میں اودھ کی ریاست کی وجہ سے دولت کا ایک نیا مرکز پیدا ہو گیا تھا۔ آغازِ حکومتِ مغلیہ سے کوئی طاقت ور شیعہ مرکز ہندستان میں نہ ہوا تھا۔ بہادر شاہ اوّل اوّل شیعہ ہو گیا لیکن اُس کو بھی شیعیت کے اعلان کی جراءت نہ ہوئی۔ ایرانی امرا بھی اپنی شیعیت ہمیشہ چھپاتے رہے، اور یہ مذہب کبھی ہندستان میں اُبھر نہ سکا، لیکن اب لکھنؤ میں شیعہ امرا کے غلو اور دعاوی کی وجہ سے تمام ملک میں ایک نئی سرگرمی شیعیت اور سُنیت کی پیدا ہو گئی تھی۔ لکھنؤ میں چونکہ تقرّب کا ذریعہ صرف شیعیت تھی، اِس لیے دنیاداروں کے لیے ایک بڑی کشش پیدا ہو گئی تھی۔ انہی حالات کو دیکھ کر شاہ صاحب کو تحفۂ اثنا عشریہ لکھنا پڑی۔

شیعیت کا اثر قلعے پر بھی چھا رہا تھا۔ بہادر شاہ اب اگرچہ سُنّی تھا، مگر ولی عہد کی ماں، تاج محل شیعہ تھیں۔ لڑکوں میں فیروز بخت، جو ولی عہد سے چھوٹا تھا،

علانیہ شیعہ ہو گیا تھا، اور چونکہ دیکھ چکا تھا کہ مرزا سلیمان شکوہ کے خاندان کو شیعہ ہونے اور لکھنؤ جانے سے بہت کچھ دنیاوی فوائد حاصل ہو چکے تھے، اِس لیے یہ بھی شیعیت کے ذریعہ سے دربارِ لکھنؤ سے رسم و راہ رکھتا اور بہت سی خیالی اُمیدیں اِس میں جاگزیں ہو رہی تھیں۔

بہادر شاہ ایک نہایت کمزور اور توہم پرست آدمی تھا۔ اس کو بھی طرح طرح کی بے بنیاد اور خیالی امیدوں کے ذریعہ گرویدہ کیا جاتا تھا، چنانچہ مرزا فیروز نے قلعے میں ایک بڑی سازش کی، جس کا منشا یہ تھا کہ بہادر شاہ کے ذہن نشین کیا جائے کہ اگر وہ شیعہ ہو جائیں، تو لکھنؤ کی ریاست اُن کی اطاعت و خدمت گذاری کے لیئے اٹھ کھڑی ہو گی، یا کم از کم اُس سے کوئی غیر معمولی مقدار دولت کی ملے گی۔ اِن لوگوں نے اُسے سمجھایا تھا کہ اگر بادشاہ شیعہ ہو جائے تو اِس سے ہندوستان کے تمام مسلمانوں پر اثر پڑے گا، کیونکہ بہرحال وہ اب تک مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔

اتفاق سے اِسی اثنا میں بہادر شاہ سخت بیمار پڑا، اور اُس کی ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اُٹھا کر یہ بات گھڑی گئی کہ اگر آپ ائمۂ اثنا عشر کی منت مانیں، تو شفا ہو جائے گی۔ اس کے بعد صحت ہونے پر زور ڈالا گیا کہ اِس کے شکرانے میں قلعے کے اندر امام باڑہ بنائیں اور علم و تعزیہ اُٹھائیں۔ ان حالات سے شہ پاکر مرزا فیروز نے ایک کارروائی یہ کی کہ رسالہ حسینیہ جو ایک فرضی میلانے کا پُرانا فارسی رسالہ تھا اور اس میں صریح تبرا تھا، قلعے کے شاہی پریس میں چھپوا کر شائع کیا۔

چونکہ یہ کارروائی ایک شاہزادے کی تھی، بہادر شاہ خود ضعفِ اعتقاد سے ڈانواڈول ہو رہا تھا، تاج محل شیعہ تھیں، مرزا ابوبکر ولی عہد اور بادشاہ میں بگاڑ تھا، بیگمات اندر اندر سازشوں میں سرگرم تھیں، لکھنؤ کا شیعی دربار بہت شہرت و اثر رکھتا تھا، اِن اسباب سے دنیا پرست علما کو بہت تامّل ہوا کہ اِس کے خلاف کوئی کارروائی کریں، لیکن مولانا منوّر الدین خاموش نہ رہ سکے اور فوراً پہلے ہی جمعہ میں جامع مسجد میں اس رسالے کا رد بیان کیا، اور بہادر شاہ کی اِس چشم پوشی پر سخت لعنت و ملامت کی، اور اِس کے بعد اِس قدر سختی سے بادشاہ کا تعاقب کیا کہ اُسے بالآخر رسالۂ حسینیہ کے ضبط کرنے کا حکم دینا پڑا۔ ساتھ ہی اُس نے اعلان کیا کہ میں سُنّی ہوں، اور میری لاعلمی میں مرزا فیروز بخت نے یہ کارروائی کی ہے۔ پھر دربارِ عام میں ایک بہت بڑی مجلس کی، اور مولانا منوّر الدین نے بادشاہ کی طرف سے اِسی مضمون کی ایک تحریر پڑھ کر سُنائی۔ اِس کے بعد ایک محضر تیار کیا اور اُس پر تمام علما، اہلِ دربار، اور امرا کے دستخط کرائے۔ اِنھوں نے رسالۂ حسینیہ کا جو جواب لکھا تھا، اُس کے آخر میں یہ محضر شامل کیا ہے۔ خود بادشاہ نے نظم میں اِس رسالے پر تقریظ لکھی ہے اور اُسی کے حکم سے وہ شاہی پریس میں چھاپا گیا۔ یہ رسالہ میری لائبریری میں موجود ہے۔

مولانا منوّر الدین کے طبعی حالات، عام طبائع سے الگ واقع ہوئے تھے۔ طبیعت میں بے حد نفاست تھی، جو امارت کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ مکان میں روزانہ ہر چیز بدلی جاتی تھی۔ حکم تھا کہ نوکروں کے لباس سے لے کر بارہ دری کی چاندنی تک ہر چیز دھوئی ہوئی ہو۔ کوئی نوکر اُن کے سامنے ایک دن کا دھلا

ہوا کپڑا پہن کر نہ جا سکتا تھا۔ سواری کا بھی نہایت شوق تھا۔ بیک وقت طرح طرح کی پالکیاں، پینسیں، اور جانور اُن کی ڈیوڑھی پر موجود رہتے تھے۔ لباس میں بے انتہا، صفائی و نفاست تھی۔ اُن کے لباس کا ہر جُز، ہمیشہ سفید ہوتا تھا جوتی بھی سفید بانات کی پہنتے تھے۔

نہایت خوش نویس تھے۔ تصنیف و تالیف کا بھی بہت شوق تھا، اگرچہ اُن کے صرف ایک دو رسالے چھپے، لیکن متعدد علمی تصانیف موجود ہیں۔ مشارق الانوار کی شرح عربی میں لکھی، جس کی دو جلدیں ملی ہیں۔ فارسی میں سیرۃ النبی کے نام سے ایک کتاب لکھی، جو دال۔ مرحوم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود ہے۔ درسیات میں بکثرت چھوٹی بڑی کتابوں پر اُن کے حواشی ہیں، جن میں بعض مکمل اور بعض غیر مکمل ہیں۔ مکمل میں ان کا حاشیہ، مطوّل کا ہے، جو نہایت خوش خط موجود ہے۔ اِس کے علاوہ اُن کے متعدد رسالے، مناظرے، خصوصاً مولانا اسمٰعیل شہید کے رد میں ہیں۔

مولانا اسمٰعیل شہید سے مقابلہ

مولانا اسماعیل شہید کے ساتھ اُن کا جو شدید اختلاف بلکہ مخالفت ہوئی، اس کی بابت جو رائے بھی قائم کی جائے، تاہم اس کا تفصیل سے دکھانا ضروری ہے، جس سے مولانا منوّرالدین کا اپنے عقائد میں تصلُّب، جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے، اُس کے احقاق میں سرگرمی، اور جسے باطل سمجھتے تھے، اُس کے رَدّ و اِزالے میں ان تھک، ہمت ظاہر ہوتی ہے۔

مولانا محمد اسماعیل شہید، مولانا منورالدین کے ہم درس تھے۔ شاہ عبدالعزیز کے انتقال کے بعد جب اُنھوں نے تقویۃ الایمان اور جلاء العینین لکھی اور اُن کے اِس مسلک کا ملک میں چرچا ہوا، تو تمام علماء میں ہلچل پڑ گئی۔ اُن کے رد میں سب سے زیادہ سرگرمی بلکہ سربراہی مولانا منورالدین نے دکھائی۔ متعدد کتابیں لکھیں اور ۱۲۴۰ھ والا مشہور مباحثہ جامع مسجد کیا۔ تمام علمائے ہند سے فتویٰ مرتب کرایا۔ پھر حرمین سے فتویٰ منگایا۔ اُن کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے ابتدا میں مولانا اسماعیل اور اُن کے رفیق اور شاہ صاحب کے داماد، مولانا عبدالحی کو بہت کچھ فہمائش کی، اور ہر طرح سمجھایا، لیکن جب ناکامی ہوئی، تو بحث و رد میں سرگرم ہوئے، اور جامع مسجد کا شہرۂ آفاق مناظرہ ترتیب دیا، جس میں ایک طرف مولانا اسماعیل اور مولانا عبدالحی تھے اور دوسری طرف مولانا منورالدین اور تمام علمائے دہلی۔

بحث ان تمام مسائل پر تھی، جو تقویۃ الایمان کی وجہ سے چھڑ گئے تھے، مثلاً امتناعِ نظیرِ خاتم النبیین، حقیقتِ بدعت، شہداء و قبور و اموات سے استغاثہ و استمداد، رفع الیدین، حقیقت شرک، توسل الیٰ غیر اللہ، مَا اُھِلَّ بِغَیْرِ اللہِ میں تسمیہ کا اعتبار عند الذبح یا اہلال؟

لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ مباحثہ بالکل بے نتیجہ تھا، کیونکہ فریقین میں صرف مسائل ہی میں نزاع نہ تھی بلکہ اصول و مبادیات میں بھی بُون شلع تھا۔ مولانا منورالدین اور ان کی جماعت جا بجا استناد و استشہاد بعض علما کی کتابوں، شاہ عبدالعزیز کے خاندان کے طرزِ عمل، اور مختلف مکاتیب و ملفوظات سے

کرتے تھے اور اسے دلیل و حجت سمجھتے تھے۔ مولانا اسماعیل صرف قرآن و حدیث سے سند مانگتے تھے۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں نتیجہ محال تھا۔

مولانا منوّر الدین نے اس مباحثے کا حال خود قلم بند کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تمام دلائل ختم ہو گئے تو اِن کی طرف سے یہ دلیل پیش کی گئی کہ شاہ عبدالعزیز پنج شنبہ کو شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالرحیم کے مزارات پر جاتے اور توصل و استغاثہ کرتے تھے، اور تم لوگ بھی اُن کے ساتھ وہاں حاضر رہتے تھے، لیکن مولانا عبدالحی نے جب جواب دیا کہ دلیل، قرآن و حدیث سے ہونا چاہیے نہ کہ زید و عمرو کے افعال سے، تو اِسے شاہ صاحب کی توہین پر محمول کیا گیا۔ مجلس میں شور اُٹھا کہ یہ لوگ اپنے بزرگوں اور اُستادوں سے بھی برگشتہ ہو گئے ہیں!

جو رسالہ مولانا منوّر الدین کا موجود ہے، اُس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بدعت کو حسنہ و سیّئہ بلکہ چھ قسموں پر منقسم کرتے تھے اور دلیل میں نووی کی شرح مسلم پیش کرتے تھے، جس میں بدعت کی چھ قسمیں بتائی گئی ہیں اور ایک قسم کو واجب قرار دیا گیا ہے۔ مولوی عبدالحی بدعت شرعی کو غیر منقسم اور صرف ایک قسمِ ضلالت میں محدود بتاتے تھے۔ مولانا اسمٰعیل نے شرحِ مسلم کے جواب میں کہا کہ جو مثالیں بدعت حسنہ کی دی گئی ہیں، وہ دراصل بدعت شرعی نہیں ہیں، اور ہم جس بدعت کا ذکر کرتے ہیں، وہ بدعت شرعی ہے نہ کہ لغوی، مثلاً تدوین علم فقہ و علم توحید و عقائد اور تعمیر

مدارس، اور تدوین علوم - یہ چیزیں بدعت شرعی کی اصطلاح میں نہیں آتیں، اور نووی نے اسی پر زور دیا ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے اِس بیان کی کوئی شنوائی نہ ہوئی بلکہ اِس پر محمول کیا گیا کہ علما، محدثین سے بھی یہ لوگ منکر ہیں!

اس معاملے میں مولانا فضل امام خیرآبادی اور دیگر علما اُن کے (مولانا منورالدین) شریک و معاون تھے۔ چنانچہ اُن کی ایک تصنیف، خاص مسئلہ امتناعِ نظیر خاتم النبیین پر ہے، جس میں بڑے ہی شرح و بسط سے معقولات کی بنا پر بحث کی ہے۔

ایک کتاب مجموعی طور پر تقویۃ الایمان، جلاء العینین، اور یک روزی کے رد میں ہے۔ اس میں تقویۃ الایمان کے تیس مسئلے ما بہ النزاع منتخب کیے ہیں اور پھر تیس بابوں میں اُن کا رد کیا ہے۔ ایک رسالہ اس باب میں ہے کہ مولانا اسماعیل شہید کے عقائد کا رد خود اُن ہی کے خاندان اور اساتذہ کی کتب سے کیا جائے، چنانچہ اِس میں ہر مسئلے کے رد میں شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالقادر، اور شاہ رفیع الدین کے اقوال سے اپنے نزدیک رد کیا ہے۔

ایک رسالہ مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ کے جھگڑے کی نسبت ہے۔ اس میں اُنھیں بڑی مشکل پیش آئی، اِس لیے کہ یہ مسئلہ دراصل شاہ عبدالعزیز کی وجہ سے چھڑا۔ اُنھوں نے تفسیر فتح العزیز میں اِس کی تفسیر کرتے ہوئے صاف لکھ دیا کہ اِہلال سے مقصود، نداو ہے، نہ کہ عندالذبح

اُس کا منسوب کرنا۔ اگرچہ شاہ صاحب اُن کے اُستاد ہیں، تاہم اِس مسئلے میں بڑی سختی سے اُن کا رد کیا ہے اور اپنے نزدیک یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تمام مفسرین سلف کے خلاف اُنھوں نے یہ تفسیر کی ہے۔ اِس کے آخر میں بہت سے علما کی تقریظیں و تحریریں ہیں، جن میں ایک تقریظ، مفتی صدر الدین کی بھی ہے۔ ایک رسالہ، مسئلہ شدِ رحال اور شرح حدیث مسلم میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اُس وقت لوگ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی تصانیف سے نا آشنا تھے، مگر کسی طرح یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ ابن تیمیہ نے اِس حدیث کی بنا پر مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی اور مقام کو شدِ رحال نیّتِ ثواب حرام بتایا ہے۔ دیباچے میں لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے اِس بارے میں ریاست ٹونک سے استفتا آیا تھا، چنانچہ اُس کے رد میں یہ پوری کتاب عربی میں لکھی ہے۔

مولانا منوّر الدین بہت بڑے واعظ تھے۔ اُن کا وعظ سننے کے لیے لوگ ہر جمعہ کو جوق جوق آتے اور تیس تیس چالیس چالیس میل پیدل واپس جاتے۔ بڑے بڑے علما مشائخ، امرا اور شاہزادے اُن کے وعظ کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور متاثر ہو کر معاصی سے تائب ہو جاتے۔

ہجرت

غدر سے پہلے علمائے دہلی کا یہ حال تھا کہ ہندستان کی حالت اور بربادیاں دیکھ کر عموماً یہاں کے قیام سے برداشتہ خاطر ہو گئے تھے اور

ایک ایک کر کے یہاں سے روانہ ہونے لگے تھے۔ عام طور پر ہر سال بڑی بڑی جماعتیں جایا کرتی تھیں، جو قافلے کے نام سے مشہور تھیں۔ اِس بات کی شہرت تمام ملک میں پھیل گئی تھی، اور مختلف مقامات سے مہاجرین و حجاج کی جماعتیں دہلی آتیں اور یہاں سے روانہ ہوتی تھیں۔ ایک بڑا قافلہ، شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب کا تھا۔

اِن کے بعد مولانا منوّر الدین بھی ہندستان سے برداشتہ خاطر ہو گیے اور ہجرت پر آمادہ ہوئے۔ اِن کے مریدین و معتقدین تمام شمالی ہند و پنجاب میں پھیلے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے یہ سُنا تو جوق جوق آنے لگے، اور کچھ دنوں کے لئے دہلی کا یہ حال ہو گیا کہ ہزاروں آدمی اُس کی آبادی میں بڑھ گیے۔ اِس ہجوم کی وجہ سے وہ اس سال نہ جاسکے اور دوسرے سال روانہ ہوئے۔ اُن کے ساتھ مریدین کے علاوہ علما کی بھی ایک بڑی جماعت تھی، اور متعدد امرا بھی تھے، جن میں نواب فخر الدین اور نواب عالم خاں رئیس تلّب گڑھ بھی ہمراہ تھے۔

بیگم بھوپال کی توبہ

اُس زمانے میں بمبئی سے نیا سلسلہ سفر حجاز کا شروع ہوا تھا، اور یمنوں کے جہاز آنے جانے لگے تھے۔ چنانچہ یہ بمبئی روانہ ہوئے۔ جب بھوپال پہنچے، تو نواب سکندر بیگم کا زمانہ تھا۔ وہ اِن کا ذکرِ خیر پہلے سے سُن چکی تھیں۔ اُنھوں نے نہایت اصرار کے ساتھ کہا کہ چند دن بھوپال میں قیام

فرمائیں۔ نواب سکندر بیگم کے حالات ویسے ہی ناخوش گوار تھے، جیسے عموماً امرا کے ہوا کرتے ہیں۔ مولانا کو اِن حالات کی اطلاع تھی۔ یہ شہر سے باہر رُک گیے اور کہلا بھیجا کہ میں اِس شرط سے آ سکتا ہوں کہ بیگم صدق دِل سے تائب ہو۔ بیگم خود شہر سے باہر آکر اُن کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس درجہ متاثر ہوئی کہ اُن کے ہاتھ پر تائب ہو گئی، اور شہر میں لاکر اُسی محل میں ٹھہرایا، جسے پہلے ایک تالاب کے وسط میں عیش و نشاط کے لیئے بنایا تھا، اور اب مسجد کر دیا تھا۔

چند دن کے بعد مولانا نے آگے بڑھنا چاہا، مگر بیگم مانع ہوئی اور چندے توقف کرنے کی درخواست کی۔ اِس پر اُنھوں نے اپنے مستعجل رفقا کو سفر کی اجازت دے دی اور خود اِس سال ٹھہر گیے۔ بھوپال میں اُن کی وجہ سے بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ نواب بیگم کی بالکل کایا پلٹ ہو گئی، اور ایک بڑی خلقت اُن کے ہاتھ پر تائب ہو کر مرید ہوئی۔

قیام بھوپال کے زمانے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ نواب جہاں گیر خاں، جو نواب سکندر بیگم سے غایت درجہ وابستہ تھا، جب مولانا کے ہاتھ پر تائب ہونے کی وجہ سے بیگم کی نظر التفات سے محروم ہو گیا، تو اُسے اِن سے سخت حسد و رنج پیدا ہوا۔ پہلے اُس نے کوشش کی کہ وہ بھوپال سے فوراً چلے جائیں۔ جب اس میں ناکامی ہوئی، تو اُن کی ہتک کے لیئے چند دنیا پرست مولویوں سے ساز باز کیا، اور ایک جمعہ میں جب کہ وہ وعظ بیان کر رہے تھے، اُن مولویوں سے سوال کرایا کہ آپ اِتنے

بڑے پیر اور عالم ہو کر حقہ کیوں پیتے ہیں؟ اُس زمانے میں حقّے کے باب میں بہت تشدد تھا۔ مولانا بعض بیماریوں سے حقّہ پینے لگے تھے۔ اِس کا اُنھوں نے ایسا جواب دیا کہ تمام مولوی دم بخود رہ گیے اور تمام مجمع نے اُنھیں مارنا پیٹنا چاہا، مگر اُن کی سفارش سے بچ گئے۔

جب اِس میں بھی ناکامی ہوئی، تو نواب جہانگیر خاں نے اُنھیں زہر دے دینا چاہا، چنانچہ ایک روز جب بیگم کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے، اور متعدد امرا اور خود جہانگیر خاں بھی دسترخوان پر تھے، اور بیگم خود اپنے سامنے سے کھانے کی قابیں اُٹھا اُٹھا کر مولانا کے سامنے رکھتی تھی کہ ایک پلیٹ مزعفر کی بیگم نے اِن کے سامنے اُٹھا کے رکھی۔ اِسی میں درحقیقت زہر تھا۔ مولانا کو کسی طرح یہ مکیدہ معلوم ہو گیا، اور اُنھوں نے وہ قاب اُٹھا کر نواب جہانگیر خاں کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھائی نواب صاحب، یہ آپ کے کھانے کی چیز ہے! نواب پر اِس بات کا ازحد اثر پڑا۔ اُس نے اِسے اُن کی کرامت تصور کیا۔ بے اختیار کانپنے لگا، اور اُسی وقت قدموں پر گر کر صدق دِل سے تمام معاصی و فسوق سے توبہ کی۔ پھر تو اُس کی یہ حالت ہوئی کہ اُن کی جوتیاں اُٹھا کر پالکی کے ساتھ دوڑتا اور اِسے اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا۔

ایک سال کے بعد مولانا بھوپال سے بمبئی عازم ہوئے، مگر وہاں پہنچتے ہی بیمار ہو گیے اور اِس سال بھی نہ جا سکے۔ اس قیام کی وجہ سے صوبہ بمبئی، کاٹھیاوار اور گجرات میں اُن کا اثر بہت پھیل گیا اور ہزاروں

آدمی، بیعت میں داخل ہوئے۔ یہاں دو سال قیام رہا۔ تیسرے سال مکہ معظمہ پہنچے اور پانچ سال میں پانچ حج کر کے وہیں انتقال کیا، اسی سال ہندستان میں غدر ہوا۔

شیخ محمد ہادی

قیام دہلی کے زمانے میں مولانا منور الدین کا شیخ محمد بن شیخ جمال الدین کے خاندان سے تعارف ہوا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مشورے سے انھوں نے دہلی ہی میں شادی کر لی تھی، جس سے صرف دو لڑکیاں تھیں۔ بڑی کی شادی، شیخ محمد ہادی سے کر دی تھی، جو شیخ محمد احسن کے سب سے چھوٹے لڑکے تھے۔ شیخ محمد احسن، مولانا جمال الدین کے خاندان سے تھے۔ اور بحیثیت شیخ طریقت کے دہلی میں اُن کا خاندان چلا آتا تھا۔ شیخ محمد احسن کے تین لڑکے تھے: سب سے بڑے شیخ محمد یوسف تھے، جنھوں نے شاہ عبدالعزیز سے علوم کی تکمیل کی تھی۔ طب بھی پڑھی تھی اور بحیثیت طبیب کے نمایاں شہرت رکھتے تھے۔ بہت بڑے خوش نویس تھے اور اُن کے لکھے ہوئے قطعات دُور دُور لے جائے جاتے تھے۔ اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں خود میں نے دیکھی ہیں، اور نہایت خوب ہیں، جو اُنھوں نے محض اپنے شوق سے نقل کی تھیں۔ انہیں اگرچہ تمام علوم میں دخل تھا، مگر معقولات سے زیادہ شوق تھا۔ غدر سے سات آٹھ سال پہلے جب شاہ محمد اسحاق و شاہ محمد یعقوب نے ہجرت کی، تو یہ بھی اُن کے ساتھ چلے گئے۔ مدینہ منورہ میں

قیام کیا، اور درس و تدریس میں مشغول ہو گیے۔ والد مرحوم نے لکھا ہے کہ حجاز میں معقولات کی اشاعت انھی کے ذریعہ سے ہوئی، ورنہ پہلے لوگ اِس سے بالکل ناواقف تھے۔ اِنھوں نے وہاں تصوّف میں نقش بندی طریقے کی اشاعت کی۔ اِن کے ایک مرید نے ایک کتاب ۔ ۔ ۔ (۱) ۔ ۔ کے نام سے لکھی ہے، جو مصر میں چھپ گئی ہے۔ اِس کے دیباچے میں لکھا ہے کہ مجھے شیخ محمد یوسف سے جو اشغال ملے ہیں، اُنھیں قلم بند کرتا ہوں۔ غدر سے پانچ چھ سال بعد انتقال کیا اور جنت البقیع میں دفن کیے گیے۔

اِن سے چھوٹے بھائی، شیخ محمد متقی تھے۔ اِنھوں نے بھی علوم کی تحصیل شاہ عبدالعزیز سے کی، مگر تکمیل مولانا منورالدین سے، اور اپنے والد کے جانشین ہوئے۔ یہ بھی غدر کے بعد ہندستان سے ہجرت کر گیے اور مدینہ منورہ میں اپنے بھائی کے ساتھ رہے۔

سب سے چھوٹے بھائی شیخ محمد ہادی تھے، اور یہی میرے دادا ہیں۔ اِنھوں نے علوم کی تکمیل، مفتی صدرالدین سے کی اور شاہ صاحب کے مشورے سے مولانا منورالدین نے اپنی بڑی لڑکی اِن سے منسوب کر دی۔ یہ اپنی غیر معمولی ذہانت و حافظے کی وجہ سے ضرب المثل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پوری قاموس، تمام کتب درسیہ، اور اُن کے حواشی اِس طرح ازبر تھے۔ کہ اِن کے اساتذہ کہا کرتے تھے کہ اگر یہ کتابیں گم ہو جائیں، تو یہ اپنے حافظے

---

(۱) مسودہ میں یہ جگہ خالی ہے

سے پھر لکھ دے سکتے ہیں، لیکن اُنھوں نے بہت کم عمر پائی اور تقریباً
پچیس سال کی عمر میں فوت ہو گئے۔ میرے والد اُس وقت تین یا چار
برس کے تھے، اور اِن کی پرورش، مولانا منوّر الدین نے کی۔

مولانا خیرالدین صاحب

میرے والد، مولانا خیرالدین ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والدین کا صغرسنی ہی میں انتقال ہوگیا تھا، اس لیے نانا کے یہاں پرورش ہوئی۔ یہ زمانہ دہلی کا ایسا زمانہ تھا کہ قدیم اسلامی دارالحکومت نے آخری سنبھالا لیا تھا، اس لئے ہر علم و فن کے اچھے اچھے لوگ جمع تھے، اور اُن کی (والد) زبانی جو کچھ معلوم ہوا ہے، اُس سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں اپنی تعلیم و تربیت اور نشو نما کے لیے ایسا وسط میسر آیا تھا، جو تھوڑے دنوں بعد ہندستان سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا

اُنھوں نے اپنے نانا اور اُس عہد کے تمام مشہور اساتذہ سے تحصیل علوم کی، اور تکمیل، مفتی صدرالدین سے کی، جو علاوہ اور فنون کے فارسی و عربی کی ادبی فضیلت میں اس پائے کے عالم تھے کہ اُن کے بعد پھر کوئی

ویسا عالم نہ ہوا۔ اُن کے (والد) اساتذہ میں مولوی فضل امام معقولات میں، مولوی محمد کریم لال کنوئیں والے، مولوی محمد عمر معقولات کے عالم، شاہ محمد حلیم بلگرامی، جنہیں ہدایہ مع اُس کی ضروری شروح کے حفظ تھی، مولانا رشید الدین معقولی صاحب رشیدیہ، اور حدیث کی تکمیل وسند، شاہ محمد یعقوب اور دیگر علمار حجاز سے، جن کا ذکر آگے آئے گا۔

ورزشی فنون کی تحصیل

اُس زمانے میں علاوہ تعلیم کے ایک بہت بڑی چیز، مفید مردانہ ورزشیں اور بعض تفریحی فنون تھے، جن کو سوسائٹی میں بہت اہمیت دی جاتی تھی، مثلاً تیر اندازی، پیراکی، کُشتی، پنجہ کشی، خوش نویسی۔ اِن تمام چیزوں کو بھی انہوں نے (والد) اپنے وقت کے بڑے بڑے اُستادوں سے حاصل کیا تھا۔ مثلاً خوش نویسی، حافظ امام بخش سے، جو خطِ نسخ میں امامِ وقت مانے جاتے تھے۔ پنجہ کشی حافظ امیر پنجہ کش سے۔ تیراکی، میر مچھلی سے، جو اُس زمانے میں قلعے کے سب سے بڑے پیراک اور اُستاد تھے، اور تمام شاہزادے اُن سے سیکھتے تھے۔

وہ فرماتے تھے کہ میں ہر منگل کے دن سہ پہر کو جاتا تھا اور رات تک پیراکی کی مشق کرتا تھا۔ اس زمانے میں جمنا سے یہ تمام بالائی نہریں نہ نکلی تھیں اس لیے بڑھاؤ کے وقت قلعے کی دیواروں تک پانی آجاتا تھا۔ ایک معمولی مشق یہ تھی کہ ثمن برج سے شاہزادے اور شوقین کودتے تھے اور شرط یہ

ہوتی تھی کہ سب سے پہلے کنارے پر پہنچ کر وہاں کی کوئی چیز لے کر پھر واپس آجائیں، یا اوپر سے ایک روپیہ پھینکا جاتا اور شرط ہوتی کہ قبل تہہ تک پہنچنے کے اُسے روک لیا جائے۔ وہ اِن تمام ورزشوں میں شریک ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ مرزا ابو بکر ولی عہد نے خاص اہتمام کیا تھا۔ لکھنؤ سے ایک مشہور پیراک آیا تھا، اور بعض عجیب عجیب کرتب دکھاتا تھا۔ اِس جلسے میں خود بادشاہ بھی موجود تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ اُس دن میں نے ایک خاص انعام حاصل کیا تھا، جو چاندی کا ایک گولہ تھا اور دریا کے بہاؤ پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ مشق یہ تھی کہ تیر و کمان لے کر دریا میں کودتے اور پیرتے ہوئے اِس گولے پر چاند ماری کرتے تھے۔ بعض اوقات کمر تک بلند ہو جانا پڑتا تھا اور انعام یہ تھا کہ جو کامیاب ہو، گولہ لے لے۔ وہ فرماتے تھے کہ یہ گولہ میں نے جیت لیا، یحتہ ڈیڑھ سیر چاندی کا تھا، اور چاند ماری کے لیے اُس پر سیاہ نشان تھے۔

اُس زمانے میں اپنے نانا کے شاہی تعلقات کی وجہ سے اُن کی آمد و رفت قلعے میں بہت رہتی تھی، اور قلعے کی زندگی کے جو حالات وہ بیان کرتے تھے، وہ اور کہیں سے نہیں مل سکتے۔ اِن تمام واقعات سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ باوجود حد درجہ تنزل و غفلت کے پھر بھی بے شمار باتیں تمدن اور عمدہ سوسائٹی کی خوبیاں قلعے میں موجود تھیں، جو اب بالکل معدوم ہو گئی ہیں۔

اُنھوں نے تمام فنونِ جنگ، شمشیر زنی، نشانہ اندازی اور لکڑی کے تمام فنون کی بھی مہارت حاصل کی تھی، چنانچہ آخر عمر تک اُن کی زندگی سے مترشح ہوتا تھا کہ اوائل میں وہ بہت ورزشی زندگی بسر کر چکے ہیں۔ بڑھاپے میں

ایک مرتبہ ایک شخص اگر مکان میں ٹھہرا ہوا تھا اور صبح کو وہ مکان سے گزر رہے تھے۔ اُس کی ورزش کی جوڑی پڑی تھی، جو کم از کم دو ڈیڑھ من کی تھی، لیکن انھوں نے اُسے اِس آسانی سے بطورِ تفریح کے ہلانا شروع کیا کہ گھر کے سب لوگ متحیر رہ گئے

ضروری علوم کی تکمیل سے وہ اٹھارہ برس کی عمر میں فارغ ہو چکے تھے۔ اِس کے بعد اُنھوں نے حسبِ قاعدہ درس دینا شروع کیا۔ جس دن اُن کا فاتحۂ فراغ ہوا، اُس جمعہ کو جامع مسجد میں بہت بڑا اجتماع ہوا تھا۔ مفتی صدر الدین نے اُن کے سر پر پگڑی باندھی اور شاہ عبد الغنی خانقاہ والے نے اُنھیں پکڑ کر مسندِ درس پر بٹھایا۔ چنانچہ اُس دن طلبہ کی ایک جماعت نے علما کی موجودگی میں اُن سے ہدایہ اور بخاری کا درس لیا۔ اِس کے بعد باقاعدہ جامع مسجد کے مدرسے میں، جو اُن کا خاندانی قائم کردہ تھا، درس دیتے رہے۔

ڈاکٹری کی تعلیم

طب کی تحصیل بھی کی تھی۔ اُس زمانے میں انگریزی ڈاکٹری نئی نئی آئی تھی اور بجز کلکتے کے اُس کا بہت کم رواج تھا۔ اُن کے علمی شوق کا اِس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانے میں اُنھوں نے قدیم علمِ طب کی کمی محسوس کی اور خیال کیا کہ فنِ تشریح و جرّاحی میں نئی طب افضل ہے، چنانچہ اُنھیں اِس سے واقف ہونے کا شوق ہوا۔ اُس زمانے میں دو چار ہندستانی اور باشندۂ ہند بنگالی ڈاکٹر آگرے میں رہتے تھے، اور یہ معلوم نہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے اُن کا کوئی

تعلق تھا یا نہیں، لیکن اُن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آگرے میں ڈاکٹری کی ایک درس گاہ تھی، چنانچہ یہ آگرے آئے اور تقریباً ایک سال رہے۔ اِس کے بعد کلکتے آئے اور یہاں انگریزی شفاخانوں کا معائنہ کیا اور اِس کے بعد اُن کو آگرے کے مدرسے سے بھی سند مِل گئی۔

مکے میں قیام

جب اُن کے نانا نے ہجرت کا ارادہ کیا، تو یہ بھی اُن کے ساتھ روانہ ہوئے۔ بھوپال میں بھی ساتھ مقیم رہے اور وہاں سے مکہ معظمہ گیے۔ یہاں مولانا محمد یعقوب اس وقت زندہ تھے۔ اُن سے سند حدیث کی تجدید کی، اور اِس طرح شاہ صاحب کا سلسلہ ایک واسطے کی کمی سے حاصل ہو گیا۔

اُس وقت علمائے حرمین شیخ محمد ظاہر وتری اور شیخ محمد مغربی، مدینے میں اور شیخ عبداللہ سراج اور شیخ عبدالرسول مکے میں درس و تدریس میں ممتاز تھے۔ گزشتہ صدی میں ہندستان کے تمام علما، جو حجاز جاکر حدیث کی سند لیتے تھے، اُن کا منتہائے سند، شیخ عبدالرحمن سراج، یعنی شیخ عبداللہ سراج کے بیٹے تک ہوتا تھا۔ حجاز میں شیخ عبداللہ سراج اور شیخ محمد ظاہر وتری کے بعد گویا عالمانہ درس کا خاتمہ ہو گیا۔ شیخ عبداللہ سراج، شیخ محمد طاہر الکردی المدنی کے شاگرد تھے، جو شاہ ولی اللہ کے اُستاد ہیں۔ شیخ محمد اسحاق جب مکے میں مقیم ہوئے اور شیخ عبداللہ کا درس، حرم میں سُنا تو کہا، ہمارے جدِ بزرگوار (شاہ ولی اللہ) پھر دوبارہ حرم میں آ گئے ہیں! اور شیخ عبداللہ کا یہ حال تھا کہ

جب تک شاہ صاحب نہ آجاتے، درس نہ شروع کرتے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے اخذ سند و منادے کا مبادلہ کیا تھا۔

شیخ محمد طاہر وتری، شیخ ابراہیم کردی المدنی کے خاندان سے تھے، اور وہ بھی شاہ صاحب کے اساتذہ میں سے ہیں۔ شیخ ابراہیم کے جو بعض مصنّفات و حواشی ملے ہیں، اُن سے یہ تعجب بالکل رفع ہو گیا کہ شاہ ولی اللہ کا مجتہدانہ ذوق کس سرچشمے سے فیض یاب ہوا ہے۔ شیخ ابراہیم کردی، بارہویں صدی کے اُن چند افراد میں سے ہیں، جنہوں نے مذہبِ سلف کی تائید کی۔ شیخ محمد طاہر اُنہی کے خاندان سے تھے اور مسجد نبوی میں شیخ حرم تسلیم کیے جاتے تھے۔ شاہ عبدالغنی مجددی جب ہجرت کر کے گیے، تو اُنھوں نے بھی تبرکاً اِن کے درس میں شرکت کی تھی۔

والد مرحوم اِنہی دونوں اساتذہ کی خدمت میں رہے اور بالآخر شیخ محمد طاہر اس درجہ شفقت کرنے لگے کہ کچھ عرصے بعد اپنی بھانجی سے اِن کا عقد کردیا۔ اُس زمانے میں اُنھوں نے ہندستان کے پُرآشوب حالات دیکھ کر یہ ارادہ کرلیا کہ ہمیشہ کے لیئے یہاں سے قطع تعلق کرلیں، چنانچہ مکہ معظمہ میں زمین لے کر اپنا ذاتی مکان بنانا چاہا۔ چونکہ دولت عثمانیہ میں کوئی شخص، جائداد غیر منقولہ پیدا نہیں کرسکتا تھا جب تک عثمانی رعایا نہ ہوجائے، اِس لیئے شیخ عبداللہ نے مشورہ دیا کہ عثمانی رعایا ہو جائیں، چنانچہ ایسا ہی کیا اور اس کے بعد ایک زمین، جو شیخ عبداللہ ہی کی ملکیت تھی لیکر محلہ قدوہ میں، جو بابُ السّلام پر واقع ہے، مکان تعمیر کیا اور مقیم ہو گیے۔

حرم میں درس وعظ

قیامِ حجاز کے تقریباً دس برس بعد اُنھوں نے شادی کی۔ مکہ میں کچھ عرصہ وہ اِن اساتذہ سے مزید تکمیل واخذِ فیض میں مشغول رہے۔ پھر حرم میں خود اپنی مجلسِ درس قائم کی۔ وہاں کا قاعدہ ہے کہ بِلا شیخ حرم کی منظوری اور علما کے اعتماد و توثیق کے کوئی شخص حرم میں بالالتزام درس نہیں دے سکتا، کیونکہ وہاں درس دینا ایک سندِ کمال سمجھا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی اس کا اہل ہوتا، تو شیخِ حرم، علما اور مفتیٔ مکہ اور قاضی عثمانی کی موجودگی میں اُس کا آخری امتحان لیتا تھا اور بعد کو اجازت مِل جاتی تھی اور افتتاحِ درس پر بھی علما کا احتفال ہوتا اور یہ سرکاری توثیق ہو جاتی تھی۔ اُن کے لیے یہ مشکلات مانع نہ ہوئیں، اِس لیے کہ شیخ حرم، خود شیخ عبداللہ سراج تھے، اور اُن کے ناناہی کی زندگی میں شریف اور تمام اعیانِ حجاز سے ان کی رسم و راہ پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ جس دِن اُن کا درس شروع ہوا، اتفاقاً رمضان کا مہینہ تھا اور جمعہ کا دِن تھا۔ جمعہ کے دن حرم میں درس نہیں دیا جاتا، لیکن تبرکاً اس دن عصر کے بعد ایک بڑا شاندار مجمع ہوا۔ وہ فرماتے تھے کہ اِس مجمع کے اثنا میں مجھ پر ایسی کیفیتیں طاری ہوئیں، جو میری زندگی کا ایک بڑا ہی اہم واقعہ ہے۔ مجمع میں شریف اور تمام علمائے حرم موجود تھے۔ تبرکاً بخاری کی حدیثِ نیت مع اسناد پڑھی اور اِس کے بعد بعض تلامذہ نے پہلی مرتبہ حرم میں اُن سے سند لی۔

اِس کے بعد اُنھوں نے حرم میں وعظ کا سلسلہ بھی شروع کردیا جس کا موقعہ پہلے کسی ہندستانی عالِم کو نہ ملا تھا۔ حرم میں وعظ کے لیے نہایت سخت قواعد تھے، اور بجز شیوخ دائمہ کے اور کوئی وعظ نہ دے سکتا تھا۔

ابتدا میں اپنی معیشت کے لیے یہ انتظام کیا تھا کہ بطور مضاربہ کے ایک دکان کتابوں کی اور ہندستانی کپڑے کی بمبئی کے دو میمنوں کو مکہ معظمہ میں کرادی تھی، اور اِس سے بہت کافی آمدنی ہو جاتی تھی۔ اِس کے بعد ہی حجاز میں اُن کے سلسلۂ طریقت کا بھی آغاز ہوگیا اور برابر لوگ بیعت کرتے رہے۔

قسطنطنیہ میں

اس دوران میں ممالک اسلامیہ کی سیاحت کا شوق ہوا۔ حُسنِ اتفاق سے یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب شیخ احمد دحلان، جنہوں نے تاریخ اسلام "تاریخ دول الاسلام" کے نام سے لکھی تھی اور اسے سلطان عبدالمجید کی نذر کرنا چاہتے تھے، قسطنطنیہ کے سفر کیلئے آمادہ ہوئے۔ شیخ احمد اگرچہ سن میں اِن سے بہت بڑے تھے، لیکن شیخ محمد ظاہر کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے دونوں گویا معاصر تھے، اور مکہ کے قیام کے بعد ہی کچھ ایسے واقعات پیش آئے تھے۔ کہ دونوں میں حد سے زیادہ برادرانہ تعلقات ہو گیے تھے، جو اُن کے دوبارہ سفر ہند کے بعد تک قائم رہے۔ اور جیسا کہ اُن کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے، جو ہندستان آیا کرتے تھے۔

غرضکہ شیخ احمد کی وجہ سے انھیں بھی قسطنطنیہ جانے کی تحریک ہوئی

اور مع متعلقین کے روانہ ہو گیے۔ اُس وقت سلطان عبد المجید کا وسطی زمانہ تھا۔ قسطنطنیہ میں اِن کا دو سال تک قیام رہا۔ سبب اس قیام کا یہ ہوا کہ جب سلطان کے حضور میں باریاب ہوئے اور اِن کے حالات گوش گزار ہوئے، تو اُنھوں نے سرکاری وظیفہ مقرر کر دیا اور خواہش کی کہ قسطنطنیہ میں قیام اختیار کریں۔ سلطنت عثمانیہ کے دستور کے مطابق صرف اِنہی کا وظیفہ مقرر نہ ہوا بلکہ نام بنام تمام اعزا و اقربا کا، حتّٰی کہ میری بڑی ہمشیر کا بھی، جو اس وقت پیدا ہو چکی تھیں اور دو تین برس کی تھیں۔

اِنھوں نے یہ تمام زمانہ کتب خانوں کی سیر، کتابوں کی نقل، اور علما کی صحبت میں صرف کیا۔ کہتے تھے کہ اُس وقت قسطنطنیہ میں شیخ الاسلام کے منصب پر شیخ موسیٰ عبد الحق تھے۔ یہ اُن کی قابلیت، علی الخصوص حُسنِ تقریر کے بہت مدّاح تھے۔ اِن کی بیاض میں شیخ موسیٰ کے ایک خط کی نقل موجود ہے، جو اُنھوں نے کسی تحفے کی رسید میں لکھا تھا، جو اِنھوں نے بغداد سے انھیں بھیجا تھا۔

حجاز کی بغاوت

طوالت قیام کا ایک سبب، حجاز کی بغاوت بھی ہے۔ سلطان محمود ثانی مُصلح پہلا ایشیائی فرمانروا ہے، جس نے جدید علوم و فنون اور ترقیات کی اہمیت محسوس کی اور اپنی قلمرو میں اُسے رواج دیا۔ اُسی نے دار الخلافہ میں مطبع قائم کیا۔ کتب مفیدہ کی طباعت شروع کرائی، قوانین جنگ مرتب

کرائے، دارالمشیخت کے لیے ضابطہ بنانے کی بنیاد ڈالی، اور وائنا کے عہد نامہ کے بعد غلامی کو قانونًا ناجائز قرار دیا۔ پہلے عثمانی سلاطین کی محل سراؤں میں دستور تھا کہ محل کے اندر عورتوں کی آبادی ہوتی تھی۔ سلطان کی ماں، سلطانہ اُس کی صدر ہوتی تھی اور دوسری عورتیں مختلف عہدوں پر مقرر کی جاتی تھیں۔ ہر سال پندرہ سو کنیزیں خرید کے محل سرا میں داخل کی جاتی تھیں، اور اس طرح ایک بہت بڑی آبادی اندر ہو جاتی تھی کہ جن میں سے بعض سُلطان کے زیرِ تصرف رہتی تھیں۔ سلطان محمود نے اِس رسم کو بند کر دیا اور تمام کنیزوں کو جمع کر کے اعلان کر دیا کہ اُن میں سے جس کا جی چاہے رہے اور جو چاہے چلی جائے، سب آزاد ہیں، لیکن سب نے رہنا منظور کیا۔ صرف ایک البانین کنیز نے، جو اپنے ملک کے شاہی خاندان سے تھی، جانا چاہا اور وہ بھیج دی گئی۔ اس کا اسلامی نام، طاہرہ تھا۔

اُس زمانے میں قسطنطنیہ، سمرنا، قونیہ، بروصہ اور مکہ معظمہ میں غلاموں کی بہت بڑی منڈیاں تھیں، جن میں چرکسی، البانی، سوڈانی، بربری، حبشی کنیزیں اور غلام فروخت ہوا کرتے تھے۔ سُلطان نے اِن سب منڈیوں کے بند کرنے کا حکم دیا۔

اُس کی اِن اصلاحات سے علمائے جامدین اور اُن کے ہم خیال لوگوں میں سخت برہمی پیدا ہوئی اور متعدد مقامات میں شورشیں پھوٹ پڑیں، مگر سب کو دبا دیا گیا اور سب جگہ غلامی مسدود ہو گئی۔ صرف مکہ معظمہ میں وہ بند نہ کی جا سکی، کیونکہ اس زمانے میں شریف عبدالمطلب وہاں کا شریف

تھا، جو نہایت مستبد، اولوالعزم، اور بدوی قبائل پر بہت بڑا اثر رکھتا تھا۔ وہ بھی ابطال غلامی کا سخت مخالف تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ قانوناً غلامی ممنوع ہو گئی تھی، مگر مکہ میں علانیہ باقی تھی، اور ترکی گورنر اُس کا انسداد نہ کر سکتا تھا۔

سلطان محمود کے انتقال کے بعد سلطان عبد المجید تخت نشین ہوا۔ وہ بھی اپنے پیشرو کی طرح روشن خیال اور حامی اصلاح تھا۔ اُس نے اپنا مشہور فرمان، خط ہمایونی کے نام سے شائع کیا اور از سرِ نو تمام مذاہب و اقوام کی آزادی و مساوات اور انفرادی آزادی کے مبادیات کے اعتراف، گورنمنٹ کی قانوناً مسئولیت، اور استرقاق کے عدم جواز کا اعلان کیا۔

سلطان عبد المجید نے عزم کر لیا کہ مکہ سے بھی غلامی کا ازالہ کر دیا جائے، چنانچہ حامد پاشا کو گورنر بنا کے بھیجا۔ شریف عبد المطلب، جس میں محمد علی خدیو مصر کی نظیر سے خود مختاری کے ولولے پیدا ہو رہے تھے، اور وہابیوں کے استیصال کے موقعہ پر اُس کی ابراہیم پاشا سے ملاقات ہوئی تھی، اور اُس نے کہا تھا کہ حجاز ایک زمانے میں مصر ہی کے ماتحت تھا، اور خیال کیا جاتا ہے کہ دونوں میں کوئی خفیہ معاہدہ بھی ہو گیا تھا۔ اِس کے بعد ہی شریف عبد المطلب، قسطنطنیہ سے شریف بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اور اب اپنے منصوبوں کو پورا کرنا چاہتا تھا اور اصلاحات کی وجہ سے قدیم خیالات رکھنے والے عناصر میں جو برہمی پیدا ہو گئی تھی، اور قصداً پیدا کرائی گئی تھی، اُس سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

حامد پاشا نے مکہ پہنچتے ہی شریف کو سلطانی فرمان کی اطلاع دی۔ شریف نے اُس وقت کوئی مخالفت نہ کی، مگر اندر اندر تمام انتظامات کر لیے چند دِن بعد جب گورنر نے حرم میں تمام اُمرا داعیان کو جمع کر کے خط ہمایونی سُنایا، اور اس کی سلامی میں ایک سو ایک توپیں داغی گئیں، تو اچانک معلوم ہوا کہ تمام مکہ و طائف میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی ہے، جو گویا اِن توپوں کی صداؤں کی منتظر تھی۔

شریف مکّہ کی گرفتاری

شریف نے بغاوت میں اعلان کر دیا کہ سلطان، نصرانی ہو گیا ہے اور اسلام کو مٹانا چاہتا ہے۔ ساتھ ہی بے شمار بدوؤں کی مسلح جماعتیں اس کے محل میں فراہم ہو گئیں۔ حامد پاشا نے کچھ دنوں مقاومت کی اور جنگ ہوئی لیکن چونکہ فوج قلیل تھی، اِس لیے مجبوراً جدہ کی راہ سے نکل جانا پڑا۔ اس کے بعد دوسری ترکی فوج آئی اور مکہ پر قابض ہو گئی۔ یہ بغاوت ایک سال تک رہی اور اِس کے حالات بہت تفصیل طلب ہیں۔

اگرچہ بغاوت ختم ہو گئی، لیکن شریف کے عزل کا معاملہ اب تک پیچیدہ تھا، کیونکہ وہ اِس درجہ بااثر تھا کہ باوجود مغلوب کیے جانے کے اُسے علیحدہ کرنا دشوار نظر آتا تھا۔ خود شریف نے شکست کے بعد یہ طرزِ عمل اختیار کیا کہ اپنے کو بغاوت سے بالکل بری ظاہر کیا اور خلیفہ کا بدستور وفادار مشہور کیا اور بغاوت کی یہ تاویل کی کہ چونکہ قبائل میں شورش ہو گئی تھی، اگر میں

خاموش رہتا تو قتل کر دیا جاتا، لیکن گورنمنٹ اصلی حقیقت سے باخبر تھی اور جانتی تھی کہ اِس شریف کی موجودگی میں حجاز ہمیشہ خطرے میں رہے گا، چنانچہ اُس کی گرفتاری کے لیے اُس نے یہ ترکیب کی کہ عثمان پاشا کو ایک بالکل نئے ساخت کے جنگی جہاز پر روانہ کیا۔ جواب تک نادر تھے۔ عثمان پاشا، مکہ پہنچے اور شریف سے از حد ربط بڑھایا۔ ایک دن اُسے اِس جہاز کے دیکھنے کی دعوت دی، شریف جدہ آیا اور جہاز پر گیا۔ شام کو جب وہ واپس ہونے لگا، تو اسے معلوم ہوا کہ وہ قید ہے، اور جہاز، ساحل سے ہٹ رہا ہے! اِس طرح وہ قسطنطنیہ پہنچایا گیا اور وہاں نظربند کر دیا گیا۔

سلطان اور شریف میں صفائی کی کوشش

شریف عبدالمطلب کے بعد اُس کا بھتیجا، شریف غالب مقرر ہوا۔ تھوڑی مدت کے بعد حکومت کو اِس کے طرزِ عمل کے متعلق بھی شبہات پیدا ہوئے اور اُسے خبریں پہنچیں کہ وہ شریف عبدالمطلب سے نام و پیام رکھتا ہے۔

والد مرحوم اور شریف غالب کے مابین بہت گہرے تعلقات تھے اور وہ اِن پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ جب یہ قسطنطنیہ جانے لگے، تو شریف نے خسرو پاشا کے نام، جو اُس وقت وزیر تشریفات (لارڈ چیمبر) تھے اور شریف کے خاص طور پر دوست تھے، خط دیا اور اُس میں لکھا کہ اِس خط کے ذریعہ سے مولانا کو سلطان کے حضور باریابی کا موقعہ دیا جائے۔ چنانچہ اِس طرح وہ باریاب ہو گئے۔

سلطان کو جب شریف کے ساتھ اُن کے دوستانہ تعلقات کا حال معلوم ہوا، ساتھ ہی کچھ عرصہ بعد انھیں قابلِ اعتماد پایا، تو اُن سے اُن شکوک میں مدد لینی چاہی، جو شریف غالب اور شریف عبدالمطلب کے متعلق تھے۔ اُنھوں نے گورنمنٹ کو یقین دلایا کہ یہ تمام شکوک محض بے بنیاد ہیں اور محض فتنہ پردازوں کے گھڑے ہوئے ہیں، مگر اُن سے مزید شہادتیں بہم پہنچانے کی خواہش کی گئی، چنانچہ یہ اپنے اہل وعیال کو دارالخلافہ ہی میں چھوڑ کر تنہا مکہ آئے اور شریف سے ملاقات کر کے اُسے سمجھایا کہ گورنمنٹ کو تمہاری ذرہ ذرہ خبر پہنچتی ہے، جس سے گورنمنٹ کو سخت سوءِ ظن پیدا ہو گیا ہے، اور وہ مجبوراً خاندانِ شرافت کو مٹا دینے پر آمادہ ہو گئی ہے، اِس لیے فوراً تدارکِ مافات کرنا اور تمام ظنون و شبہات کو دور کر دینا چاہیے۔

اِدھر سے اطمینان کر کے وہ پھر دارالخلافہ واپس گئے اور شریف عبدالمطلب سے بھی متعدد ملاقاتیں کیں، جس کے بعد حکومت کے تمام شکوک رفع ہو گیے۔ شریف عبدالمطلب کی نظربندی موقوف ہوئی اور بیش قرار وظیفہ اُسے ملنے لگا۔ نیز خاندانِ شرافت محض ان کی سعی سے تباہ ہونے سے بچ گیا۔

وہ فرماتے تھے کہ گورنمنٹ کے شکوک محض بے بنیاد نہ تھے، اور واقعی شریف غالب، حجاز کی خودمختاری کی کھچڑی پکا رہا تھا۔ اگرچہ یہ اِس راز سے واقف تھے، مگر انھوں نے پسند نہ کیا کہ اصلاحِ ذات البین کے بجائے فریقین میں سے کسی کا نقصان ہونے دیں۔ اُن کی رائے تھی کہ حجاز کے لیے جس طرح ترکی حکومت کا وجود ضروری ہے، اُسی طرح خاندان شرافت کی ولایت بھی، اور

اسی لیئے انھوں نے معاملے کو سلجھانے کی پوری کوشش کی اور باوجود شریف کے خودغرض مصاحبوں کی مخالفت کے وہ کامیاب ہو گیے

قسطنطنیہ میں علمی مشاغل

زمانۂ قیام قسطنطنیہ ہی میں اُنھوں نے بعض تصانیف شروع کیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بعض علما میں اس مسئلے میں مباحثے شروع ہو گیے تھے کہ آنحضرت کے آبا، و اجداد مُوحّد تھے یا عرب جاہلیت کے دین پر تھے ؛ فقہ اکبر جو امام ابو حنیفہ کی طرف منسوب ہے، اُسے اور اُس کی شرح ملّا علی قاری کو کسی فریق نے پیش کیا۔ اس میں ہے کہ مُوحّد نہ تھے۔ اِس پر شیخ الاسلام کی صحبت میں ایک مرتبہ مذاکرہ ہوا۔ وہ دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اِس موقعہ پر میں نے جو تقریر کی تھی، اُسے شیخ الاسلام نے بہت پسند کیا اور خواہش کی کہ اسے قلم بند کر دوں۔ اِس سے اِس کتاب کے لکھنے کی تحریک ہوئی۔ چنانچہ یہ کتاب لکھی اور اِس میں ضمناً ابو طالب کے اسلام پر زور دیا۔

یہیں قسطنطنیہ میں جب اُنھوں نے ترکی زبان پڑھنا شروع کی، تو پہلے اپنی یادداشت کیلیے پھر بطور تعلیمی کتاب کے ترکی کی صرف و نحو عربی میں لکھی۔ کسی ترکی عالم کی فرمائش سے ایک لُغت بھی لکھنا شروع کی تھی، جس میں عربی، فارسی، اور ترکی تینوں زبانوں کے الفاظ بالمقابل درج کیے تھے۔ یہ حرف قاف تک پہنچی تھی۔

قسطنطنیہ سے چل کر وہ ایشائے کوچک کی سیر میں مشغول ہوئے اور

ایک سال تک قونیہ میں قیام کیا۔ پھر شام وغیرہ کی سیر کی اور اس کے بعد مصر آئے۔ یہاں بھی ایک سال تک قیام کیا، جس کی وجہ تمام متعلقین کی علالت تھی جو برابر ایک سال تک رہی۔

سفر عراق

مصر سے چل کر پھر مکہ آگئے اور عرصے تک رہے۔ اسی درمیان میں کچھ عرصے کے لیے بمبئی آئے۔ پھر عراق کا سفر کیا اور وہاں چھ سات ماہ ٹھہرے اس زمانے میں شیخ عبدالرحمان، نقیب الاشراف تھے۔ ان کے یہاں مہمان ہوئے۔ ان سے طریقۂ قادریہ کی اجازت لی اور انھوں نے ان سے طریقہ نقشبندیہ کی۔

اُن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عبدالرحمان بہت صاحب علم و فضل تھے اور علامہ آلوسی زادہ کے شاگرد تھے، جن کی تفسیر "روح المعانی" ہے اور جنھوں نے ان کے سفر سے دو تین سال پہلے انتقال کیا۔

اُس وقت بلاد عراق میں علماء و فضلا کا اچھا مجمع تھا، جن سے ان کی صحبت رہتی تھی۔ منجملہ اُن کے شیخ محمود شکر اللہ آلوسی زادہ ابن علامہ آلوسی زادہ بھی تھے، جو بعد میں علامہ عراق کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہیں عراق میں انھوں نے تفسیر روح المعانی پر ایک مستدرک لکھی تھی، جس کی صورت یوں ہوئی کہ چونکہ نقیب اور علماء عراق عموماً علامہ آلوسی زادہ کے شاگرد تھے، اور اُن کی تصانیف و خیالات کا بہت چرچا رکھتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ

آلوسی زادہ ایک حد تک طریقِ سلف سے آشنا تھے اور اگرچہ جس وسط میں تھے، اُس کے خلاف علانیہ قدم اُٹھانے کی جرأت نہ کی، تاہم در پردہ ابنائے عصر کے مقلدانہ مشرب سے الگ مشرب رکھتے تھے، جس کی جھلک تفسیر روح المعانی اور سفر نامۂ قسطنطنیہ کے صفحات پر نظر آتی ہے۔ اُن کے لڑکے، علامہ محمود کا مسلک آشکارا تھا، جو اُنھوں نے اپنی تصانیف، خصوصاً جلاء العینین میں، ظاہر کیا، اور جو اُن کے مکاتیب بنام صدیق حسن خاں سے بھی واضح ہوتا ہے۔

چنانچہ اُن لوگوں نے والد مرحوم کو تفسیر روح المعانی، جو اُس وقت قلمی تھی دکھائی۔ جس کے مطالعے کے بعد انھوں نے صاف کہہ دیا کہ اِس سے اعتزال کی بو آتی ہے۔ چونکہ یہ لوگ علامہ موصوف کے شاگرد تھے، اس لیے اُن پر یہ بات بہت گراں گزری، مگر انھوں نے ثبوت میں مثلاً صاحبِ موسیٰ کا واقعہ نکالا اور دکھایا کہ علامہ نے خضر کے وجود سے انکار کیا ہے اور جو دلائل قائم کیے ہیں، وہ تمام تر معتزلہ کے دلائل سے ماخوذ ہیں۔ اِس کا بہت چرچا ہوا۔ اس پر انھوں نے تفسیر سے ایسے گیارہ مسئلے منتخب کیے جن میں علامہ نے یا تو فقہائے مقلدین کے مسلک سے اختلاف کیا ہے یا متکلمین اشاعرہ سے، اور انھی مسئلوں پر استدراک لکھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ نقیب اور دیگر علما اُن کے استدراک سے متفق ہو گئے تھے۔ چنانچہ اُس کی نقلیں کرا کے اُنھوں نے اُن تمام لوگوں کے پاس ایک ایک نسخہ بھیج دیا، جن کے یہاں "روح المعانی" گئی تھی، اور اِس پر نقیب

نے علامہ ذہبی کے اِس قول کی طرح جو اُنھوں نے مستدرکِ حاکم پر لکھا ہے، لکھ دیا "کسی کے لیے تفسیر روح المعانی کا دیکھنا جائز نہیں، جب تک اس استدراک کو بھی نہ دیکھے"، اور بہت سے علمانے اُس پر تقریظیں لکھیں۔ بہت عرصے کے بعد علامہ آلوسی کے صاحبزادے کی کوشش سے تفسیر روح المعانی مصر کے مطبع میری میں چھپ گئی، لیکن اُس کے مطبوعہ نسخے میں وہ استدراک موجود نہیں ہے، البتہ خضر کے متعلق والد مرحوم کا مقالہ اُس کے آخر میں ملحق کر دیا ہے، اور نام کی تصریح کر دی ہے۔ نیز یہ مستدرک، والد مرحوم کے مسودات میں بھی نہیں ملی، مگر وہ خود فرماتے تھے کہ گیارہ مسئلوں پر لکھی ہے۔

یہیں عراق میں ایک یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ کسی مقدمے میں قاضی بغداد نے جو فیصلہ کیا تھا، اُس سے یہ متفق نہ ہوئے اور اُس کے برخلاف اعتراضات شروع کیے۔ آخر اعظمیہ میں مناظرہ قرار پایا، جس میں ابنِ عابدین صاحب رَدُّ المختار کے نواسے بھی جو اُس وقت بغداد کے مفتی تھے، شریک تھے۔ اس مناظرے میں وہ کامیاب ہوئے۔

بغداد سے پھر بمبئی آئے اور بعد چندے پھر مکہ معظمہ واپس گیے۔

سفر قسطنطنیہ سے پہلے مکہ معظمہ میں ایک نہایت اہم واقعہ پیش آیا، جسے افسوس ہے، کسی نے بھی قلم بند نہیں کیا ہے، حالانکہ وہ نہایت عبرت انگیز اور تاریخی ہے اور اُسی قسم کا ہے، جو والد مرحوم کے نانا، مولانا منوّر الدین اور مولانا اسماعیل شہید کے مابین پیش آیا تھا، بلکہ اُس سے

زیادہ سخت۔

مکّے میں علمائے اہل حدیث پر قیامت

تفصیل یہ ہے کہ اُس زمانے میں ہندستان میں وہابیوں کی جانب سے گورنمنٹ ہند نہایت برافروختہ تھی اور اُن کی جماعت کو سخت خطرناک پولیٹیکل جماعت سمجھتی تھی۔ اِس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ جماعت مولانا اسماعیل کی جماعت سمجھی جاتی تھی، جنہوں نے اپنی تحریک کی بنیاد مسئلہ جہاد پر رکھی تھی اور سکھوں سے عملاً جہاد کیا تھا۔ مولانا اسماعیل کے بعد سید صاحب کی جو جماعت سرحد پر رہ گئی تھی، وہ مولانا صادق پوری کی امارت میں از سرِ نو قائم ہوئی اور اُس سے اور انگریزوں سے دو تین مرتبہ مڈبھیڑ ہوئی تھی، اور گورنمنٹ کو خیال ہو گیا تھا کہ اب یہ جماعت، انگریزوں سے جنگ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ غدر میں سپاہیوں نے جو فتوے مرتب کیے تھے، اُن پر بعض وہابی علما کی بھی مہریں تھیں۔ ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ یہ جماعت، ملک میں نہایت قلیل تھی اور سوادِ اعظم سے سخت مذہبی مخالفت برپا تھی۔ مخالفین اُسے نقصان پہنچانے کے لیے ہر طرح کی کوششیں کرتے تھے۔ ایک بڑی کوشش یہ بھی تھی کہ گورنمنٹ کو یقین دلاتے تھے کہ یہ جماعت اُس کے برخلاف ہے اور جہاد کرنا چاہتی ہے، جس کے باور کرنے میں گورنمنٹ کو زیادہ پس و پیش نہ ہوا، کیونکہ جو مشہور خاندان وہابیوں کے بنگال اور پٹنے کے گرفتار ہوئے تھے، اُن کے یہاں ایک

بہت بڑی تعداد ایسی تحریرات کی برآمد ہوئی، جن میں انگریزوں کے برخلاف دعوت دی گئی تھی۔ اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ جماعت عام طور پر اس کا اعلان بھی کر چکی تھی اور اس موضوع پر بعض کتابیں بھی لکھی گئی تھیں۔

اِن اسباب سے اُس زمانے میں گورنمنٹ کو جس کسی پر وہابی ہونے کا شبہہ ہو جاتا، فوراً گرفتار کرتی، مقدمہ چلاتی، پھانسی ورنہ کم از کم کالے پانی یا حبسِ دوام کی سزا دیتی، چنانچہ اِس جماعت کے سیکڑوں علما امرا، تاجر کالے پانی بھیجے جا چکے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جن پر مقدمے چلائے جاتے تھے، اُن کے تمام اہل و عیال بھی تباہ ہو جاتے تھے کیونکہ یا تو وہ بھی گرفتار ہوتے تھے، ورنہ جائداد کی ضبطی کی وجہ سے خود بخود تباہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ مشہور مقدمۂ وہابیان بنگالہ اور خاندان صادق پور کے نتائج یہی ہوئے، جو بہت مُتموّل تھا۔ اسی طرح کلکتے کے مشہور تاجران چرم، امیر خاں اور حشمت خاں کے خاندان بھی برباد ہوئے۔

اِن اسباب کی وجہ سے اس جماعت کے علمانے بجز اِس کے اور کوئی چارہ نہ دیکھا کہ ہجرت کر جائیں۔ بہت سے لوگ تو غدر کے موقعہ ہی پر چلے گیے تھے اور جو اِس دار و گیر سے کسی طرح بچے، اُنھوں نے بھی حجاز کو دارالامن سمجھ کر ہجرت کی، چنانچہ غدر کے بعد علمائے وہابیہ کی ایک بڑی جماعت مکہ معظمہ میں فراہم ہو گئی تھی۔

لیکن یہاں بھی اُس کے برخلاف متعدد اسباب موجود تھے۔ سب

سے پہلے یہ کہ محمد بن عبد الوہاب نجدی اور ان کی جماعت سے علمائے حجاز و عوام کو سخت تعصب و عناد تھا۔ پھر سلطنت عثمانیہ نے پولٹیکل اغراض و مصالح سے وہابیوں کو بہت بدنام کیا تھا اور وہابی ہونے کو عملاً ایک بہت بڑا جرم قرار دے رکھا تھا۔ اِن اسباب سے اَلبلدُ الامین (مکہ) میں بھی وہابیوں کی جماعت کے لیے امن نہ تھا، اور وہ ایک باغیانہ جماعت سمجھی جاتی تھی۔

ابتدا میں علمائے حجاز اور گورنمنٹ کو اِس تحریک کی خبر نہ تھی، جو ہندستان میں شروع ہوئی تھی، بلکہ جب مولانا محمد اسماعیل نے مولانا سید احمد صاحب کے ساتھ حج کا سفر کیا، تو یہ وہاں بہت اچھا اثر چھوڑ آئے تھے، اِس لیئے وہابیہ ہند کی جماعت سے کسی کو کوئی سوءِ ظن نہ تھا۔

مولانا آزاد کی حق گوئی

لیکن ہندستانی علمائے مقیمین مکہ نے یہ فتنہ اٹھایا اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اِس میں سب سے بڑا حصّہ والد مرحوم کا تھا۔ اُن کے تعلقات، شریف اور قسطنطنیہ، دونوں سے گہرے تھے۔ اُنھی نے علمائے حجاز اور شریف کو مطلع کیا کہ یہ جماعت باعتبار عقائد، محمد بن عبد الوہاب کی جماعت ہے اور ہندستان سے خاص اِس لیے آئی ہے کہ یہاں اپنی تحریک پھیلائے۔ ثبوت میں تقویۃ الایمان اور بعض دوسری کتابوں کے حسب حال مطالب، عربی میں ترجمہ کر کے شایع کر دیے۔

اِس زمانے میں ہندستانی علمائے وہابیہ کی جو جماعت وہاں تھی، اُس میں مولوی محمد انصاری سہارنپوری، مفتی محمد مراد بنگالی، شیخ عبداللطیف قاضی محمد سلیمان جوناگڑھی بھی تھے۔ یہ وہ لوگ تھے، جو ہندستان میں اپنا مسلک اور تصانیف شایع کر چکے تھے، اور حکام کو مخالف پاکر ہجرت پر مجبور ہوئے تھے۔

والدمرحوم نے شریف کو اِن لوگوں کے برخلاف سخت برانگیختہ کر دیا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا کہ قاضی محمد مراد، طائف گیے۔ جب واپس آئے، تو شیخ عبداللہ مرداد، امام حنفی ان سے ملنے گیے اور دستور کے مطابق سلام کے بعد "زیارت مقبول"ع کہا۔ جس سے مراد حضرت ابنِ عباس کی قبر کی زیارت تھی۔ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ میں کسی قبر کی زیارت کے لیے نہیں گیا تھا، بلکہ محض تفریح کے لیے گیا تھا۔ اِس بات کا بہت چرچا ہوا۔ اور شریف تک پہنچائی گئی، اور اِس کے معنی یہ ٹھہرائے گیے کہ یہ لوگ بھی محمد بن عبدالوہاب کی طرح قبورِ صالحین کی زیارت کے مخالف ہیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ چند دنوں کے بعد اچانک اِس جماعت کے اکتیس آدمی گرفتار کر لیے گیے، جن میں مولانا رحمت اللہ، صاحب "اظہار الحق" بھی تھے، لیکن یہ بعد کو رہا کر دیے گیے، کیونکہ اِنھوں نے اپنی حنفیت کے بہت واضح دلائل پیش کر دیے تھے۔ شریف نے ایک مجلس مقرر کی اور والدمرحوم سے کہا کہ ان

ع یعنی زیارت قبور مبارک ہو!

لوگوں کے عقائد کی تحقیقات کریں۔ اُن پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ بھی محمد بن عبد الوہاب کی جماعت سے ہیں۔ اُنھوں نے اِس سے انکار کیا۔ اِس پر والد مرحوم نے سترہ سوال مرتب کر کے پیش کیے، جن میں وجوب تقلید شخصی، استحبابِ قیام، زیارت قبور کے لیے سفر، اور استمداد و توصل بالصالحین وغیرہ سوالات تھے۔

افسوس ہے اِس موقعہ پر بجز تین شخصوں کے اور سب نے تقیہ کیا اور کسی نے بھی استقامت نہ دکھائی۔ مولوی محمد انصاری، مولوی محمد لطیف اور قاضی محمد مُراد نے بڑی جرأت و دلیری کے ساتھ اپنے صحیح عقائد پیش کر دیے اور کہا، اگر قرآن و سنت پر عمل کرنا اور بدعت سے اجتناب کرنا، جرم ہے تو ہم مُجرم ہیں اور ہر طرح کی سزا برداشت کرنے کو تیار!

پھر اُن سے کہا گیا کہ اپنے عقائد سے توبہ کریں ورنہ سخت تعزیر کی جائے گی، لیکن یہ اِس پر رضامند نہ ہوئے۔ اِس پر شریف نے اِن تینوں میں سے ہر ایک کو اُنتالیس اُنتالیس کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ اُنتالیس اِس لیے کہ حنفیہ کے نزدیک حد کی تعداد، چالیس کوڑے ہیں، اور تعزیر کو اِس تعداد سے کم ہونا چاہیئے۔

عبرت

اِس موقعہ پر نہایت عبرت انگیز بات یہ ہے کہ جب اسلامی حکومت اور جوار بیت اللہ میں ایک مسلمان جماعتِ علما پر یہ ظلم و ستم ہو رہا تھا، تو اُس

وقت اگر اُن کو کوئی پناہ مل سکی، تو اُنہی کفار کے دامن میں، جن سے بھاگ کر یہ یہاں آئے تھے! اِن میں سے بعض کے احباب اِن کی گرفتاری کے بعد ہی جدّہ آ گئے تھے اور برٹش قونصل کو خبر دی تھی کہ برٹش رعایا پر یہ عذاب نازل ہو رہا ہے. برٹش قونصل نے اِس معاملے کو قابل مداخلت خیال کیا اور گورنر مکہ کو مراسلت بھیجی کہ برٹش رعایا کی گرفتاری بجز فوجداری جرائم کے اور کسی وجہ سے نہیں ہو سکتی، اور اگر انہیں چوبیس گھنٹے کے اندر نہ چھوڑ دیا گیا، تو برٹش گورنمنٹ اس معاملے کو باب عالی کے روبرو پیش کرے گی. تب گورنر نے شریف پر زور ڈالا اور تعزیر کی کارروائی وقوع میں آنے سے پہلے ہی یہ لوگ مجبوراً چھوڑ دیے گئے، لیکن انھیں یہ سزا دی گئی کہ سب کے سب اکتیس آدمی، خارج البلد کر دیے گئے اور حجاز کی پولیس نے اُنھیں جدّے میں لا کر برٹش قونصل کے حوالے کر دیا.

جدّے سے یہ لوگ جہاز میں بٹھا کے بمبئی بھیجے گئے، لیکن ہندستان پہنچتے ہی اِن پر بلا آئی. اِن کے مخالفین نے یہ کارروائی کی کہ ہندستان کے تمام نقاط کو یہ اطلاع بھیج دی کہ یہ لوگ مخذول و مردود کر کے حرم سے خارج کر دیے گئے ہیں، اور اس لیے سخت مکروہ ہیں اور آیندہ سے کوئی وہابی حرم میں نہ گھسنے پائے گا.

گورنمنٹ ہند نے بھی اُن کے ساتھ سخت کارروائی کرنی چاہی، اور تو سب کسی نہ کسی طرح بچ گئے. قاضی سلیمان کو جب بمبئی میں معلوم ہو گیا کہ وہ گرفتار کیے جانے والے ہیں، تو اپنے بعض دوستوں

کی مدد سے بغداد چلے گیے، مگر قاضی محمد مراد کسی طرح بھی نہ بچ سکے اور کلکتہ پہنچتے ہی گرفتار ہو گیے۔ وہابیت کا مقدمہ قائم ہوا۔ دوران مقدمہ میں جیل کے اندر اُنھیں ایسی سخت تکالیف برداشت کرنا پڑیں کہ اُن کے صدمے ہی سے انتقال کر گیے۔

اِس واقعہ کے بعد حجاز میں وہابیت کے متعلق از سرِ نو سرگرمی پیدا ہو گئی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ہندستانی علما ہر وقت خطرے میں رہنے لگے چھوٹے الزامات کا بازار گرم ہو گیا۔ جس طرح ہندستان میں کسی کو مصیبت میں پھنسانے کے لیے اُسے وہابی کہدینا کافی تھا، اگرچہ غلط ہی ہو، اُسی طرح مکّے میں بھی یہ الزام، ذاتی عداوتوں اور انتقام کا ایک زبردست آلہ بن گیا، اور اِس اعتبار سے حکومتِ اسلامیہ اور حکومتِ کفار، دونوں برابر ہو گیے!

"وہابیت" کا رد

اِسی زمانے میں علمائے مکہ نے والد مرحوم سے کہا کہ وہابی عقائد کی کتابیں اردو میں ہیں، جنہیں وہ سمجھ نہیں سکتے۔ نیز نجدی عقائد کا بھی رد کافی طور پر نہیں ہوا ہے، شیخ احمد دحلان نے اِس بارے میں خاص طور پر زور دیا، اور اِس طرح والد مرحوم نے ایک کتاب، نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھی، جو اُن کی تصانیف میں سب سے بڑی ہے۔ اِس کا نام "نجم ....."

ع؎ مسودے میں یہ جگہ خالی ہے

الرجم الشیاطین" ہے۔ یہ دس جلدوں میں ختم ہوئی ہے اور ہر جلد بہت ضخیم ہے۔ اِس کی ترتیب اِس طور پر ہے کہ ایک سو چودہ مسئلے ما بہ النزاع منتخب کیے ہیں۔ اِتنی تعداد جزئی جزئی اختلافات کے استقصار کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ہر مسئلے کے لیے ایک باب قائم کیا ہے اور اس میں پہلے قرآن سے، پھر احادیث سے، پھر اقوالِ علمائے سے رد کا التزام کیا ہے۔ اِس طرح کتاب، ایک سو چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ایک جلد صرف مقدمے میں ہے، اور چونکہ وہ اِن مسائل کے متعلق نہیں ہے، اِس لیے معلومات کے اعتبار سے بکار آمد ہے۔ اِس میں اصولی طور پر عقائد اہل سنت پر بحث کی ہے، اور ہر طرح کے اختلافات کو ختم کر کے اپنے مسلک کو بہت شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہے۔

انتظام یہ کیا گیا تھا کہ کتاب کی تصنیف و اشاعت ایک ساتھ ہو، چنانچہ پہلی جلد جوں ہی تیار ہوئی، چھپ گئی۔ اِسی طرح دوسری جلد بھی۔ یہ دونوں بکسے کے سرکاری پریس، مطبع میری میں چھپی ہیں، لیکن چونکہ اِس درمیان میں سفر پیش آگیا، جس کا ذکر آگے آئے گا، اِس لیے بقیہ جلدیں نہ چھپ سکیں۔

اِس کے علاوہ ایک اور رسالہ بھی اِسی مطبع میں چھپا ہے، جس میں اُنھوں نے وہ ایک سو چودہ مسئلے بلا زیادتی اِس طور پر درج کیے ہیں کہ ایک کالم میں وہ ہیں اور دوسرے میں وہ عقائد ہیں جن کو وہ عقائد اہلِ سنت سے تعبیر کرتے ہیں۔ دیباچے میں لکھا ہے کہ شریف کی فرمائش اور شیخ احمد

دحلان کے اصرار سے اس رسالے کو مرتب کیا ہے اور اس میں شیخ احمد دحلان کو بھائی کے لقب سے لکھا ہے جس سے اُنکے باہمی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

حُبِّ دنیا کی ایک مثال

اسی زمانے میں یہ ایک دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا کہ شیخ احمد دحلان نے مذہب شافعی کو چھوڑ کر مذہب حنفیہ اختیار کر لیا اسکے باعث بھی والد مرحوم ہی تھے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سلطنت عثمانیہ کے دوسرے مذہبی عہدوں کی طرح حجاز کے مفتی و شیخ حرم کا عہدہ بھی صرف احناف کے ساتھ مخصوص تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ احمد اس عہدے کے بہت متمنی تھے۔ دوسری طرف شیخ جمال، جو شیخ حرم تھے، اپنے بھائی شیخ عبد اللہ کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ والد مرحوم کے چونکہ شریف اور قسطنطنیہ، دونوں سے گہرے تعلقات تھے، اس لیے اُنھوں نے براہ راست قسطنطنیہ کے دربار سے مراسلت کی اور شیخ احمد کے لیے سفارش کی۔ پھر شریف کو آمادہ کیا اور شیخ احمد کو ترغیب دی کہ شافعیت کو چھوڑ کر حنفی ہو جائیں، چنانچہ وہ ہو گیے اور جب شیخ جمال نے کبر سنی کی وجہ سے علیحدگی اختیار کی، تو اُن کی جگہ شیخ احمد دحلان مقرر ہو گیے۔

شیخ جمال اور شیخ محمد حسین سندھی نے جو اُس وقت علمائے حجاز میں بہت ممتاز تھے، اُن کے اس فعل پر نکتہ چینی کی اور کہا کہ شیخ نے محض دنیا کے لیے اپنے مذہب کو خیر باد کہا ہے، اور یہ ناجائز ہے کہ انسان اپنے امام کے مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرے۔

اِس پر والد مرحوم نے ایک رسالہ لکھا اور ان تمام اعتراضات کا جواب دیا اور ثابت کیا کہ جو شخص نظرِ عمیق رکھتا ہو، اُس کے لئے جائز ہے کہ وہ ائمہُ اربعہ میں سے جس کسی کی چاہے تقلید اختیار کرے۔ البتہ یہ ناجائز ہے کہ اِن چاروں کی تقلید سے نکل جائے۔ ساتھ ہی حسبِ عادت حنفیت کو شافعیت پر ترجیح دی ہے، حالانکہ وہ اِس حقیقت سے غافل ہوگئے کہ اس مسلک کے التزام سے تقلیدِ شخصی کا اصول ٹوٹ جاتا ہے!

اِس رسالے میں ایک دلچسپ تاریخ اِس طرح کے انتقالات کی دی ہے اور دکھایا ہے کہ شیوعِ تقلید کے عہد سے لے کر ان کے وقت تک کن کن علما نے ایک مذہب سے دوسرے کی طرف انتقال کیا ہے اور شیخ احمد کے حنفی ہو جانے کو حنفیت کی ایک فتح اور دلیلِ احقیت قرار دیا ہے۔ یہ رسالہ بھی مطبع میری مکہ میں طبع ہوا ہے۔

اِس کے علاوہ ایک اور رسالہ بھی لکھے کے اِسی مطبع اور پھر مطبع الجوائب قسطنطنیہ میں چھپا ہے۔ اِس میں وہ تمام عربی قصائد و مقامات ہیں، جن سے اُنھوں نے اپنے زمانۂ قیام دارالخلافہ میں سلطان کی مدح کی ہے اور چند نعتیہ قصائد بھی شامل کر دیے ہیں۔

وہ جب قسطنطنیہ میں تھے، تو سلطان نے اُنھیں تمغۂ مجیدی دیا تھا، جو نیا نیا بنا تھا۔

نہرِ زبیدہ کی مرمت

اُن کے زمانۂ قیامِ حجاز کا ایک یادگار اور تاریخی واقعہ نہرِ زبیدہ

کی مرمت بھی ہے۔ یہ نہر، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، زبیدہ زوجہ ہارون رشید نے بڑے اہتمام سے تعمیر کرائی تھی اور مکہ اور ریگستان میں پانی کا وحید ذریعہ ہے۔ زبیدہ نے اس نہر کے اہتمام کے لئے گرانبہا اوقاف کیے تھے، لیکن انقلابات زمانہ سے وہ سب مفقود ہو گئے۔

نہر کا طولانی رقبہ بہت وسیع ہے۔ درمیان میں یا تو ریگستانی سرزمین ہے یا کوہستانی، اور دونوں پانی کے پہنچنے میں مزاحم ہیں۔ پھر بدو، جنہیں حج کے موسم میں لاکھوں روپیہ کی کمائی، پانی کے ذریعہ سے ہوتی ہے، ہمیشہ اس نہر کی خرابی کا باعث ہوتے رہتے ہیں، اسی لیے صدیوں سے اس نہر سے بہت کم انتفاع ہوتا ہے۔ سلطنت عثمانیہ نے کئی مرتبہ اس کی اصلاح و درستگی کی، مگر چند سال سے زیادہ اس کے آثار باقی نہ رہے۔

والد مرحوم جب مکہ میں تھے، تو اس نہر میں یا تو بالکل پانی آتا ہی نہ تھا اور اگر آتا تھا تو بہت کم، اور شریف کے سپاہی اس پر بیٹھ جاتے اور نہایت گراں قیمت پر پانی فروخت کرتے تھے، حتیٰ کہ دو دو ریال میں ایک ایک مشک بکتی تھی، اور مکہ کی مشک، بہشتیوں کی چھوٹی ہوتی ہے۔ ابراہیم پاشا مصری نے جب وہابیوں سے مکہ چھینا، تو لوگوں نے اُس سے پانی اور اس نہر کے بارے میں بڑی شکایت کی تھی، اور اُس نے وعدہ کیا تھا کہ مصر جا کر اس کے باب میں کوشش کرے گا، مگر چونکہ مصر اور ٹرکی میں جنگ چھڑ گئی تھی۔ اس لیے وہ اپنے وعدے کا ایفا نہ کر سکا۔

اسی زمانے میں ایک سال کے حج میں پانی بالکل بند ہو گیا اور ہزاروں آدمی پیاس سے مر گئے۔ والد مرحوم نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اور منی

ہی میں ارادہ کر لیا تھا کہ دوسرے حج کے آنے سے پہلے ہی وہ اِس کارِ خیر کو کر کے چھوڑیں گے۔ پہلے اُنھوں نے سلطانی نوازشات پر بھروسہ کر کے قصرِ سلطانی کے احباب کو توجہ دلائی، مگر مصری جنگ کی وجہ سے وہاں کوئی شنوائی نہ ہوئی، اِس لیے اُنھوں نے اپنے طور اِس کا بندوبست کرنا چاہا۔

اِس زمانے میں ان کے مریدین میں حاجی عبد الواحد، جو کلکتے اور بمبئی میں حاجی واحد نا کے نام سے مشہور ہیں، اور اُن کے شریک کار، حاجی زکریا تھے، جن کی کلکتہ، بمبئی، رنگون، موریشس، عدن، جدہ، ینبوع، ان تمام مقامات میں بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں، اور یہ دونوں اس سال کے حج میں موجود تھے اور والد مرحوم کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔

جب قسطنطنیہ کی طرف سے ناامیدی ہو گئی، تو والد نے سب سے پہلے حاجی عبد الواحد اور حاجی ذکریا سے تحریک کی، اور اِنھوں نے دو لاکھ کی پہلی رقم پیش کر دی۔ حُسنِ اتفاق سے اِسی سال نواب کلب علی خاں والئ رامپور اور عبد الغنی خاں نواب ڈھاکہ بھی حج میں شریک تھے، یہ اگرچہ مکہ سے چلے گیے تھے، مگر جدے میں جہاز کے انتظار میں موجود تھے۔ والد مرحوم ان کے پاس گیے اور اس بارے میں توجہ دلائی۔ نواب کلب علی خاں نے پانچ لاکھ روپیہ اور نواب عبد الغنی نے ایک لاکھ روپیہ فنڈ میں دیا۔

اِس کے بعد والد نے سات آدمیوں کی ایک مجلس بنائی اور یہ فنڈ اُس کے انتظام میں دے دیا۔ اردو اور عربی میں اپیلیں لکھیں اور ہندستان و مصر بھیجیں۔ ساتھ ہی حاجی عبد الواحد کو ہندستان بھیجا کہ چندہ کریں اور

اچھے انجینیر منتخب کر کے لائیں۔ چنانچہ ابھی چھ ماہ بھی نہ گذرے تھے کہ انجینیر جدّے پہنچ گیے جن میں تین یورپین تھے جو جدّے میں ٹھہرے اور پانچ مسلمان تھے، جو مکّے گیے۔ جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تو ترکی حکام کو بھی اِس کام کی اہمیت محسوس ہوئی اور دو تُرک مُہندس، مصر سے بلائے گیے۔

سب سے پہلے پوری نہر کا معائنہ کیا گیا۔ پھر اُس کی پیمائش ہوئی اور اُصول ہندسہ کے مطابق نقشہ مرتب کیا گیا، اور یہ کام ختم ہو گیا۔ انگریز انجینیروں کی وجہ سے صدر دفتر جدّے میں قائم کیا گیا اور اُس کی شاخ مکّے میں۔ تمام مواد ہندستان سے منگایا جاتا تھا۔ چندے کی رفتار بڑی تیزی کے ساتھ جاری تھی اور ہندستان کے بعد سب سے زیادہ حصّہ مصر نے لیا تھا۔ خود خدیو کی گورنمنٹ کے پاس والد مرحوم نے ایک وفد بھیجا اور اُس نے ایک معقول رقم دی۔ اِس کے علاوہ عام چندہ بھی ہوتا تھا، اگرچہ مفصل حسابات والد مرحوم کے کاغذات میں نہیں ملے ہیں، مگر اُن کی یادداشتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنیس لاکھ روپیہ جمع ہوا تھا۔

حکومتِ شریف کی خیانت

لیکن نہایت افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ چونکہ والد مرحوم نے خزانچی ایک ایسی جماعت کو بنایا تھا، جو یا تو سرکاری آدمیوں سے تھی یا شریف کے زیر اثر لوگوں سے، مثلاً مفتی اور شیخ حرم وغیرہ، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس فنڈ پر شریف کا تسلط ہو گیا اور شریف کی گورنمنٹ، رُپیہ کے

بارے میں جتنی قابلِ اعتبار ہے، معلوم ہے۔ خود والد مرحوم ہمیشہ اِس پر افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں سب سے بڑی غلطی یہ کی ہے کہ باوجود لوگوں کے سخت اصرار کے کہ جب یہ کام میں نے شروع کیا ہے، رُپیہ پر بھی اپنا اقتدار رکھوں، لیکن میں نے خود اصرار کر کے شریف کے لیے مداخلت کا موقعہ بہم پہنچایا اور رُپیہ ایسے اشخاص کے سپرد کر دیا۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب سات آٹھ لاکھ رُپیہ خرچ ہو چکا تو مزید رُپیہ کے ملنے میں رُکاوٹیں شروع ہوئیں اور بالآخر معلوم ہوا کہ مختلف حیلوں اور ناموں سے شریف نے باقی رُپیہ ہضم کر لیا ہے!

اوّل اوّل اِس کام میں بڑی دقتیں تھیں، اِسی لیئے شریف کی گورنمنٹ نے اِس تحریک کو کوئی اہمیت نہ دی، مگر جب دیکھا کہ رُپیہ، بارش کی طرح آرہا ہے، تو شرکت کی تاکہ رپیہ پر قبضہ کر سکے اور کام میں رکاوٹیں پیدا کرے۔ جب شریف نے رپیہ کے سلسلے میں خیانت کی اور والد نے اِس بارے میں سخت گیری شروع کی، تو چونکہ شریف کی گورنمنٹ کبھی اِس قسم کی باز پرس کی عادی نہ تھی، اُس پر یہ سخت گیری بہت گراں گزری اور شریف اور والد مرحوم کے قدیم تعلقات میں بہت زیادہ فتور آگیا، بلکہ سخت مخالفت ہو گئی، اور ایک مرتبہ تو حالات اِس درجہ ناگوار ہو گیے کہ والد مرحوم کو مجبوراً مکہ چھوڑنے کا ارادہ کرنا پڑا، چنانچہ روانہ ہو گیے۔ جدے تک پہنچے تھے کہ پھر شریف کے آدمی پہنچے اور منا لے گیے۔

اِس سلسلے میں وہ جو بے شمار حالات مختلف وقتوں میں بیان کیا کرتے تھے۔

اُن سے شریف کی گورنمنٹ کا ظلم و غضب، بد دیانتی و خیانت، اور طرح طرح کے اخلاقی مفاسد کے ایسے مناظر سامنے آجاتے ہیں، جن سے زیادہ بدتر حالت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

اگرچہ یہ رُپیہ، جو مسلمانانِ ہند و مصر نے ایک ایسے کارِ خیر کے لیے جمع کیا تھا، نصف کے قریب شریف اور اُس کے اہل کاروں کے پیٹ میں جا چکا تھا، تاہم نہر کی تعمیر ہو گئی، اور اگر شریف کی خیانت نہ ہوئی ہوتی، تو اعلان کیا گیا تھا کہ یہ کام صرف نہر زبیدہ ہی پر ختم نہ ہو جائے گا، بلکہ وہ چند مقامات، جو مکہ اور مدینے کے درمیان میں ہیں اور جن میں بہم رسائی آب کے مواقع حاصل ہیں، اُن کو بھی عام کر دینے کی کوشش کی کی جائے گی۔ اگر یہ پورا رپیہ ہاتھ میں ہوتا اور وہ نقشہ جو ہندستان سے تیار ہو کر گیا تھا، پوری طرح عمل میں آجاتا، تو کم از کم ایک صدی تک نہر زبیدہ ہر طرح کی خرابی سے محفوظ ہو جاتی۔ اِس اسکیم کا منشا یہ تھا کہ اوّل تو نہر کی زیریں تہ کو پختہ اور سنگی فرش کر دیا جائے، کیونکہ رفتارِ آب میں زیادہ تر مانع ریگ ہی ہوا کرتی ہے، اور پھر بجز اُس کے آخری سرے کے باقی ان تمام حصوں کو، جو عہ ۔ پر واقع ہیں، بالکل پاٹ دیا جائے۔ یہ نقشہ مع اُس کی مفصل اسکیم کے اب تک میرے پاس موجود ہے۔

لیکن افسوس ہے رپیہ کی کمی کی وجہ سے یہ کام پورا نہ ہو سکا۔ البتہ

عہ مسودے میں یہ جگہ خالی ہے۔

نہر کی اِس درجے درستگی ہو گئی کہ تیس برس تک پھر کسی طرح کی خرابی واقع نہ ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں پھر مرمت کی ضرورت پیش آئی اور سلطنت عثمانیہ نے قسطنطنیہ سے ایک کمیشن بھیج کر مرمت کرا دی۔

نہر زبیدہ کے سلسلے میں والد مرحوم کو اُن کی خدمات کے اعتراف میں دوبارہ تمغۂ مجیدی درجۂ اوّل ملا اور اُن کی سفارش سے دو اور شخصوں کو بھی، جنھوں نے سب سے زیادہ حصہ لیا تھا، درجۂ دوم کے تمغے دیے گیے۔ وہ دونوں شخص، حاجی عبدالواحد اور حاجی زکریا ہیں۔ نیز والد مرحوم کو ایک سلطانی فرمان بھیجا گیا، جس میں سلطان کی جانب سے اُن کی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے اور بہت سے کلمات اعزاز و احترام استعمال کیے گیے ہیں۔

شریف مکّہ کی دشمنی

جب نہر کا کام ختم ہو گیا تو ایک اور واقعہ پیش آیا، جس کی وجہ سے از سرِ نو شریف کو مخالفت پیدا ہوئی، کیونکہ نہر زبیدہ کے کام اور فنڈ کے لیے ایک باقاعدہ مجلس والد مرحوم نے بنا دی تھی، اِس لیے ضروری معلوم ہوا کہ اب کام کے اختتام پر اُس کی مفصل رپورٹ بھی شایع کر دی جائے۔ چنانچہ اُنھوں نے رپورٹ تیار کرائی اور چھپوانا چاہی، مگر شریف نے اُس کی اشاعت روکنا چاہی، کیونکہ جانتا تھا، اِس رپورٹ سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ کتنا روپیہ فنڈ میں جمع ہوا تھا اور کس طرح شریف

نے اُس کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ نیز اُسے ڈر ہوا کہ وہ مبادا حکومت آستانہ (قسطنطنیہ) کو بھی اِس معاملے پر توجہ دلائیں گے، چنانچہ اُس نے نہایت سختی سے مخالفت پر کمر باندھی، مگر والد مرحوم نے ذرا بھی پروا نہ کی اور رپورٹ پوشیدہ طور پر بمبئی بھیج کر چھپوائی اور وہیں سے شایع کر دی۔ نیز اِس معاملے کو حکومت قسطنطنیہ تک بھی پہنچا دیا، جہاں خسرو پاشا موجود تھے، جن کے توسط سے اُن کو پورا موقعہ اپنی گزارشات کے سلطان تک پہنچانے کا حاصل تھا۔

شریف کو جوں ہی اِن حالات کا پتہ چلا، نہایت برافروختہ ہوا، اور مخالفت و ایذا رسانی کا کوئی موقعہ جانے نہ دیا، مگر مشیّت نے ایک دوسرا ہی گل کھلایا۔ کچھ تو اِس خیانت کی وجہ سے جو شریف سے نہر زبیدہ کے فنڈ میں عمل میں آئی تھی، اور کچھ اور اسباب سے حکومت عثمانیہ موجودہ شریف سے بالکل بدظن ہو گئی اور شریف کو بھی معلوم ہو گیا کہ اوّلین فرصت ہی میں اُس کے برخلاف کارروائی عمل میں آئیگی، یہ سوچ کر شریف نے ایک باغیانہ سازش کا سامان آہستہ آہستہ فراہم کرنا شروع کر دیا اور عجیب نہیں کہ اگر مہلت ملتی، تو کوئی نیا حادثہ ظہور میں آتا، لیکن شریف اچانک مرضِ سرطان میں مبتلا ہوا اور مکہ سے طائف جاتے ہوئے انتقال کر گیا۔

والد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ جب شریف کی مخالفت انتہائی درجے تک پہنچ گئی اور ایک دن مجھے خبر ملی کہ شریف نے میرے خلاف اپنی سازشیں پوری طرح مکمل کر لی ہیں، تو پچھلی رات کو طواف کرتے ہوئے میں نے خدا

سے دعا کی کہ "اے معبود، تو بہتر جانتا ہے کہ کون حق پر ہے، اور تو نے حق والوں کی نصرت و حفاظت کا وعدہ کیا ہے!" چنانچہ جوں ہی نمازِ فجر ختم ہوئی، میں نے حرم میں یہ اعلان ہوتے سُنا کہ شریف کا انتقال ہو گیا

علمائے ازہر سے مباحثہ

زمانۂ قیام مصر کا یہ ایک واقعہ بھی ہے کہ اُسی زمانے میں ایک سخت وبا مصر میں پھیل گئی تھی۔ حکومت خدیو نے یورپین ڈاکٹروں کا ایک کمیشن تحقیقات کے لیے مقرر کیا۔ اُس نے اپنی رپورٹ میں منجملہ اور تدابیر کے یہ بھی لکھا کہ دفن کرتے وقت نعش کے ساتھ چونے کی ایک کمیت رکھنی چاہیے تاکہ جلد تحلیل ہو جائے۔ خدیو نے اسے قبول کر لیا اور قانون بنا دیا کہ ایسا ہی کیا جائے۔ اس پر علمائے ازہر نے سخت فتنہ برپا کیا اور اسے خلافِ مذہب قرار دے کر ازہر میں ہڑتال کر دی، جو ناراضی ظاہر کرنے اور گورنمنٹ کو مجبور کرنے کا سب سے بڑا آلہ تھا۔ اتفاق سے ایک روز والد مرحوم حسب دستور ازہر گیے۔ اُس وقت وہاں اسی مسئلے پر مذاکرہ ہو رہا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ میرے نزدیک مُردے کے ساتھ چونا رکھنا ناجائز نہیں بلکہ جائز ہے، کیونکہ بیری کے پتوں سے مُردے کو نہلانا اور کافور وغیرہ رکھنا اسی مقصد سے ہے۔ علمائے ازہر نے اس بات کو قبول نہ کیا۔

شدہ شدہ یہ بات خدیو کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ خدیو ان کے حالات سن چکا تھا۔ اُس نے ملاقات کی خواہش کی اور اس مسئلے کے بارے میں

اِن کے دلائل سُنے۔ آخر علمائے ازہر کے ساتھ مناظرے کی ٹھہری۔ مجلس مناظرے میں شیخ ازہر، مفتی و قاضی مصر اور خود خدیو بھی موجود تھے۔ والد مرحوم نے اپنے تمام دلائل بیان کیے اور ساتھ ہی کسی کتاب میں ایک جزیے کا موجود ہونا بھی بتایا۔ علما نے اِس جزیے کے وجود سے قطعی انکار کیا۔ اِس پر والد نے کہا، تعجب ہے کہ یہ کتاب آپ ہی کے شیوخ کی لکھی ہوئی ہے اور آپ ہی میں سے ایک صاحب کی تصحیح سے، جو یہاں مجلس میں موجود ہیں، مطبع میری میں چھپی ہے۔ اُس میں یہ جُزیہ موجود ہے اور آپ اُس سے بے خبر ہیں۔ ساتھ ہی کتاب اُسی وقت طلب کی اور وہ جُزیہ نکال کر دکھلا دیا۔ اِس بات کا اثر خدیو پر بہت ہوا اور وہ اِن سے ہر پندرھویں دن ملنے لگا۔ اس مناظرے کا حال، سرکاری اخبار "الوقائع المصریہ" میں شایع ہو گیا تھا

یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اسی زمانۂ قیام مصر میں اُن کی سعی اور تصحیح سے ابن عربی کی فتوحاتِ مکیہ چھپی۔

مکے میں مولانا نذیر حسین کی گرفتاری

زمانۂ قیام مکہ میں ایک اور قابل ذکر واقعہ پیش آیا، یعنی مولانا سید نذیر حسین مرحوم، ہندوستان میں درس حدیث کے آخری مرکز عہ تھے۔ اُنھوں نے جب سفر حج کا ارادہ کیا، تو اُن کو خیال پیدا ہوا کہ مخالفین مکہ میں ایذا رسانی

عہ ہندوستان ہی نہیں، تقریبًا تمام دنیائے اسلام کے شیخ حدیث تھے، دہلی میں اسّی برس درس حدیث دیا۔

کی کوشش کریں گے، اس لیے کہ علمائے وہابیہ کے ساتھ وہاں پہلے جو سلوک ہو چکا تھا، اُس سے باخبر تھے، اور اب حجاز کی یہ حالت ہو گئی کہ بلا تقیہ کوئی وہابی محفوظ طور پر نہ رہ سکتا تھا۔ شیعہ و خوارج تو علانیہ جاتے اور حج کرتے۔ کوئی روک نہ پیش آتی، مگر وہابیہ کے لیے یہ موقع نہ تھا۔

مولانا نذیر حسین نے چونکہ غدر میں مسز لیسن کی جان بچائی تھی اور اس لیے حکام سے اُن کے تعلقات اچھے تھے۔ انھوں نے ڈپٹی کمشنر دہلی کے ذریعے سے فارن آفس میں سلسلہ جنبانی کی اور جدے میں برٹش قونصل کے نام ایک سفارشی چٹھی بھجوائی، جس میں لکھا تھا کہ اُن کی حفاظت کی جائے اور جو ضرورت اُنھیں پیش آئے، حتی الامکان اُس میں پوری طرح مدد دی جائے۔ اس طرح یہ حجاز روانہ ہو گئے۔

ہندستان میں چونکہ اُس وقت تقلید و عدم تقلید کا فتنہ زور پر تھا، اور مولانا نذیر حسین، غیر مقلدین کے سب سے بڑے شیخ سمجھے جاتے تھے، اس لیے فوراً مکے میں اطلاع دے دی گئی کہ وہابیہ کا سب سے بڑا سرغنہ آ رہا ہے۔ اگر یہاں کوئی کارروائی نہ کی گئی تو اس بات کو وہابی، حجاز میں اپنی فتح سے تعبیر کریں گے اور عوام کو اس سے بہت فتنہ ہو گا۔ ساتھ ہی مولانا نذیر حسین کی کتابوں اور فتاوی کے بعض مطالب کا عربی میں ترجمہ کر کے پیش کیا گیا۔ ان میں بعض چیزیں تو واقعی اُن کی کتاب، معیار الحق سے لی گئی تھیں اور اکثر ایسے الزامات تھے جو ایسے موقعوں پر فریقین ایک دوسرے سے فریقانہ جذبات کے ماتحت منسوب کر دیتے ہیں۔

اِس زمانے میں ہندستان میں ایک فتویٰ "جامع الشواہد فی اخراج الوہابیین عن المساجد" کے نام سے مرتب ہوا تھا۔ اس میں چند عقائد تو واقعی اس جماعت کے تھے اور بڑا حصہ منسوبات کا تھا، یا خود الزامی طور پر اُن کے عقائد کا استخراج کیا گیا تھا، مثلاً شحم خنزیر کی حلّت، بولِ طفلِ صغیر کی طہارت، مادۂ انسانی کا پاک اور قابلِ اکل ہونا، خالہ سے مناکحت کا جواز، اور جوازِ کذبِ باری تعالیٰ وغیرہ وغیرہ۔

والد مرحوم نے مولانا نذیر حسین مرحوم کے عقائد کی فہرست زیادہ تر اسی جامع الشواہد سے اخذ کی تھی، البتہ معیار الحق سے تقلید شخصی کے عدمِ وجوب اور التزام و تعیّن تقلید شخصی کے مفاسد اور امام صاحب کی تابعیت سے تاریخی طور پر انکار، اور تحدید دہ دردہ کی عدم صحت، اور تحدید ظلِ مثلین کی عدم صحت، اور بعض دیگر مسائل مختلف فیہا میں مذہب محدثین کی توثیق وغیرہ۔ کو لے کر بہت رنگ آمیزی کے ساتھ ترجمہ کیا گیا تھا اور یہ استدلال کیا گیا تھا کہ ان سے امام صاحب کی تحقیر و توہین مقصود ہے۔

بہر حال نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا نذیر حسین اور مولانا تلطف حسین عظیم آبادی مع ایک اور رفیق کے گرفتار کر لیے گیے اور ایک نہایت ہی تنگ و تاریک محبس میں قید کر دیے گیے۔ چند دن بعد اُن کو شریف نے بلایا اور جب اُنھوں نے اپنی گرفتاری کی وجہ پوچھی تو کہا، تمہیں وہابی عقائد رکھنے کی وجہ سے گرفتار کیا گیا ہے۔ مکہ معظمہ، اسلام کا اصلی مرکز ہے، اِس لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ فاسد عقائد رکھنے والوں کا احتساب کریں، تاکہ وہ مسلمانوں کو گمراہ نہ کر سکیں!

دوسرے دن شریف کے یہاں ایک مجلس منعقد ہوئی اور اُس میں والد مرحوم سے کہا گیا کہ اُن کے عقائد کی فہرست پیش کریں۔ فہرست میں سب سے پہلا الزام، امام صاحب کی توہین کا تھا اور باقی مذکورہ الزامات تھے۔ مولانا نذیر حسین مرحوم کی طرف سے مولوی تلطف حسین تقریر کرتے تھے۔ سب سے پہلے اُنھوں نے اِس حالت پر افسوس کا اظہار کیا کہ ہم ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں، جہاں کفّار کی سلطنت ہے، لیکن وہاں ہمارے عقائد کی وجہ سے ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچایا جاتا۔ یہاں اسلامی حکومت ہے اور دارالامن ہے اور بلا کسی وجہ کے ہم کو گرفتار کر کے مبتلائے محن کیا جاتا ہے۔ پھر کہا کہ ہم پر یہ جو الزام ہے کہ ہم وہابی ہیں اور محمد بن عبدالوہاب کی جماعت سے ہیں، بالکل غلط ہے۔ ہم قرآن و حدیث مانتے ہیں اور اُسی پر عمل کرتے ہیں۔

اِس پر والد مرحوم نے کہا کہ اجماع و قیاس کو بھی مانتے ہو؟ مولانا نذیر حسین نے کہا کہ ہاں، ہم اجماع و قیاس کو اُسی طرح مانتے ہیں، جس طرح ائمہ مجتہدین مانتے تھے۔ اِس پر گفتگو شروع ہوئی اور بہت قال و قیل ہوئی۔ اِس کے بعد کہا گیا کہ ائمہ اربعہ کی نسبت تمہارا کیا عقیدہ ہے؟ اُنھوں نے کہا، ہم اُنہیں اپنا سرتاج و پیشوا اور برسرِ حق سمجھتے ہیں، اور اِن میں امام ابوحنیفہ کو سب سے زیادہ قابلِ احترام سمجھتے ہیں۔ اِس پر معیار الحق پیش کی گئی۔ اُنھوں نے کہا کہ اگر اس طرح کے مباحث، امام صاحب کی توہین ہیں تو وہ تمام کتابیں بھی توہین پر ہوں گی، جن میں مسائل مختلف فیہ پر بحث کی گئی ہے، اور خود

سلف نے لکھی ہیں۔ پھر ایک ایک کر کے تمام الزامات سُنائے گئے۔ اُنھوں نے بڑے جوش سے ان سے اپنی برأت ظاہر کی۔ اس پر ثبوت میں جامع الشواہد پیش کی گئی۔ اُنھوں نے کہا، یہ مخالفین کی چیز ہے اور ہم اس کے ذمہ دار نہیں۔ اس پر کسی پشاوری کا ایک رسالہ پیش کیا گیا، جو مولانا نذیر حسین کا شاگرد تھا، مگر اُنھوں نے اُس سے بھی اپنی بے تعلقی ظاہر کی۔

معلوم ہوتا ہے مولانا نذیر حسین مرحوم، مجمل و مختصر بیان دے کر معاملے کو ختم کرنا چاہتے تھے، کیونکہ سمجھتے تھے تفصیلات میں پڑنا یا مباحثہ کرنا، طاقت کے مقابلے میں بیکار ہے۔ آخر میں اُنھوں نے اِس بیان پر اکتفا کی کہ ہمارا عقیدہ اہل سنّت والجماعت کا ہے۔ ائمہ اربعہ کو ہم مانتے ہیں۔ چاروں کو ہم حق پر سمجھتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کو اپنا پیشوا جانتے ہیں۔ اُن کے بُغض کو خلاف شیوۂ ایمان سمجھتے ہیں اور کتب فقہ پر عمل کرنا، جب تک قرآن و حدیث کے خلاف نہ ہو، خود ہمارا شیوہ ہے۔

"مکائدِ وہابیہ"

یہ بیان علمائے حجاز کے لیے ایک حد تک تشفی بخش ہو جاتا، لیکن جیسا کہ والد مرحوم کہا کرتے تھے، وہ اِن باتوں کو وہابیوں کے "مکائد" تصوّر کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ میں نے یہ مکائد نہ چلنے دیے اور کہا تفصیلاً بتاؤ کہ ائمہ اربعہ میں کس امام کی تقلید کرتے ہو؟ اور فلاں فلاں مسائل میں تمہارا کیا اعتقاد ہے؟ اِس پر اُنھوں نے تیسری مجلس میں ایک تحریر پیش کی،

جس میں لکھا تھا کہ میں ائمہ اربعہ کی تقلید کو فرائض و واجبات شرعیہ کی طرح فرض نہیں سمجھتا، لیکن عوام کے لئے اور اُن کے لیے جو فقہ و حدیث میں نظر نہیں رکھتے ہیں، جب تک کہ قرآن و حدیث کے خلاف کوئی صریح بات پیش نہ آئے، کتبِ فقہ متداولہ پر عمل کرنے کو مستحسن سمجھتا ہوں۔ اس کے علاوہ فلاں فلاں عقائد اور الزامات جو میری طرف منسوب کیے گیے ہیں، میں اُن سے بری ہوں اور حلفیہ کہتا ہوں کہ میرے عقائد وہ نہیں ہیں۔

اس اثنا میں اُن کی گرفتاری کی خبر، جدّے میں برٹش قونصل کو پہنچ گئی اور وہاں سے برابر زور دیا جا رہا تھا۔ بالآخر کو دن کے حبس کے بعد اُن سے اِس آخری تحریر پہ دستخط کرائے گیے اور اُنھیں رہا کر دیا گیا۔

میاں صاحب کی پوزیشن

یہ بات بالکل واضح ہے کہ مولانا نذیر حسین مرحوم نے اِس تحریر میں اُن اُصولوں کے خلاف کوئی بات نہیں کہی ہے، جو اہلِ حدیث کے اصول سمجھے جاتے ہیں، نہ تقلید شخصی کے وجوب کو مانا ہے، نہ کتبِ حدیث پر کتبِ فقہ کی ترجیح کو۔ صرف برائت کا اظہار ہے، تاہم یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اُن کے مخالفین نے مکّے سے اِس بات کی خبریں بھیج دیں کہ اُنھوں نے وہابیت سے توبہ کر لی! لطف کی بات یہ ہے کہ خود والد مرحوم باوجود اِن تمام تفصیلات کے بیان کرنے کے کہا کرتے تھے کہ مولانا نذیر حسین نے

توبہ کرلی، اور زور دیتے تھے کہ انھوں نے تقلید شخصی کو مستحسن تسلیم کرلیا! حالانکہ یہ جماعت بھی عوام کے لیئے ہمیشہ تقلید کو ضروری بلکہ فرض ٹھہراتی ہے۔ بحث تو صرف التزام و تعیُّن میں ہے نہ کہ نفسِ تقلید میں۔ عہ

ایک اور پہلو بھی اس واقعہ میں قابل ذکر یہ ہے کہ جس طرح اس طرف سے غلط بیانی کی گئی، اُسی طرح مولانا نذیر حسین مرحوم کے طرفداروں اور نادان معتقدوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ گرفتاری اُن کے لیے موجب توہین ہے؛ اُس کے واقع ہونے ہی سے انکار کردیا اور یہ کہنا شروع کردیا کہ یہ خبریں محض غلط ہیں، حالانکہ مولانا نذیر حسین مرحوم کا گرفتار ہونا، ایک ایسے مرکز میں جیسا مکّہ ہے، نہ صرف یہ کہ موجب توہین نہیں ہے۔ بلکہ قدرتی ہے۔

ایک تو یہ نامہ بھی مولانا نذیر حسین مرحوم کا بعض رسالوں میں میری نظر سے گزرا ہے، اور وہ مباحثہ مرشد آباد میں پیش بھی کیا گیا تھا، لیکن اُس کے فرضی ہونے پر میں ایسی شہادتیں رکھتا ہوں، جن سے زیادہ قابل اعتبار شہادتیں اور نہیں ہوسکتیں، کیونکہ جو تحریر مولانا نذیر حسین نے دی تھی، وہ بارہا والد مرحوم نے مجھے حرف بحرف سُنائی ہے، اور وہ وہی ہے جس کا ابھی ذکر کرچکا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں فتنے سے بچنے کے لئے ایجابی طور پر جس وضاحت سے اُنھیں اپنے عقائد بیان کرنا چاہیے تھا، اُس سے اُنھوں نے گریز کی، لیکن منفی طور پر اُنھوں

عہ مولانا آزاد کی خود اپنے والد کے مقابلے میں حق گوئی ملاحظہ ہو!

نے اپنے اصلی عقائد سے ہرگز انکار نہیں کیا، اور اُن حالات کو دیکھتے ہوئے، جو اُنھیں وہاں پیش آئے تھے، اُن کے اِس تسامُح کو کوئی بھی قابلِ الزام کمزوری نہیں قرار دے سکتا۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ اگر وہ حریفوں کے ساتھ بحث و جدال میں اُتر آتے، تو نتیجہ نہایت ہولناک ہوتا۔

والد کی مکّہ سے واپسی

مکّہ سے واپسی اس طرح ہوئی کہ اچانک ایک حادثہ پیش آگیا، جس میں والد مرحوم گر پڑے اور بائیں ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس وقت مکّہ میں ڈاکٹری علاج کا عمدہ انتظام نہ تھا۔ جس ڈاکٹر نے ہڈّی جوڑی تھی، اُس کی بندش ٹھیک نہ ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سخت تکلیف پیدا ہو گئی۔ مجبوراً علاج کے لئے ہندستان آنا پڑا، چنانچہ حسبِ عادت مع اہل و عیال کے سیدھے کلکتہ آگئے اور یہاں علاج کرایا، جس سے درد کی شکایت تو دُور ہو گئی، لیکن پاؤں کی ایسی حالت ہوگئی کہ اُس پر زور نہ دے سکتے تھے اور دونوں بغلوں میں لاٹھیاں رکھ کر اور جھول کر چلتے تھے۔ بعد کو اُنہیں خیال ہوا کہ ایک رگ کا بھی فساد ہے اور فصد لینی چاہی۔ اسی زمانے میں دتّی سے ایک ماہر جرّاح آیا ہوا تھا، اُس سے فصد لی اور بالکل آرام ہوگیا، لیکن آخر عمر تک خفیف سا لنگ پاؤں میں باقی رہا اور ایک لکڑی کا سہارا ہاتھ میں لے کر چلتے تھے۔

والدہ کا انتقال

جس سال کلکتے پہنچے، اُسی سال والدہ کا انتقال ہوگیا۔ والد مرحوم اِس حادثے سے اِس درجہ برداشتہ خاطر ہوئے کہ باوجود اس کے کہ علاج ابھی مکمل نہ ہوا تھا، فوراً مکہ کا قصد کرلیا، لیکن اتفاق سے اِسی زمانے میں حاجی عبدالواحد بھی کلکتے میں علیل ہو گئے اور اُنھوں نے اصرار کیا کہ اِس حال میں مجھے چھوڑ کر نہ جایئے، چنانچہ کلکتے میں ٹھہر گئے، اور مکہ معظمہ میں اپنے مشاغل اور کاروبار کے ایسے انتظامات کر دیے، جن کی وجہ سے اُن کی عاجلانہ واپسی کی ضرورت نہ ہو۔

مسجد ناخدا

یہ اُن کی کلکتے میں دوسری آمد تھی۔ پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ وہ ایک مرتبہ بغداد سے بمبئی آئے تھے، اور اُن کے یہی سب سے زیادہ مقرب مرید حاجی عبدالواحد و حاجی زکریا تھے، جو اُن کے آنے کی خبر پاتے ہی کلکتے سے بمبئی پہنچے اور بہت اصرار کر کے کلکتہ لے آئے تھے۔ اِس زمانے میں یہاں میمنوں کی جماعت بہت سربرآوردہ اور مسلمانوں میں سب سے زیادہ دولت مند تھی۔ اِس جماعت کے سربرآوردہ یہی حاجی عبدالواحد اور حاجی زکریا تھے۔

اس وقت کلکتے میں مسلمانوں کی آبادی لاکھوں تھی، مگر کوئی ایسی مسجد نہ تھی جو اتنی بڑی آبادی کے لیے کافی ہوتی۔ والد مرحوم اس جگہ ٹھہرے تھے،

جہاں اب کیننگ اسٹریٹ ہے۔ اُس زمانے میں اس سے متصل ارمنوں کا محلہ تھا۔ چونکہ کوئی مسجد نہ تھی، اِس لیے وہ نماز کے لیے اُس چھوٹی سی مسجد میں جایا کرتے تھے، جہاں اب جامع مسجد واقع ہے۔ حاجی واحدنا ایک دن ہمراہ تھے۔ نمازِ عشار کے بعد مسجد میں بیٹھے تھے اور بہت لوگوں کا ہجوم تھا۔ اور بطورِ وعظ کے کچھ بیان فرما رہے تھے۔ اِتنے میں سخت ہلچل پیدا ہوئی۔ معلوم ہوا کہ باہر ایک جمِ غفیر ہے، جو اندر آنا چاہتا ہے اور جگہ کی قلت سے سخت کشمکش ہو رہی ہے۔ آخر اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وعظ ختم کر دینا پڑا۔ واپسی میں والد مرحوم نے حاجی واحدنا سے کہا، سخت افسوس ہے کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاکھوں مسلمان بستے ہیں، اور جن میں ایسے ایسے متمول بھی ہیں، مگر ایک مسجد بھی نہیں ہے، جس میں خدا کے بندے جمع ہو کر خدا کا ذکر سُن سکیں!

یہ اگرچہ ایک معمولی بات تھی، مگر بسا اوقات ایسی ہی معمولی باتیں بڑے بڑے کاموں کی بنیاد ہو جایا کرتی ہیں، چنانچہ یہ بات حاجی واحدنا کے دل پر لگ گئی اور اُنھوں نے دوسرے دن عرض کیا کہ آپ دعا فرمائیں کہ میں اسی جگہ پر، جہاں لوگ آپ کا وعظ سننے سے، جگہ کی قلت کے باعث محروم رہ گئے، ایسی مسجد کی تعمیر کر سکوں کہ ہزاروں آدمی اس میں بیٹھ کر آپ کا وعظ سُن سکیں۔

اُس زمانے میں اِس مقام پر دو چھوٹی چھوٹی متوازی مسجدیں تھیں اور اُن کے درمیان ایک قطعہ زمین بنجر، ایک ہندو زمیندار کی ملکیت میں تھا جس پر دکان داروں نے کھپریلیں ڈال کر پان وغیرہ کی دکانیں کر رکھی تھیں۔ شمالی مسجد، شمس النسار نامی ایک خوش حال بیوہ کی تولیت میں تھی، اور اسی

کے متصل ایک قطعۂ زمین بھی اُس کی ملکیت میں تھا، اور جنوبی مسجد کسی اور شخص کی تولیت میں تھی۔ شمس النسار چونکہ لاولد تھی اور اِس فکر میں تھی کہ اگر اُس کی مسجد کی آبادی کا کوئی معقول انتظام ہو جائے، تو اپنی جائداد بھی اُس پر وقف کر دے۔

جب والد مرحوم کو یہ بات معلوم ہوئی، تو اُنھوں نے شمس النسار کو بلا کر کہا کہ اگر تم اِس مسجد کو ہمیشہ آباد رکھنا چاہتی ہو، تو اِس کے لیے ایک ایسا شخص موجود ہے کہ اُس سے زیادہ موزوں اور کوئی شخص نہیں ہو سکتا، چنانچہ شمس النسار نے وہ مسجد مع اپنی زمین کے حوالے کر دی۔ اِس کے بعد دوسرے متولی کے راضی کرنے میں چنداں دشواری نہ پیش آئی۔ جب یہ مرحلہ طے ہو گیا، تو چار آدمیوں کی ایک ابتدائی متوَلّی جماعت قرار پائی، جن میں ایک ہندستانی، دو عرب اور چوتھے خود حاجی واحد نا تھے، اور دونوں مسجدیں گرا کر اور تمام درمیانی زمین خرید کر کے موجودہ جامع مسجد تعمیر کی گئی۔

مسجد کی تعمیر کے بعد پہلا جمعہ ایک نہایت ہی شاندار مجمع کے ساتھ ادا کیا گیا۔ والد مرحوم فرماتے تھے کہ اُسی دن مولانا احمد علی سہارنپوری مُحشّی بخاری و مسلم جو اپنے پریس کا سامان خریدنے کے سلسلے میں کلکتہ آئے ہوئے تھے، وعظ کے بعد مجھ سے ملے، اور کہا کہ میں نے اپنی ساری عمر میں ایسا موثر وعظ کبھی نہیں سنا۔ لیکن اس کے بعد جب زیادہ صحبتیں ہوئیں، تو والد مرحوم اُن کے عقائد سے ناخوش ہو گئے، چنانچہ کہا کرتے تھے کہ اُن میں وہابیت کا تھوڑا بہت عنصر تھا، حالانکہ وہ سخت حنفی تھے! بہر حال اِس مسجد کے محرک، والد مرحوم ہی تھے

اور اُن کے ذریعہ یہ ایک عمدہ کام انجام پا گیا۔

مسجد ٹیپو سلطان

دوسرے سفر کلکتہ میں جس کا میں ابھی تذکرہ کر رہا تھا، ایک دوسری مسجد کی تعمیر کے بھی وہ داعی و باعث ہوئے۔

واقعہ یہ ہوا کہ جب دوسری مرتبہ کلکتہ آئے، تو اُس وقت کلکتے میں مٹیا برج کی طرح ٹالی گنج بھی ایک خاندانِ شاہی کا مستقر تھا، یعنی میسور کے حیدر علی و ٹیپو سلطان کا خاندان وہاں رہتا تھا۔ اس خاندان کے اگرچہ کچھ لوگ شیعہ ہو گئے تھے، لیکن اور سب سنّی تھے۔ والد مرحوم سے اکثر شاہزادوں کو عقیدت تھی اور اُنھوں نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔

اُس زمانے میں اِس خاندان کے بڑے سربرآوردہ، فرّخ شاہ تھے۔ اُنھوں نے ٹالی گنج میں ایک مسجد تعمیر کی تھی، اور جب وہ مکمل ہو گئی، تو والد مرحوم سے درخواست کی کہ ایک دن جمعہ کی نماز اُس میں پڑھائیں اور وعظ کریں۔ چونکہ انہیں معلوم تھا کہ اِس قسم کی درخواستیں عموماً یہ رد کر دیا کرتے تھے، اِس لیے اِنہیں مجبور کرنے کے لیے اُنھوں نے بلا اِن کی منظوری کے پہلے ہی سے مشہور کر دیا کہ فلاں جمعہ کو مولانا تشریف لائیں گے اور وعظ کریں گے۔

اِس زمانے میں بعض علمائے کلکتہ کو والد مرحوم سے مخالفت ہو گئی تھی، اور وہ اُن کے وعظ بند کرانے میں نہایت سرگرم تھے۔ چنانچہ فرخ شاہ

والد کے متعدد خاص مریدوں کو لے کر آئے اور کہا کہ خواہ کچھ ہو، آپ ضرور تشریف لے چلیں۔ میں مشہور کر چکا ہوں اور اب میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ والد یہ سُن کر سخت ناراض ہوئے اور بالکل انکار کر دیا لیکن جمعہ کے دن فرخ شاہ دس بجے پھر آئے اور اپنی ٹوپی، قدموں پر ڈال کر کہنے لگے کہ اگر آپ آج نہ گیے، تو میں کلکتے میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا اور کہا کہ آج صبح سے لوگوں کا تانتا بندھا ہوا ہے اور نماز تک معلوم نہیں کتنا مجمع ہو جائے گا۔ آپ اُن کی مایوسی اور میری عزت کا لحاظ فرمائیں۔

بہرحال والد مرحوم بالآخر مجبور ہو گیے اور جامع مسجد کے وعظ کے التوا کی اطلاع دے کر اُن کے ساتھ روانہ ہوئے۔ راستے میں جب گاڑی، اسپلینڈ کے چوراہے سے گزری، تو اُنھوں نے فرمایا کہ افسوس ہے آپ نے مسجد تعمیر بھی کی، تو شہر سے اتنی دور ایک ایسے مقام پر جہاں بجز اس کے کہ آپ اپنی سواریاں بھیج کر لوگوں کو لے جائیں، اور کوئی ذریعہ اس کی آبادی و رونق کا نہیں ہے۔ اگر مسجد تعمیر کرنی تھی تو اُسے ایسے موقع پر تعمیر کرتے، جہاں لوگ شب و روز رہتے ہیں اور آسانی سے پہنچ سکتے ہیں، جیسے کہ یہ مقام ہے، اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ گاڑی ٹھیک اُس مقام پر پہنچی تھی، جہاں اب دھرم تلّا کی مسجد ہے۔ فرّخ شاہ نے کوچ مین سے کہا کہ گاڑی روک لے۔ وہاں اُس زمانے میں کھپریل کی دو رویہ دکانیں بنی تھیں۔ گاڑی روک کر فرّخ شاہ نے کہا کہ آج آپ نے میری بات رکھ کر میرے دل کو اس قدر مسرور کیا ہے کہ میرا جی نہیں چاہتا کہ آپ کی زبان

سے جو بات اِس موقعہ پر نکلی ہے، اُسے رائیگاں جانے دوں۔ آپ نے بطور مثال کے اشارہ کیا ہے، اور اتفاق سے اسی جانب اشارہ ہوا ہے، لیکن اگر میری زندگی باقی ہے، تو میں آپ کو لاؤں گا اور یہیں ایک تعمیر شدہ مسجد میں آپ سے کہوں گا کہ نماز پڑھایئے۔

یہ بات رفت گزشت ہو گئی، لیکن فرُّخ شاہ بھولا نہیں اور اُسے پورا کر کے چھوڑا ؏۔ یہ جگہ نہایت قیمتی تھی۔ سب سے زیادہ قیمتی یہی موقعہ تھا۔ یہاں دس دس فٹ چوڑائی کی دوکانوں کا کرایہ پچاس پچاس روپیہ ماہوار تھا اور ایک انچ زمین ملنا دشوار تھا، لیکن وہ برابر سرگرم رہا۔ لفٹنٹ گورنر تک پہنچا اور چونکہ انگلستان میں کوئن سے نہایت قوی ذاتی تعلقات تھے، اس لیے نہایت تعجب انگیز طور پر کامیاب ہوا، اور یہ علاقہ، جس میں مسجد تعمیر کرنا، مُحالات سے معلوم ہوتا تھا، خرید لیا اور ایک نہایت وسیع اور شاندار مسجد تعمیر کی، جو وسعت کے اعتبار سے اِس وقت جامع مسجد کے بعد کلکتے میں دوسری مسجد ہے۔

پھر ٹھیک وہی منظر پیش آیا۔ فرُّخ شاہ، والد مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُنھیں لے گیا، اور پہلا جمعہ بڑی شان و شوکت سے پڑھایا۔ وہ نہایت متمنّی تھا کہ جامع مسجد کی جگہ اُس کی مسجد میں جمعہ پڑھیں اور وعظ کہا کریں، اور اس بارے میں گویا دونوں مسجدوں کے متولیوں

؏ یہ جملہ مولانا کی زبان سے اِسی طرح نکلا۔

میں باہم رقابت شروع ہو گئی تھی، کیونکہ دونوں جانتے تھے کہ وہ جس مسجد میں جائیں گے، اُسی میں شہر کی سب سے بڑی جماعت ہو گی، اس لیے فرخ شاہ نے پہلے ہی سے کوشش کی کہ وہ امامتِ جمعہ قبول کر لیں، لیکن اُن کے عادات میں ایک عادت یہ بھی تھی کہ جس پر وہ تمام عمر کاربند رہے، یعنی مساجد کی امامت سے احتراز، اسی بنا پر اُنھوں نے فرخ شاہ کی اِس درخواست کو نامنظور کر دیا۔ البتہ چند جمعے وہاں وعظ کہا، لیکن جب حاجی عبدالواحد مُصر ہوئے تو جامع مسجد ہی میں مستقل طور پر وعظ کرنے لگے، جس کا سلسلہ بلا انقطاع سات برس تک جاری رہا۔

بہرحال کلکتے کی اِن دونوں سب سے بڑی مسجدوں کی تعمیر میں خدا نے اُن کو تحریک کا اجر عطا فرمایا۔

اِس دوسرے سفر میں جب اُن کی آمد کا غلغلہ دُور دُور پھیلا، تو اِس مہلت کو غنیمت سمجھ کر ہر طرف سے لوگ جوق جوق آنے اور مرید ہونے لگے۔ اس وقت کے حالات مجھے یاد نہیں ہیں، لیکن حافظ ولی اللہ مرحوم جو اُن کے مدت العمر کے خادم تھے، کہتے تھے کہ اِس زمانے میں روزانہ ایک ایک مجلس میں پانچ پانچ سو اور ہزار ہزار آدمی مرید ہوتے تھے۔ قاعدہ تھا کہ صرف جمعہ کی شب کو مرید کرتے تھے، اور حافظ صاحب کہتے تھے کہ ہر جمعہ کی شب کو مسجد کا صحن آدمیوں سے بھر جاتا تھا، اور بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کلماتِ بیعت کے اعادے کے لیے وسط

صحن میں ایک اور آدمی کھڑا رہتا تھا اور مجلس کے کناروں کے لوگ اُس کی آواز سن کر اِن کلمات کا اعادہ کرتے تھے۔

وعظ کی مجلسیں

نیز ہر جمعہ کو جامع مسجد میں وعظ کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ اُن کے وعظ میں بعض طریقے و حالات ایسے تھے، جن کی فی الحقیقت عام طور پر نظیر نہیں ملتی۔ وعظ کا انداز عام وُعّاظ کے انداز سے بالکل مختلف اور الگ تھا، اور وہ اپنے طریقے کے بانی خود تھے۔ اُن کا وعظ گویا ایک مُرتّب کتاب ہوتی تھی۔ وعظ میں مطالب کے ربط، ترتیب، تقسیم، استنباط، استدلال، اجمال سے تفصیل، اور تفصیل سے پھر اجمال پر اختتام، اِن امور کا وہ اِس درجہ التزام کرتے تھے کہ اُنھوں نے حقیقتاً اِسے فن بنا دیا تھا۔

اُن کا وعظ کم از کم مسلسل تین گھنٹے ہوتا تھا۔ جمعہ کے بعد شروع کرتے اور عموماً عصر کی اذان پر ختم کرتے۔ آواز اتنی بلند تھی کہ اوّل سے آخر تک برابر ایک حالت پر رہتی اور بیس بیس اور پچیس پچیس ہزار کی مجلس میں آخر کے لوگ بھی ویسا ہی سنتے جیسے منبر کے پاس۔

ایک عجیب بات یہ تھی کہ باوجود اِتنی طوالت کے سامعین پر اِس درجہ استغراق طاری ہو جاتا تھا کہ ایک شخص بھی اپنی جگہ سے نہ ہلتا تھا۔ لوگ یہ ارادہ کرکے اُن کے وعظ میں بیٹھے ہیں کہ چند منٹ کے بعد

اپنی دُکان یا کام پر چلے جائیں گے، لیکن پھر ایسے مدہوش ہوئے ہیں کہ جب وعظ ختم ہوا ہے، تو انھیں ہوش آیا ہے۔

لیکن اِس تاثیر اور استغراق کا باعث کیا ہوتا تھا؟ اُن کا وعظ بالکل سادہ ہوتا تھا، جس میں عامیانہ دلکشی کا کوئی سامان نہ ہوتا تھا۔ وہ خوش آواز نہ تھے۔ خوش آوازی کا کوئی عنصر بھی اُن کے وعظ میں نہ ہوتا تھا۔ گاہ گاہ مثنوی ضرور پڑھتے تھے، مگر بالکل سادہ اور تحت اللفظ۔ اسی قسم کی اور تمام چیزیں، جو عام واعظ اپنے وعظ کو مؤثر بنانے کے لیے کرتے ہیں، اُن کے وعظ میں مطلق نہ ہوتی تھیں۔

بایں ہمہ یہ عجیب بات ہے کہ ہر جمعہ کو ہزاروں آدمی اُن کا وعظ سُننے کے لیے بے تابانہ دوڑتے تھے اور مبہوت ہو کر بیٹھے رہ جاتے تھے۔ بہت سے لوگ تو ایسے ہوتے تھے جو ایک دن کی مسافت طے کر کے محض اُن کا وعظ سننے آتے تھے اور صدہا ایسے بھی تھے، جنہوں نے معمول کر لیا تھا کہ بدھ کے دن وطن سے چلتے، جمعرات کی شام کو کلکتہ پہنچتے۔ وعظ سنتے۔ جمعہ کی شام کو واپس ہوتے اور سنیچر یا اتوار کو اپنے گھروں پر پہنچتے۔

اُن کے وعظ کی مجلسوں میں بالالتزام جتنا مجمع ہوتا تھا، اُتنا کبھی کسی کے وعظ میں نظر نہ آیا۔ جامع مسجد میں صرف یہی نہیں کہ اُس کا وسیع ہال بھرا ہوتا تھا، بلکہ میں نے خود دیکھا ہے کہ ہر جمعہ کو اُس کا پورا طویل برآمدہ بھی اُن لوگوں سے لبریز ہوتا تھا، جو اوّل سے لے کر آخر تک کھڑے کھڑے اُن کا وعظ سنتے تھے۔

برسوں تک وعظ ترک کر دینے کے بعد جب آخری مرتبہ اُنھوں نے کلکتے میں ۱۹۱۰ء میں وعظ بیان کیا، اور اُس میدان میں مجلس منعقد ہوئی، جس میں ندوۃ العلما کے اجلاس کے لیے پنڈال بنا تھا، تو لوگوں کے سخت اصرار سے باوجود علالت کے، حتیٰ کہ وعظ کے وقت تک اسہال کی شکایت تھی، وہ چائے کی ایک پیالی پی کر وعظ کے لیے گیے۔ دس بجے وعظ شروع ہوا اور دو بجے ختم ہوا۔ اُس شب کو اُن کے وعظ میں کتنے آدمی تھے؛ اِس کا اندازہ کوئی نہ کر سکا، لیکن حدِ نظر تک صرف سر ہی سر نظر آتے تھے۔ کم از کم پچیس تیس ہزار کا مجمع تھا۔ یہ واقعہ وفات سے چھ سات برس پہلے کا ہے، لیکن اس حالت میں بھی وعظ چار گھنٹے جاری رہا اور آواز، مجلس کے کنارے آدمیوں نے اُسی طرح سُنی جس طرح منبر کے پاس کے لوگوں نے۔

اُن کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ اُن کے وعظ کے لیے کوئی اشتہار تقسیم نہ کیا جاتا تھا۔ صرف چار پانچ دِن پہلے زبانی اعلان کر دیا جاتا تھا، جس کا چرچا پھیل جاتا تھا، اور حسبِ قاعدہ لوگ شہر و اطرافِ شہر سے آجایا کرتے تھے۔

وعظ میں اُن کا اسلوب بالکل نرالا تھا۔ وہ ایک آیت قرآنی تلاوت کرتے تھے۔ اِس کے بعد مختصر کلمات کہتے۔ بالالتزام اللہ کی اُن نعمتوں کا مختصراً ذکر کرتے، جو انسانی جسم و روح کے متعلق ہیں، اور خواہ کوئی آیت ہو، مگر نہایت عمدہ اور غیر محسوس ربط و مواصلت کے ساتھ اس پر پہنچ

جاتے تھے، اور اُس کا مُجمل بیان کرنے کے بعد بتدریج اس طرح، جیسے کوئی لپٹی ہوئی چیز آہستہ آہستہ کھلتی جائے، نہایت دُور دُور کے گوشوں میں پہنچ جاتے تھے اور ہر طرح کے بیان، ہر طرح کے لطائف و نکات، دقیق کے مباحث، مخالفین کا رد، سائلین کے سوالوں کے جوابات، غرضکہ ہر قسم کی باتیں بیان کرتے تھے اور پھر اس طرح کہ اصل موضوع کا رشتہ حوالۂ غفلت نہ ہوتا تھا، اور تھوڑے وقفے کے بعد جب سامعین کو یہ خیال ہونے لگتا تھا کہ وہ موضوع سے دُور ہٹ گیے ہیں، اور اب اُس پر نہیں آسکتے، تو اچانک ایک عجیب ربط و گریز و تخلص پیدا کرکے پھر اُسی آیت پر پہنچ جاتے تھے، حتّٰی کہ سُننے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ وہ بیان کر رہے تھے، وہ سب اِسی آیت کی تفسیر ہے۔ اِس کے بعد پھر کسی دوسرے عالم میں نکل جاتے۔ فرض کیجیے کہ پہلا مباحثہ، فقہ کا گوشہ تھا، تو یہ تصوف و صوفیت کا عالم ہے، لیکن پھر معاً گریز کرتے اور نہایت عمدہ ربط کے ساتھ پھر اُسی مرکز پر نظر آتے۔ اِس کے بعد تفصیل سے دوبارہ اجمال و ایجاز شروع ہوتا، اور آہستہ آہستہ اختتام کی طرف اس طرح رجوع کرتے کہ یہ رجوع فجاءۃً و بغتۃً نہ ہوتا، اور نہ سامع کے ذوق پر گراں گزرتا کہ جو بلاغت و خطابت کے خلاف ہو، بلکہ آغاز کے تدریجی اطناب کی طرح یہ بھی تدریجاً ایجاز ہوتا تھا، اور پھر آہستہ آہستہ بیان سمٹتے سمٹتے نہایت عمدہ طور پر ایک اختتامی نقطے پر جمع ہو جاتا اور وعظ ختم ہو جاتا۔

یہ پوری صحبت اس درجہ مُدوّن اور منضبط ہوتی تھی، گویا اس کا دیباچہ

ہے اُس کا مقدمہ ہے۔ اُس کے ابواب ہیں۔ اُس کا آغاز ہے، اور اس کا خاتمہ ہے، اور اگر مختصر نویسی کے ذریعہ قلمبند کیا جاتا تو ہر وعظ ایک مکمل و مرتب کتاب کی طرح نظر آتا۔

وعظ کا کمال

اُن کی طبیعت پر تصوف کا ذوق بہت غالب تھا، اور اسی لیے صوفیہ کے اسلوب نظر و فکر کی طرح اُن کو بھی طرح طرح کی تفصیلات اور تنوّعِ مطالب کے اِبداع کا بہت ذوق تھا، چنانچہ انکا ایک یہ بھی اسلوب تھا کہ وعظ میں بہت کم آیت میں تبدیلی یا تنوع اختیار کرتے تھے، اور جو کچھ تفصیل و تنوّع ہوتا تھا، بیان میں ہوتا تھا۔ ایک چھوٹی سی آیت برسوں تک کفایت کرتی تھی، چنانچہ جامع مسجد کے سلسلۂ وعظ میں یہ ایک خاص بات ہمارے ہوش کے زمانے کی ہے کہ ہم نے دیکھا کہ صرف "وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ"* پر تقریباً ایک برس تک بیان کرتے رہے، اور ہم نے سُنا کہ اِسی مسجد میں پہلے سفرِ کلکتہ کے موقعہ پر دو سال تک سورۂ "وَالضُّحٰی" کا وعظ بیان کیا اور وہ ختم نہ ہوئی۔ دوسری مرتبہ جب آئے اور وعظ کا سلسلہ

---

* خریداروں نے حضرت یوسف کو اونے پونے خرید لیا، اور وہ اُسے خریدنا بھی نفع کا سودا نہ سمجھتے تھے (آیت کا مفہوم)

شروع ہوا، تو "بسم اللہ" کو بطور آیت کے تلاوت کر کے دو سال تک اسی پر وعظ کہتے رہے۔ پھر سورۂ یوسف شروع ہوئی اور سات برس تک اس پر وعظ کہا، اور آدھی سے زیادہ نہ ہوئی۔

یہ بات نہ تھی کہ محض ایک سرسری اور ابتدائی تعلق پیدا کرنے کے لیے آیات کو استعمال کرتے ہوں، بلکہ سچ مچ اُن کا وعظ اول سے آخر تک اُنہی آیات پر ہوتا تھا اور حد درجہ وسعتِ تخیّل اور قوتِ اختراع و ابداعِ مطالب سے کام لیتے تھے۔ وہ طرح طرح کے بیانات اِنہی آیات سے متعلق کرتے تھے اور اِن میں کبھی علمی ترتیب ملحوظ رہتی تھی اور کبھی وقتی مقاصد کی ترتیب، مثلاً کچھ دنوں تک کسی آیت کے مواعظ میں تصوّف کا ذوق غالب رہا۔ پھر کچھ عرصے تک اُسی کے متعلق عام تفصیلات کا۔ پھر کبھی فقہ و حدیث کا ٹکڑا غالب رہا۔ لیکن عموماً ہر وعظ میں کچھ نہ کچھ عنصر تمام ضروری و مؤثر عناصر کا رہتا تھا، اور یہی چیز اُن کے وعظ کی حیرت انگیز تاثیر کا راز تھا۔ وعظ کو مؤثر بنانے والی چیز، وعظ کی صنّاعی نہیں ہوئی بلکہ اُس میں روح ڈالنے والی شے انسان کا قلبی ذوق ہوتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ اُن کو ایک خاص معاملے میں حد درجہ قلبی استغراق تھا، یعنی آنحضرت ؐ کے عشق و محبت میں، اور یہی وہ ذوق تھا، جو اُن کے تمام علمی و عملی ذوقوں کا مرکز و محور تھا اور اُن کے تمام مباحث کا اصلی عنصر اور اُن کے تمام افکار و تخیُّلات کی روح تھا، اور اسی لیے اُن کے وعظ میں بھی یہی قلبی ذوق، روحِ رواں کا کام دیتا تھا، جو اُن کے لفظوں میں پنہاں تھی، اور باوجود انتہا درجے کی سادگیِ بیان

کے سامعین کے دلوں پر جا کر تیر و نشتر کا کام دیتی تھی۔

عام طور پر واعظ مصنوعی تاثیر پیدا کرنے کے لئے کیسی کیسی تدبیریں کرتے ہیں کہ سامعین، اشک بار ہوں اور اُن پر رقت پیدا ہو، جو تمام واعظوں کو ہمیشہ مطلوب ہوتی ہے۔ اس کے لیے وہ کبھی نغمہ سرائی سے کام لیتے ہیں، کبھی لفاظی اور سخن سرائی سے، کبھی درد انگیز اشعار سُنائے جاتے ہیں اور پھر بھی مقصود حاصل نہیں ہوتا، لیکن اس بارے میں والد مرحوم کے وعظ کا کچھ عجیب حال تھا۔ وہ جو کچھ کہتے، پوری سادگی سے کہتے، لیکن سامعین پر جو اثر ہوتا تھا، اُس کی نظیر عام واعظوں کی مجالس میں نہیں ملتی۔ اُن کے وعظ میں لوگوں کے تاثر، رقت اور بے اختیار اشک باری کا جو حال ہوتا تھا، اُس کا بیان کرنا مشکل ہے۔

وعظ کا حیرت انگیز اثر

اُن کے وعظ میں ہمیشہ ایسا ہوا ہے کہ متعدد آدمی بے ہوش ہو گیے ہیں اور مجلس سے باہر لے جائے گیے ہیں۔ ہمیشہ ایسا ہوتا تھا کہ گریہ وزاری کی شدت سے سڑک پر چلنے والے ٹھٹک کر رہ جاتے تھے اور حیرت سے پوچھتے تھے کہ مسجد کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ روتے روتے لوگوں کی ہچکی بندھ جاتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ مجلس عزا برپا ہے اور گویا محرّم کا مہینہ ہے۔ مجھے خود یاد ہے کہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مجلس میں ایک اچھے موٹے تازے تندرست نوجوان نے ہمارے سامنے منبر کے آخری زینے پر لوٹتے ہوئے

جان دے دی! مرحوم کا نام نورالحق تھا اور والد مرحوم کے وعظ کا بہت شائق تھا۔ ہر جمعہ کو پنسل کاغذ لے کر منبر کے پاس بیٹھا کرتا اور نوٹ لیا کرتا تھا۔ ایک جمعہ کو جب کہ وہ ایک حدیث کا ترجمہ بیان کر رہے تھے اور ہر طرف گریہ وزاری جاری تھی، اُس نے چیخ ماری۔ پہلے کچھ دیر روتا رہا۔ پھر جب اُنھوں نے ایک شعر پڑھا تو دوبارہ چیخ کی صدا سُنائی دی اور وہ بیہوش ہوکر منبر پر گر پڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی اِس بے ہوشی کے عالم میں والد مرحوم کے قدموں کو پکڑنا چاہتا تھا، لیکن اِتنی سکت نہ رہی تھی، اور وہ آ کر منبر کے آخری زینے پر گر پڑا۔ اِس حالت میں لوگ اُسے باہر لے گیے اور ابھی لائے ہی تھے کہ اُس کی روح پرواز کر گئی۔

ایک ایسا ہی واقعہ محمد امین نامی ایک شخص پر بھی گزرا، لیکن وہ چند گھنٹے کے بعد پھر ہوش میں آگیا۔ یہ شخص ابتدا میں والد مرحوم کے بعض مخالفین کا معتقد تھا اور وعظ میں اِس لیے آتا تھا کہ یہاں کی باتیں مخالفین تک پہنچائے، لیکن وعظ سُن کر وہ خود اِس درجہ متاثر ہوا کہ بے ہوش ہوکر گر پڑا اور گھر پر پہنچنے کے بعد جب بہت دیر بعد ہوش آیا، تو دوسرے دن آکر والد مرحوم کے ہاتھ پر بیعت کی اور اپنے گزشتہ افکار و عناد سے معافی مانگی۔

شیعہ جماعتوں سے مقابلہ

اُن کی زندگی میں اِس طرح کے بکثرت واقعات ہمارے سامنے گزرے

اور بہتوں کے حالات ہم نے سنے۔ بمبئی، جو ایک طرح سے شیعہ جماعتوں کا نہایت طاقتور صدر مقام ہے، اس لیے کہ اگرچہ اثنا عشری شیعہ نہیں تھا لیکن دیگر اصناف کے شیعہ وہاں بہت طاقتور، تجارت پیشہ اور دولتمند ہیں، مثلاً خوجے اور بوہرے، جن میں پہلی جماعت، باطنیہ کی شاخ ہے اور دوسری اسماعیلیہ کی۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اُس میں یہ جماعتیں بہت طاقتور تھیں، کیونکہ انگریزی تعلیم نے ابھی تک قدیم مذہبی تعصبات پر فتح نہ پائی تھی اور اچھے اچھے انتظامی عہدوں پر انہی جماعتوں کے افراد فائض تھے۔ بمبئی میں اس زمانے میں ان کے خلاف کسی مخالفانہ کارروائی کا کرنا یہ معنی رکھتا تھا کہ صریح طور پر اپنے کو ہلاکت کی طرف لے جانا۔

لیکن ایک چیز جو والد مرحوم کی پوری زندگی میں نمایاں رہی اور جو بلا شبہ اُس خاندان اور سوسائٹی سے ورثے میں ملی تھی، جس میں اُن کا ابتدائی عہد بسر ہوا تھا، وہ اپنے اعتقاد و عمل اور اُس کے اعلان میں بالکل بےخوف اور بےباک تھے، اور یہ ہندستان کے باہر بھی ہر جگہ یکساں طور پر نمایاں رہی۔ اس سلسلے کے بعض واقعات سنیے:

بمبئی میں اس زمانے میں ایک بہت ہی طاقتور شخص، عبد العلی خاں سٹی انسپکٹر پولیس تھا۔ بمبئی میں اُس زمانے تک موجودہ پولیس کا نظام رائج نہ ہوا تھا، اور قدیم طریق انتظام کی طرح کوتوالی کا عہدہ قائم تھا، اور فی الحقیقت شہر پر کوتوال کی حکومت ہوتی تھی، جسے وہاں سٹی انسپکٹر کے نام سے پکارتے تھے۔

یہ شخص اِس درجہ خوفناک تھا کہ بڑے بڑے کرنہ (ڈپٹی) اُس کے یہاں جاتے اور اُس کی ملاقات کے لیے گھنٹوں انتظار کرتے تھے، کیونکہ اِنکی عزت و آبرو اُسی کے ہاتھ میں تھی۔ یہ شخص بہت ہی متعصب دغالی شیعہ تھا۔ اُس نے اِس زمانے میں ایک کتاب لکھوائی، جو صریح تبرّا سے بھری ہوئی تھی، اور اُس میں خلفائے ثلاثہ کو نام بنام لعنت کے ساتھ یاد کیا گیا تھا۔ یہ کتاب اُس نے چھپوائی اور صرف اپنی جماعت میں تقسیم کرائی، اور جیسا کہ ایسی کتابوں کا قاعدہ ہے، اپنے بچاؤ کے لیے اُس کے سرورق پر یہ بھی لکھ دیا تھا کہ کوئی سُنی اِس کا مطالعہ نہ کرے، لیکن دشنام دہی اور علانیہ تبرّا کے لیے نہ اخلاقاً اور نہ قانوناً یہ عذر مفید ہو سکتا تھا۔

ایک دن والد مرحوم، جمعہ کے دن نماز کے بعد فاتحہ میں مشغول تھے، اور منبر کی طرف وعظ کے لیے بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ ایک شخص نے اُن کو اِس کتاب کا ایک نسخہ دیا اور کہا کہ یہ کتاب حال میں تقسیم کی گئی ہے اور بعض سنّیوں تک اس دعوے کے ساتھ پہنچائی گئی ہے کہ اِس کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔

والد مرحوم نے منبر پر بیٹھے بیٹھے چند لمحوں کے اندر اِس پر سرسری نظر ڈالی اور پھر وعظ میں اس کتاب کا ذکر کرکے جہاں تک اس میں کوئی بات بحث و نظر سے تعلق رکھتی تھی، اُس کا رد کیا، اور جو حصہ دشنام و طعن کا تھا، اُس پر لوگوں کو غیرت دلائی کہ ایسی کارروائی علانیہ تمہاری موجودگی میں ہوتی ہے اور تم محض اپنے ذاتی مفاد کے خیال سے منھ نہیں کھولتے۔ انھوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ کتاب کی لوح پر فلاں آدمی کا نام بطور شایع کنندہ درج ہے،

اور یہ اِس معاملے کو اور زیادہ سنگین جرم بنا دیتا ہے۔ جو ایک عاملانہ عہدے پر مامور ہو، وہ اِس طرح کی فریقانہ کارروائی کرے۔

شام ہوتے ہوتے یہ بات تمام شہر میں پھیل گئی۔ عبدالعلی خاں نے بڑے دعوے سے کہا کہ آج تک کسی کو میرے خلاف زبان ہلانے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ بڑے بڑے کروڑ پتی میری مخالفت نہ کر سکے، اور اب یہ میری مخالفت پر آئے ہیں، تو میں جلد اس کا نتیجہ دکھلا دوں گا۔

چنانچہ اُس نے فوراً اپنے تمام ہتھیار و وسائل عمل میں لانا شروع کیے۔ اِدھر والد مرحوم نے شہر کے تمام سُنّی رؤسا کو جمع کیا، جن میں بڑی جماعت اُس وقت کے مشہور میمن سوداگروں کی تھی، اور اِن میں سربرآوردہ حاجی ناخدا رو گھے تھے، اور اِن لوگوں کو آمادہ کیا کہ اِس کتاب کے برخلاف کارروائی ہونی چاہیے، لیکن عبدالعلی کا اقتدار لوگوں پر اس طرح چھایا ہوا تھا کہ سب کے سب جی چرانے لگے، اور ناخدا رو گھے، جو کروڑوں روپیہ کے مالک تھے، منّتیں کرنے لگے کہ اِس معاملے سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔

اِس پر والد مرحوم نے کہا کہ جب محض ایک چھوٹے سے عہدے دار کے اقتدار کی بنا پر مجھے اظہارِ حق سے روکا جاتا ہے، تو اب میرے لیے کوئی چارہ بجز اِس کے نہیں رہا کہ اِس معاملے کو آخر تک پہنچا دوں، خواہ ایک شخص بھی میرا ساتھ نہ دے۔ جب تک میں اِس کتاب کی اشاعت نہ رکوا دوں گا، اُس وقت تک چین نہ لوں گا۔ چنانچہ اُنھوں نے چند شخصوں کی جانب سے کتاب کے مصنّف، پریس، اور عبدالعلی پر مذہب کی توہین کی نالش

دائر کر دی۔ یہ مقدمہ سال بھر ہوتا رہا، اور جو واقعات اِس کے سنے، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بڑے ہی معرکہ کا مقدمہ ہو گیا تھا۔ اِس طرف عبد العلی خاں اور بمبئی کے تمام کروڑ پتی خوجے اور بوہرے تھے اور تمام حکام اِس پر تُلے ہوئے تھے کہ حریف کو شکست دی جائے، اور دوسری طرف صرف والد مرحوم اور اُن کے چند ساتھی تھے۔ مقدمے کی پیشیوں پر پیشیاں ہوتی رہیں، اور ہر طرح کی بحثیں، شہادتیں اور عدالتی کارروائیاں جاری رہیں۔

اب یہ مقدمہ عبد العلی کی ذات سے بھی گزر گیا تھا اور اِس کو بمبئی کے تمام خوجوں اور بوہروں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ لاکھوں روپیہ کا فوراً چندہ کیا گیا۔ اِدھر عبد العلی نے جس کے ہاتھ میں تمام پولیس کا صیغہ تھا، ظاہری و باطنی کوششیں شروع کر دیں کہ والد مرحوم کا قیام بمبئی بلکہ ہندستان میں بھی دشوار کر دے۔ اُس نے مخالفت، دشمنی، اور ہلاکت و ایذا رسانی کی کوئی ایسی کارروائی نہیں ہے، جو نہ کی ہو، چھُرے باندھے ہوئے آدمی اِس تاک میں رہتے تھے کہ اگر موقعہ ملے تو حملہ کر دیں۔ وعظ کی مجلسوں میں کوشش کی جاتی تھی کہ دنگا و فساد کرا دے، اور فساد و امن شکنی کے بہانے سے یا تو وعظ روک دے اور یا گرفتار کرے۔ چند آدمیوں کو تیار کیا گیا تھا کہ جھوٹے مقدمے دائر کر دیں۔

والد مرحوم نے اُس وقت بمبئی میں زمین کا ایک ٹکڑا، پریل میں لیکر مسجد تعمیر کرنا شروع کی تھی، جو اب تک موجود ہے۔ جس شخص سے وہ زمین لی گئی تھی، اُس کو بھڑکا کے جھوٹی اور فرضی قانونی پیچیدگیوں کے مقدمے دائر

کرا دیے گئے تھے۔

اِن دنوں بمبئی میں خوجوں اور بوہروں کو جو عظیم الشان طاقت حاصل تھی، اُس کا اندازہ باہر کے لوگ نہیں کر سکتے۔ اِس کا ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ جب خود خوجوں کی جماعت میں تفریق ہوئی اور آغا خاں کی والدہ اور چچا نے آغا خاں پر مقدمہ کیا، اور ایک جماعت، اسماعیلیہ مذہب سے تائب ہو کر اثنا عشری ہو گئی، تو اُس کے دو آدمی، جو لیڈر تھے، اُن کو دو آدمیوں نے دن کے بارہ بجے سورج کی روشنی میں ہزاروں آدمیوں کے سامنے خنجروں سے مار ڈالا، یہ فدائیت کا وہی قدیم جذبہ ہے جو سب سے پہلے باطنیہ سے مصر و الموت میں ظاہر ہو چکا ہے اور جس سے ملک شاہ سلجوقی جیسے فرمانروا ہلاک ہو چکے ہیں!

والد مرحوم کے معتقدین اِس زمانے میں شب و روز اِس فکر میں رہتے تھے کہ یا تو اُن کو عارضی طور پر بمبئی سے چلے جانے پر مجبور کریں، یا کم از کم ضروری احتیاط عمل میں لانے پر رضامند کر لیں، یا انفصال مقدمہ تک مدعا علیہم سے عدم فساد و ایذا رسانی کے مچلکے لے لیے جائیں، لیکن والد کی استقامت و توکل کا یہ حال تھا کہ نہ تو وہ ایک لمحے کے لیے شہر سے باہر گئے، نہ اپنی حفاظت کے لیے عدالت سے اعانت چاہی، نہ کوئی اور احتیاط خاص عمل میں لائے۔ وہ راتوں کو حسب عادت جہاں کہیں آیا جایا کرتے تھے، جاتے آتے رہے۔ زیر تعمیر عمارت کی نگرانی کے لیے دوپہر کو جاتے اور بسا اوقات رات کے بارہ بارہ اور ایک ایک بجے واپس آتے تھے۔

اُس زمانے میں وہ علاقہ جہاں یہ مسجد واقع ہے، بالکل شہر کا بیرونی غیرآباد علاقہ تھا، اور بجز چند مِلوں کے اور کوئی آبادی اُس میں نہ تھی۔ وہاں سے آتے ہوئے ناگزیر طور پر بائی کلا واقع ہوتا تھا، جہاں عبدالعلی خاں اور اُسکے بعض خاص معاون و مددگار رہتے تھے، اور چونکہ اُن کو والد مرحوم کی آمد و رفت کا حال معلوم تھا، اس لیے یہ امر واقعہ ہے کہ اُن کے متعین کیے ہوئے آدمی شب کو وہاں پھرا کرتے تھے۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو خود شہر کی پولیس کا افسر اعلیٰ ہو، یہ بات کچھ بھی مشکل نہ تھی کہ ایک حادثے کو سنبھال لیتا اور اُس کا یہی ارادہ تھا۔ پھر لاکھوں اور کروڑوں رُپیہ کی پشت گرمی اُس کے ساتھ تھی۔

لوگوں نے والد مرحوم سے بے انتہا اصرار کیا کہ کم از کم اپنے دس بارہ خادموں کو اپنے ساتھ رہنے کا موقعہ دیں، اور یوں تو معمولاً ہمیشہ لوگ ہر وقت حاضر باش رہا ہی کرتے تھے، لیکن اب چونکہ لوگوں کا اصرار اِس خاص معاملے کی بنا پر تھا، اِس لیے اُن کو بھی کچھ ضد سی ہو گئی تھی۔ اور وہ بالکل تنہا رہنا چاہتے تھے۔ بارہا اُنھوں نے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے ہم لوگوں سے کہا کہ میں سمجھتا تھا کہ اگر لوگوں کو اپنے ساتھ رکھوں گا تو گو بظاہر عام حالت و معمول پر محمول کیا جائے گا، لیکن میرے دل میں تو یہی بات ہوگی کہ یہ میرے محافظ ہیں، اور اگر ایسا ہوا، تو پھر مجھے کیا حق ہے کہ خدا کی حفاظت و صیانت پر بھروسہ رکھنے کا دعویٰ کر سکوں۔

عجیب شجاعت

والد مرحوم کے خاص خادموں میں بنارس کے حافظ ولی اللہ تھے۔
اُن کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے۔ وہ بلاشبہ عادۃً ہمیشہ ساتھ رہا کرتے
تھے۔ اُن کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ ایک دن بارہ بجے شب کو جبکہ سڑک پر
بالکل سناٹا تھا، اور والد مرحوم آ رہے تھے، جب گاڑی، بائی کلا کے پُل پر چڑھنے
لگی، تو بائیں جانب کے میدان سے کچھ لوگ دوڑتے ہوئے آئے۔ اُن کی
تعداد سات آٹھ تھی، اور اُنھوں نے شور مچانا شروع کیا کہ گاڑی روکو، بالکل
اِس طرح گویا گاڑی کرایہ کی سمجھ کر کرایہ کے لیے بلا رہے ہیں۔ کوچ مین نے
گاڑی کی رفتار سست کر دی اور پکار کر کہا کہ گاڑی کرایہ کی نہیں ہے، لیکن
اُن میں سے دو آدمی جست کر کے گاڑی کے پائیدان پر چڑھ گیے۔ اور حافظ صاحب
کہتے تھے، میں نے اُن میں سے اُس شخص کو پہچان لیا جو میری جانب تھا۔
وہ عبدالعلی کا داماد تھا، جو نہایت شوریدہ پشت اور فسادی مشہور تھا۔
اُس نے چڑھتے کے ساتھ ہی بالکل فساد کے طریقے پر کہا، تم ہی وہ شخص ہو،
جو عبدالعلی خاں سے لڑنے آئے ہو! اور اِسی قسم کے بعض اور فقرے
فساد کے کہے۔ اُس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا اور پانچ چھ آدمی، جو اُس کے پیچھے
رہ گیے تھے، اب پہنچ گیے تھے۔

والد مرحوم، عادت کے مطابق دوپٹے کا پیچ چہرے کے گرد لپیٹے ہوئے
تھے۔ غالباً وسط عمر سے اُن کی یہ عادت تھی کہ پگڑی کے اُوپر سے ایک دوپٹہ

اوڑھ کر اور اُس کا پیچ اس طرح گردن میں ڈال لیتے تھے کہ اطراف پوشیدہ رہتے تھے۔ حافظ صاحب کہتے ہیں کہ مجھ پر نہایت ہی ہیبت طاری ہوگئی تھی اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ لوگ اس وقت ضرور فساد کریں گے، لیکن جوں ہی اُس شخص نے یہ الفاظ کہے، والد مرحوم نے دوپٹہ سر سے نیچے کر کے گردن پر ڈالا، اور ہاتھ میں سہارے کے لیے جو چھڑی تھی، اُسے اُٹھا کر اپنی بلند اور گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اُتر جاؤ!" یہ سُن کر پہلی مرتبہ میں تو وہ خاموش رہا۔ اُنھوں نے دوبارہ کہا کہ "اُتر جاؤ"۔ تیسری مرتبہ گاڑی کے اندر کھڑے ہو گئے اور چھڑی کا کنارہ اُس کے سینے پر رکھ کر دھکیلا اور کہا "سنتے نہیں ہو؟ میں کہتا ہوں اُتر جاؤ!" معاً وہ شخص اس قدر خوف زدہ ہوا کہ حافظ مرحوم کہتے تھے، آج تک مجھے اُس کی وہ خوف زدہ صورت نہیں بھولتی۔ وہ اس گھبراہٹ میں پشت کی طرف سے اُترا کہ چت گر گیا اور والد مرحوم نے کوچ مین کو گاڑی بڑھانے کا حکم دیا۔ اُس کے ساتھ جو کھڑے تھے، وہ بھی بُت کی طرح خاموش تھے۔ حافظ صاحب کہتے تھے کہ جب تک سڑک مڑی نہیں، میں مُڑ مُڑ کے دیکھتا رہا۔ وہ ٹھیک اُسی جگہ خاموش کھڑے تھے!

معلوم ہوتا ہے یہ واقعہ بھی اُن واقعات میں سے ہے، جن میں انسان کی اُس قوت کے فوری اور حیرت انگیز اثرات کا پتہ چلتا ہے، جس کو علم النفس کی اصطلاح میں قوتِ ارادی اور قوتِ نفوذ کہتے ہیں۔ ایسے موقعے پر کہ تنہا ایک کمزور شخص پر پانچ چھ تنومند مسلح آدمیوں نے حملہ کیا ہو اور وہ اچانک بلا ادنیٰ خوف و اندیشے کے بادشاہوں کی طرح حکم دے اور اس حکم کے انداز میں

کا نڈر اور بے پروا ارادہ کار فرما ہو، یقیناً ایک ایسی قوت ہے، جو ایسے طبایع کو مبہوت کر دینے کے لیے کافی ہے، جیسی قدرتی طور پر ایسی مفسد اور اِس وجہ سے منفعل طبیعتیں ہو سکتی ہیں۔

اِس سے بھی بڑھ کر اس سلسلے میں جو تعجب انگیز واقعہ ہے، وہ عبدالعلی خاں کے سب سے بڑے رفیق اور معین و مددگار، عبداللہ یوسف علی کا واقعہ ہے۔ یہ شخص بہت بڑا دولتمند رئیس تھا۔ عبدالعلی زیادہ تر اسی کی دولت پر مغرور رہا کرتا تھا۔ اِس مقدمے میں بھی وہ بڑی سرگرمی سے حصہ لے رہا تھا

اِس زمانے میں خاص طور پر کوشش کی جا رہی تھی کہ والد مرحوم کے وعظ کو رد کیا جائے، جواب علاوہ جمعہ کے وعظوں کے تقریباً روزانہ شہر کے مختلف محلوں میں ہوتے تھے۔ بمبئی کا قاعدہ ہے کہ جو محلے، شہر کی بڑی شاہراہوں سے الگ ہیں، اُن میں دس بجے کے بعد وہاں کے باشندے اپنی شادی بیاہ کی تقریبیں کیا کرتے ہیں بصورت یہ ہوتی ہے کہ سڑک ہی پر فرش و فروش یا کرسیوں کا انتظام ہو جاتا ہے۔ اور دونوں طرف سے راستہ بند کر دیا جاتا ہے اور ہزاروں آدمیوں کے اجتماع کے لیے عمدہ موقعہ نکل آتا ہے، اور ضروری آمد و رفت دوسرے راستوں سے ہونے لگتی ہے۔

یادگار مجلس وعظ

اِسی طرح والد مرحوم کے وعظ کی مجلسیں بھی ہوتی تھیں۔ بالآخر معاملہ یہاں تک پہنچا کہ عین اُسی محلے میں، جس میں عبدالعلی کے اِس سب سے

بڑے مددگار کا مکان تھا، وعظ کی مجلس قرار پائی۔ یہ بات اُن لوگوں کے لیے گویا سب سے بڑی تذلیل و شکست کی تھی کہ جس چیز کو روکنا چاہتے ہیں، وہ اب اُنہی کے سینے پر انجام پانے والی ہے، چنانچہ بڑی سرگرمی سے کوششیں شروع ہوئیں کہ جس طرح بھی ہو، یہاں وعظ نہ ہونے پائے۔ کمشنر بمبئی، عبدالعلی کے ہاتھ میں تھا، لیکن آخر میں اُس نے بھی صاف کہہ دیا کہ جب تک کوئی چھوٹی سی بھی بنیاد نہ ملے، میں اپنی ذمہ داری پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتا۔

تب اِن لوگوں نے یہ تدبیر کی کہ جلسے میں کوئی ہنگامہ کرا دیں، تاکہ مجلس برہم ہو جائے، اور بدامنی کے حیلے سے وعظ کا آئندہ سلسلہ بند ہو جائے، چنانچہ نہایت وسیع پیمانے پر انتظام کیا گیا۔ پولیس پہلے سے تیار کر دی گئی کہ جونہی کچھ شور سنو، فوراً گرفتاریاں شروع کر دو۔ کچھ لوگ متعین کر دیے گئے کہ عین جلسے میں جھگڑا برپا کریں اور کچھ لوگ اطراف میں رکھے گئے کہ آنے جانے والوں کو ٹوکیں اور اِس طرح فساد پیدا کر دیں۔ اِدھر کے لوگوں کو اِن وسیع تیاریوں کا حال ایک دو دن پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا، اور اُنھوں نے کوشش شروع کر دی کہ کسی طرح اُس دن مصلحتہً مجلس کو ملتوی کرا دیں، مگر والد مرحوم رضامند نہ ہوئے۔

یہ بھی ایک ایسا واقعہ ہے، جس سے تمام لوگوں پر ایسا اثر پڑا کہ یہ بھی اُن کی ایک کرامت تھی۔ اِن حالات کی وجہ سے چونکہ مجلس نے غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی تھی، اِس لیے اور زیادہ ہجوم ہوا، اور ناسک تک سے لوگ شرکت کے لیے آئے۔ حسب معمول والد جلسے میں گیے، تو محلے کے ایک سرے سے

دوسرے سرے تک مجلس بھر چکی تھی۔ اُنھوں نے حسبِ معمول بیان شروع کیا۔ اُدھر مفسدین نے اپنی تیاریاں عمل میں لانی شروع کر دیں، لیکن اُن کے بیان کی غیر معمولی تسخیر نے مجمع کو سنبھالے رکھا، اور اطراف میں جو شورشیں کی گئی تھیں، اُن سے مجلس برہم نہ ہو سکی۔

مجلس اِس طرح واقع ہوئی تھی کہ خان بہادر عبد اللہ یوسف کا مکان بالکل وسط کے محاذ میں پڑ رہا تھا، اور یہاں اُس نے اپنے مکان میں تمام انتظامات کر رکھے تھے۔ بہت سے لوگ حسبِ معمول اُس کے مکان کی نچلی منزل کے چبوترے پر بھی بیٹھے تھے۔ وہاں اُس نے آکر شور غل شروع کیا۔ اُسے پورا یقین تھا کہ جوں ہی لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یہاں مولانا کا کوئی مخالف ہے، تو جوش میں آکر حملہ کر دیں گے، یا کوئی اس قسم کی حرکت کر بیٹھیں گے اور اِس طرح وعظ کے موجبِ فساد ہونے کا ثبوت بہم پہنچ جائے گا، چنانچہ اُس نے اُن لوگوں سے، جو اُس کے چبوترے پر بیٹھے تھے کہا کہ "یہ مکّار کیا بک رہا ہے"؛ یہ سُن کر لوگ بہت بگڑے اور جھگڑا شروع ہو گیا۔

یہ مقام بالکل منبر کے محاذ میں واقع تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وسطِ مجلس خلفشار شروع ہو گیا۔ والد مرحوم اِدھر متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ اتنے میں ایسی آوازیں آئیں گو یا مار پیٹ ہو رہی ہے۔ والد فوراً منبر سے اُتر کر اُس مقام کی طرف بڑھے۔ دیکھا کہ ایک شخص کو لوگ مارنا چاہتے ہیں، اور عبد اللہ اُسے بچانا چاہتا ہے۔ اور اِس پر جھگڑا ہو رہا ہے۔

والد مرحوم کو جب لوگوں نے دیکھا تو خفیف سا وقفہ پیدا ہوا۔ اُنھوں نے واقعہ دریافت کیا۔ لوگوں نے عبداللہ کی طرف اشارہ کیا کہ یہ شخص آپ کی شان میں گستاخانہ کلمات کہتا ہے۔ مولانا نے اسی وقت عبداللہ کے کاندھے پر ہاتھ مارا اور کہا، یہ کس کا مکان ہے؟ اُس نے کہا، میرا ہے۔ اِنھوں نے کہا، میں اِسی مکان کے چبوترے پر وعظ ختم کرنا چاہتا ہوں۔ بے اختیار اُس کی زبان سے نکلا، بہت بہتر! والد اُسے کھینچتے ہوئے اپنے ساتھ سیڑھیوں پر لائے۔ اُسے اشارہ کیا کہ بیٹھ جاؤ اور خود بھی چبوترے کے کنارے بیٹھ گئے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے جہاں سے بیان چھوڑا تھا، پھر شروع کر دیا۔ مجلس دو گھنٹے تک جاری رہی اور اس سکون و خاموشی اور وجد و کیف کے ساتھ ختم ہوئی کہ اور کوئی مجلس اِس کیفیت کے ساتھ منعقد نہ ہوئی تھی۔

عبداللہ اُسی جگہ بیٹھا تھا، جہاں اُسے بیٹھنے کا اشارہ کر دیا گیا تھا۔ وہ شروع سے آخر تک بیان سنتا رہا، وعظ کے خاتمہ پر بے اختیار مولانا کے پاؤں پر گر پڑا اور سر رکھ دیا، اور چیخ چیخ کر رونے لگا اور اپنی خطاؤں کی معافی مانگنے لگا۔ مولانا ہر چند تسلّی دیتے تھے، مگر اس کا جوش گریہ نہ تھمتا تھا۔ اِسی حال میں وہ اُن کے ہمراہ مکان آیا۔ اُسی وقت بیعت کی اور بعد کو بمبئی کے رؤسا میں وہ سب سے زیادہ راسخ الاعتقاد مرید اُن کا تھا!

اِس حیرت انگیز واقعہ کا اثر حریفوں پر ایسا پڑا کہ بالکل مبہوت

ہو کر رہ گیے۔ عبداللہ یوسف سے ہر چند پوچھا جاتا تھا کہ یہ تم نے کیا حرکت کی ؛ لیکن اُس نے بجز اِس کے اور کچھ نہ کہا کہ جوں ہی اُنھوں نے آگر مجھ سے پوچھا کہ یہ تمہارا مکان ہے ؛ معاً میرے دل پر سخت دہشت طاری ہوگئی اور جب اُنھوں نے کہا کہ میں یہیں وعظ بیان کروں گا ، تو مجھے بجز تعمیل کے کوئی اور چارہ نظر نہ آیا۔ میرے تمام پچھلے ارادے فراموش ہو گیے اور جب میں وعظ میں بیٹھا اور بیان سنا ، تو میرے دل نے مجھے ملامت کی کہ میں اُن تمام معاصی میں مبتلا ہوں ، جن کو وہ بیان کر رہے ہیں۔

مخالفوں کی شکست

یہ دو واقعے جو پے در پے وقوع میں آئے ، اِن سے عام طور پر اصل مقدمے پر بھی بہت بڑا اثر پڑا ، اور جو لوگ پہلے خوف و کمزوری میں مبتلا تھے ، وہ بھی علانیہ کھڑے ہو گیے۔ بالآخر حریفوں کی تمام طاقت در مخالفانہ کوششیں اور حاکمانہ رسوخ بیکار ہو گیا ، اور جب اُنھیں معلوم ہو گیا کہ اُن کی کوئی کارروائی کارگر نہ ہوگی ، تو اب حالت یہ ہو گئی کہ اُن میں سے ہر شخص اپنی حفاظت کی فکر میں مضطرب ہو گیا۔

عدالت سے حریفوں کو توقع تھی کہ اُن کے موافق فیصلہ کرے گی ، لیکن نتیجہ بالکل برعکس نکلا اور معلوم ہو گیا کہ دعویٰ اُن کے لیے نہایت خطرناک صورت اختیار کر رہا ہے۔ عبدالعلی ، شہر کا ایک ذمہ دار حاکم تھا۔ خود اُس کا اِس طرح کی کارروائی کرنا اور اُس کے نام سے ایک ایسی اشتعال انگیز اور

توہین مذہب کی کتاب کا چھپنا، کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اب نہ صرف اُس کی نوکری کا سوال تھا بلکہ سزا بھی ناگزیر تھی۔

بالآخر جب ہر طرف سے مایوسی ہو گئی، تو اُس نے کمشنر کو بیچ میں ڈالا اور کمشنر نے حاجی ناخدا ارد گے وغیرہ ممتاز امراء کے ذریعہ سے کوشش شروع کی کہ کسی طرح صلح ہو جائے اور مقدمہ اُٹھا لیا جائے۔ والد مرحوم کی طبیعت کا استغنا، زبان زد خلائق تھا، اِس لیے کسی کو اِس کی جرأت تو نہ ہو سکی کہ خود اُن کو کوئی مالی طمع دلانے کا خیال کریں، لیکن جن لوگوں کی جانب سے عدالت میں دعویٰ کیا گیا تھا، اُن کے لیئے ایک معتدبہ رقم کی تحریص کوئی کم تحریص نہ تھی۔ یہ بھی کی گئی، مگر سود مند نہ ہوئی۔

جب کمشنر کی جانب سے ملاقات کا بہت اصرار ہوا، تو والد مرحوم نے ملنا منظور کر لیا۔ چنانچہ وہ آیا اور اُن کی ڈاڑھی کو چھو کر کہا کہ اِس شخص سے بہت بڑا قصور ہو گیا ہے، اور عمر بھر کے لیے تباہ ہو رہا ہے۔ آپ خدا کے لیئے اُسے بچا لیجیے۔ والد نے کہا یہ کوئی میرا ذاتی معاملہ نہیں ہے۔ مذہبی حقوق کا معاملہ ہے اگر وہ اب بھی غرور و تبختر سے باز آ جائے، غلطی کا اعتراف کرے، اور کتاب کے تمام نسخے ہمارے حوالہ کر دے، اور آئندہ کے لیے اقرار کرے، تو مجھے اصرار کی وجہ نہیں ہے۔

لیکن اقرار اور کتابوں کی حوالگی، اِن دونوں باتوں کے بعد تو ہمیشہ کے لیے اِس پورے فریق کی بات جاتی تھی، اِس لیے کمشنر کے ذریعہ بہت کوشش کی گئی کہ یہ دونوں باتیں نہ ہوں۔ آخر میں کہا گیا کہ کتاب بھی حوالے کر دی جائیگی

اور تمام متعلقین کتاب تمہارے سامنے آکر وہ سب کریں گے، جو تم کہو گے، لیکن عدالت میں کسی تحریری اعتراف کے لیے نہ کہا جائے۔ اِس طرف کے تمام معزز اشخاص بھی کمشنر کے ہم زبان تھے، لیکن والدِ مرحوم رضامند نہ ہوئے اور فرمایا، اِن لوگوں نے میری ذاتِ خاص کا کوئی قصور نہیں کیا ہے۔ جس کے لیے میں اِن سے معافی طلب کروں۔ قصور، مذہب و جماعت کا ہے، اور جماعت ہی کے سامنے اُس کا اعتراف بھی ہونا چاہیے۔

بالآخر اُنھیں یہ سب کرنا پڑا۔ مدعا علیہم نے عدالت میں درخواست دے دی کہ باہمی ثالثی کے ذریعہ جو کارروائی طے ہوئی ہے، اُس کے مطابق ہم معافی مانگنے، آیندہ کے لیے کتاب کی اشاعت بند کرنے، اور تمام نسخوں کے حوالے کر دینے کے لیے تیار ہیں۔ چنانچہ مدعیوں کی طرف سے بھی منظور کر لیا گیا۔ معافی نامہ، عدالت میں داخل کر دیا گیا۔ سترہ سو نسخے کتاب کے حوالے کر دیے گیے، جن کو پتھروں کے ساتھ باندھ کر سمندر میں غرق کر دیا گیا اور معافی نامہ اخبارات میں شایع ہو گیا۔

محبتِ اہلِ بیت

یہاں ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ اتفاق سے والدِ مرحوم اور اُن کے جد کے دو واقعے ایسے بیان کیے گیے ہیں، جن کا تعلق شیعوں کے ساتھ ہے، لیکن اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اِس بارے میں وہ کوئی خاص تعصب یا غیر معمولی کد رکھتے تھے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ یہ دو واقعے اِس طرح کے پیش آگیے اور اس میں زیادتی چند شیعہ اشخاص کی جانب سے تھی، ورنہ عام طور

پر اس بارے میں اُن کا مسلک بہت غیر متعصب اور صُلحِ کُل تھا، حتیٰ کہ وہ محبتِ اہلِ بیت کی وجہ سے ظاہریں سُنّی علما میں بعض اوقات حدِ اعتدال سے مُتجاوز شمار ہوتے تھے۔

اسلام کے اندرونی فرقوں میں اُنھیں جس قدر کاوش تھی، وہ صرف وہابیوں سے تھی، اور اُس کا سبب وہ صحبت ہے، جس میں غدر سے پہلے اُن کا ابتدائی وقت صرف ہوا تھا۔ اتفاق سے اُن کے اساتذہ بھی وہی تھے جنھیں اِس بارے میں بہت تشدّد تھا۔ اُن کے ہم درس بھی وہی لوگ تھے، جو آگے چل کر اِس بارے میں بہت سخت ثابت ہوئے۔

اِس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ اپنی تمام خاندانی باتوں میں اپنے جدِ مرحوم سے فیض یاب ہوئے تھے۔ اور مولانا اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحی مرحوم سے رنج کی وجہ سے اُن کا بھی بڑا وقت وہابیوں کی مخالفت ہی میں صرف ہوا۔ مکّہ گئے اور وہاں بھی اُس وقت سب سے بڑا چرچا یہی تھا۔ نجدیوں کا حملہ ابھی پُرانا نہیں ہوا تھا اور بہت سے پولیٹکل اسباب بھی ایسے تھے، جن کی وجہ سے عرب و تُرک، دونوں وہابیوں سے سخت تعرّض و نفرت رکھتے تھے۔ اِن اسباب سے رفتہ رفتہ والد مرحوم کے اندر بھی یہ جذبہ قوی ہوتا گیا، اور بالآخر اُن کی تقریر و تحریر کا سب سے بڑا موضوع بن گیا۔ شیخ احمد دحلان نے "الرد علی الوہابین" لکھی۔ وہ بھی فی الحقیقت والد مرحوم کے خیالات کا عکس ہے۔

شیعوں سے اُن کو کوئی غیر معمولی خصومت نہ تھی۔ اِس میں شک نہیں کہ وہ اپنے عقائد میں نہایت راسخ الاعتقاد حنفی تھے اور نسب کے اعتبار

سے صدیقی تھے، لیکن چونکہ مخالفت کا رجحان ایک جانب ہو چکا تھا، اس لیے دوسری جہتوں کے لیے کوئی قوی جذبہ باقی نہ رہا تھا۔

علاوہ بریں ایک چیز، جو اُن کی طبیعت میں بچپن ہی سے راسخ ہو گئی تھی، اور آخر تک باقی رہی، وہ وہی مذکور الصدر ذوقِ محبتِ اہلِ بیت کا تھا۔ اُن کی تصنیفات سے بھی یہ چیز جا بجا ٹپکتی ہے اور اُن عربی قصائد سے بھی، جو اہلِ بیت کی مدح میں ہیں۔ وہ اس درجہ مؤثر ہیں کہ واقعی اُن کے دلی جوش کا اثر تو معلوم ہوتے ہیں۔

وعظ میں ذکرِ رسالت کے بعد جب کبھی اہلِ بیت کا ذکر آجاتا، تو اُن کے استغراق و محویت کا کچھ عجب حال ہو جاتا تھا کہ جس طرح سال کے مختلف ایام میں وقت کی مناسبت سے بیان کے لیے موضوع منتخب کرتے تھے، اُسی طرح محرم میں ذکرِ شہادت خاص طور پر بیان کرتے تھے، علی الخصوص عشرے کی شب کو ذکرِ شہادت پر جو بیان ہوتا تھا، وہ نہایت عجیب ہوتا تھا۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ اُن کے سادہ بیان میں جس قدر گریہ و بکا ہوتی تھی، اُتنی لکھنؤ کی بڑی بڑی مجالسِ عزا کو بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔

علما کو ان طریقوں سے اتفاق نہ تھا۔ وہ مثل دیگر مجلسی تعیّنات کے اس اختصاص کو بھی بدعت قرار دیتے تھے اور اس طرح کے غلو کو ایک طرح کے مخفی تشیّع سے تعبیر کرتے تھے، جو علمائے اہلِ سُنّت میں بھی غیر محسوس طور پر پھیل گیا ہے۔ مگر والد مرحوم اپنے طریقے پر بہت مصر تھے۔ انہی کے بیان سے یہ بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ اہلِ سنّت میں اس طرح سے ذکرِ شہادت کا

بیان کرنا، شاہ عبدالعزیز نے شروع کیا تھا، اور یہ بھی منجملہ اُن رسمی معاملات کے ہے، جن کو وقت وعصر سے متاثر ہو کر شاہ صاحب نے اختیار کر لیا تھا، حالانکہ اُن کے والدِ بزرگوار کا مسلک اِن چیزوں کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔

چونکہ والد مرحوم اپنے وعظ وغیرہ تمام امور میں اپنے نانا کے مسلک پر ہمیشہ چلتے تھے، اور وہ شاہ صاحب کے شاگرد تھے۔ اِس لیے والد کہتے تھے۔ کہ میرا جو اندازِ بیان واقعۂ شہادت میں ہے، وہ بجنسہ وہی ہے، جو میرے جد کا تھا، اور وہ جو کچھ بیان کرتے تھے، وہ تمام تر شاہ صاحب کے وعظ کی ترجمانی تھی۔

افسوس ناک واقعہ

ایک افسوس ناک واقعہ اِس سلسلے میں یاد آجاتا ہے۔ والد مرحوم جب دوسری مرتبہ کلکتہ آئے اور وعظ کا سلسلہ جامع مسجد میں شروع کیا، تو محرم میں ذکر شہادت بھی ہوتا تھا، اور عشرے کی شب کو خاص مجلس ہوا کرتی تھی۔ اُس زمانے میں ایک اچھے مولوی، محمد صدیق سندھی، کلکتے میں تھے اور پکے حنفی تھے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے ایک فتویٰ شایع کیا اور لکھا کہ اِس طرح سے ذکر شہادت کرنا، شیعوں کا طریق ہے اور منجملہ بدعات کے ہے، اور حد سے زیادہ گریہ وزاری کرنا، وہ نوحہ وبین ہے، جو عرب جاہلیت میں رائج تھا اور جس سے شریعت نے منع کیا ہے۔ جوشِ منع میں آکر کچھ سخت الفاظ بھی لکھ دیے تھے۔ اتفاق سے اِس کے بعد کے جمعہ کو شب

دستور والد مرحوم اپنا وعظ بیان کر رہے تھے اور اس فتوے کا ذکر کر رہے تھے۔ مولوی صاحب بھی اپنے فتوے کا اثر دیکھنے کے لیے مجلس میں آئے تھے اور سقفِ مسجد کے جھروکے میں بیٹھ کر بیان سُن رہے تھے۔ جب وعظ ختم ہوا تو عصر کی نماز کے لیے وہ حوض پر وضو کرنے لگے۔ اتنے میں کچھ لوگ آئے اور اُن کو پہچان کر کہا کہ یہی وہ صاحب ہیں جنھوں نے فتویٰ شایع کیا ہے۔ لوگ اُس وقت اسی فتوے کا ذکر سُن کر آئے تھے۔ وہ اس درجہ جوش میں آگیے کہ مسجد کے احترام کا بھی لحاظ نہ رکھا اور اس غریب کو بے تحاشہ مارنے لگے۔ جوں جوں مجمع بڑھتا جاتا تھا، اس بے چارے کی ہلاکت بھی قریب ہوتی جاتی تھی۔ والد مرحوم کا قاعدہ یہ تھا کہ وعظ ختم ہونے کے بعد تقریباً آدھ گھنٹہ لوگوں سے مصافحہ کرنے میں لگ جاتا تھا اور بمشکل مسجد کے ہال سے نکل سکتے تھے، چنانچہ وہ ابھی مسجد ہی میں تھے۔ جب باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ یہ واقعہ ہو رہا ہے۔ اُنھوں نے لوگوں کو روکنا شروع کیا، لیکن جوش کا یہ حال تھا کہ اُن کے روکنے کا اثر بھی مارنے والوں تک نہ پہنچ سکا۔ آخر بمشکل لوگوں کو چیرتے اور ہٹاتے ہوئے خود بڑھے اور مولوی کو پکڑ کر اپنے آگے بڑھایا اور موذن سے کہا کہ اقامت شروع کرے۔ وہ شخص اس وقت بے دم ہو رہا تھا۔ خود صف کے بالکل کنارے اُس کے پاس کھڑے ہوئے اور اُس کے کان میں کہا کہ جوں ہی نماز شروع ہو چل دینا، چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا، اور اس طرح اُس کی جان بچی، اور وہ اسی شب کو بمبئی کو روانہ ہو گیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان رسمی چیزوں کا عوام پر کس درجہ اثر ہوتا

ہے، اور جب علما بھی اس میں اہتمام شروع کر دیں تو پھر دین و اسلام کی سب سے بڑی چیز رہ ہی جاتی ہے اور جاہلانہ جوش کے ساتھ مِل کر ویسی ہی صورت اختیار کر لیتی ہے، جیسی اِس مظلوم اور بے گناہ مسافر کو پیش آئی۔

اِس کے بعد وہ شخص مکہ معظمہ چلے گئے تھے اور برسوں کے بعد ۱۹۰۵ء میں جب میں وہاں گیا، تو مجھ سے ملے اور خود ہی یہ واقعہ بیان کیا۔ مجھے جس درجہ افسوس اور ندامت اُنھیں دیکھ کر ہوتی تھی، بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے اُن کو بہت ہی صالح و متقی پایا۔

بمبئی میں مسجد کی تعمیر

اس سفر کے بعد اگرچہ اُن کا (والد) ارادہ برابر واپسی کا رہا۔ لیکن یہاں کے علائق بڑھتے ہی گیے۔ بارہا کتابیں صندوقوں میں بند کی گئیں۔ سامان درست کیا گیا، مگر پھر یہاں کے لوگوں کا سخت اِلحاح، التوا کا باعث ہو جاتا تھا بالآخر ۱۹۰۲ء میں بمبئی گیے، لیکن وہاں پہنچنے کے بعد معتقدین کا ہجوم ایسا شروع ہوا کہ سال بھر تک مہلت نہ ملی۔ پھر اور وقتًا دوسرے سال گئے گیے، لیکن زیادہ قیام نہ ہو سکا، کیونکہ سفر بغداد کے بعد اُنھوں نے بمبئی میں ایک قطعۂ اراضی خرید کر مسجد تعمیر کی تھی، اور اُس کے ساتھ ایک بہت بڑا احاطہ خام عمارت کا کرایہ کے لیے بنایا تھا، جس میں زیادہ تر غربا رہتے تھے اور مجموعی طور پر ڈیڑھ دو سو سے زیادہ ماہوار کی آمدنی نہ تھی۔ برسوں کے بعد یہ علاقہ نہایت آباد اور قیمتی ہو گیا تھا، چنانچہ بمبئی آکر اُنھوں نے اِس کی تعمیر کا ارادہ

گیا، اور مسجد و عمارت کے نقشے تیار بھی ہو گیے تھے، لیکن اُن کا ارادہ یہی تھا کہ خود مکہ میں ٹھہر جائیں اور میرے بڑے بھائی کو، جو اُس وقت تک زندہ تھے، بمبئی میں تعمیر کے واسطے بھیجیں، مگر چونکہ اُنھیں معلوم تھا کہ بلا اُن کی ذاتی موجودگی کے یہ کام عمدہ طور پر انجام نہ پائے گا۔ بڑے بھائی کی طبیعت لااُبالی اور وارستہ واقع ہوئی تھی اور خود میری عمر بہت کم تھی، اور واقعی ہم لوگوں سے یہ کام نہ ہو سکتا تھا، اِس لیے اُنھیں پھر بمبئی آنا پڑا۔ اب فی الحقیقت اُنھیں مشیّتِ الٰہی ہی لا رہی تھی، تاکہ ہندستان ہی کی سرزمین میں وہ مدفون ہوں۔ اُن کے بمبئی آنے سے لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی، کیونکہ اِس کی امید نہ تھی۔

اب اُنھوں نے مسجد و مکانات کی تعمیر کا کام شروع کیا، اور ابتدائی بنیاد سے لے کر آخر تک اپنی ذاتی نگرانی اور معائنے اور روزانہ کی موجودگی میں تمام عمارتیں تیار کرائیں۔ اُس وقت ہم دونوں بھائی غیر حاضر تھے اور عراق چلے گیے تھے۔ ہم دونوں کا یہ سفر اُن کی مرضی کے خلاف ہوا تھا، لیکن حد درجہ شائق پا کر خاموش ہو گیے تھے۔ مجھے اِس خیال سے ہمیشہ ندامت ہوتی ہے کہ تعمیر کے کام میں، جو اُن کے لیے یقیناً نہایت تکلیف دہ تھا، ہم نے کوئی اعانت نہ کی، حالانکہ وہ اپنی عمر کے آخری سالوں میں باوجود ضعف و نقاہت کے یہ سب ہمارے ہی لیے کر رہے تھے!

ابھی مکان تیار ہوا ہی تھا کہ بھائی بغداد سے واپس آئے، مگر نہایت سخت مہلک مرض کی حالت میں۔ اُن کو ذات الجنب کی ابتدا ہو چکی تھی۔

بمبئی میں بہت علاج کیا گیا، مگر کچھ مفید نہ ہوا۔ پھر خیال ہوا کہ ہیموپیتھک علاج کیا جائے۔ اس کا بہترین انتظام صرف کلکتے میں ہی تھا، چنانچہ اس طرح وہ پھر کلکتے آئے۔ یہاں ایک ماہ کے بعد بھائی کا انتقال ہوگیا۔

اس واقعے کا اُن کے قلب پر بہت ہی صدمہ ہوا، اور اس وقت سے اُن کے آخری ایام کی افسردگی شروع ہوگئی، تاہم صبر و تفویض طبیعت میں اس قدر تھا کہ بجز حادثے کے عین موقعے کے نہ تو کبھی اُن کا کوئی آنسو بہا اور نہ کبھی اُن کا تذکرہ کیا۔

وفات

یہاں پھر معتقدین کے اصرار و الحاح نے روک لیا اور تقریباً دو سال تک قیام کے بعد ۱۹۰۸ء میں یہیں انتقال کیا۔

مرض الموت تقریباً دو ہفتے رہا۔ اس سے پہلے وہ بالکل تندرست تھے۔ اس موقعے پر میں پونا میں تھا۔ خبر ملتے ہی کلکتہ آیا اور میرے پہنچنے کے چند گھنٹوں بعد انتقال ہوا۔ آخر وقت تک ہوش حواس بالکل قائم تھے۔ شناخت وغیرہ میں بالکل فرق نہ آیا تھا۔ عین وفات کے وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے تک مجھ سے باتیں کرتے رہے اور ضروری وصایا فرماتے رہے۔ اس کے بعد اُنھوں نے کہا کہ میرے پیچھے سے تکیہ ہٹا دو۔ ضعف اس درجہ تھا کہ خود حرکت نہ کر سکتے تھے۔ جب وہ لیٹ گیے تو حافظ ولی اللہ مرحوم نے سورۂ یٰسین پڑھنا شروع کی۔ اُنھوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا،

جس کا بظاہر مطلب یہ تھا کہ روک دو۔ اِس پر تعجب ہوا، مگر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اُن کے لب ہل رہے ہیں۔ ایک لمحے بعد کسی قدر بلند آواز سے خود پڑھنا شروع کیا اور معلوم ہوا کہ وہ خود ہی سورہ یاسین پڑھ رہے ہیں، چنانچہ ہم اُن کی برابر آواز سنتے رہے اور جب اِس آیت پر پہنچے "یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ" تو آنکھیں بند کرلیں اور خود دونوں گھٹنے دراز کردیے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد جسم کو ایک سخت لرزہ ہوا اور جاں بحق تسلیم ہوگیے۔

یہ عجیب بات ہے کہ کوئی خاص حالت، احتضار کی ان کی وفات میں نظر نہ آئی۔

کلکتے میں شاید ہی اتنا مجمع کسی واقعہ پر ہوا ہو، جتنا اُن کے جنازے پر ہوا۔ ظہر کے وقت یہ واقعہ ہوا اور مغرب کے بعد جنازہ اُٹھایا گیا، لیکن اِن چند گھنٹوں کے اندر ہی نہ صرف شہر بلکہ اطراف تک خبر پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ جنازہ اُٹھنے کے ساتھ ہی تمام سڑکیں اور ناکے بند ہوگیے۔ گاڑیوں کی نقل و حرکت رُک گئی، اور حالت یہ ہوئی کہ جنازہ گھنٹوں تک صرف لوگوں کے ہاتھوں ہی پر جاتا رہا۔ کاندھے پر رکھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ لوگوں کی کثرت کا یہ حال تھا کہ رات کے بارہ بجتے بجتے پانچ مرتبہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ ایک مرتبہ جامع مسجد میں اور چار مرتبہ قبرستان کے میدان میں، لیکن چھٹی جماعت کے لیے پھر ہزاروں نئے آدمی آگیے۔ بالآخر بڑی سخت کوشش سے مزید التوا کو روکا اور دفن کیے گیے۔

اُنھوں نے اپنی زندگی ہی میں والدہ مرحومہ کے مدفن پر ایک مقبرہ تعمیر کیا تھا، جو ایک عجیب طرح کی چھوٹی سی عمارت ہے۔ اور اُن کے ذہن کی اختراع کا ایک عجیب نمونہ ہے۔ اُس کا گنبد سنگ مرمر کا ہے، لیکن نیچے نہ کوئی بنیاد ہے اور نہ کوئی عمارت۔ محض لوہے کی جالیوں کا گھیرا ہے اِس میں ایک اور قبر کی جگہ باقی رکھی تھی، چنانچہ اُسی میں دفن کیے گیے۔

اُن کے انتقال پر دنیا کے دور دراز حصوں سے تعزیت کے جو پیام آئے، اُن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اُن کا حلقۂ ارادت کتنی دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ جنوبی افریقہ، ٹرنسوال، زنجبار، سیلون، برہما، جاوا، سنگاپور، ہانگ کانگ، حجاز، شام، مسقط وغیرہ وغیرہ ان تمام مقامات میں جب اطلاع پہنچی، تو بعض مقامات میں نماز جنازہ غائب پڑھی گئی، جیسے حرم کعبہ میں، اور بعض میں تعزیت کے جلسے ہوئے، جیسے ٹرانسوال میں، اور اُن کی رودادیں اُس وقت کے تمام اخبارات میں شایع ہو گئیں۔ مقامی اینگلو انڈین اخبارات نے اعتراف کیا تھا کہ اِن کے جنازے میں جو ہجوم تھا، اُس سے اُن کے ایک ایسے مخفی اثر کا پتہ چلتا ہے، جس سے لوگ بالکل بے خبر تھے۔

عادات وخصائل

اُن کے بہت سے عادات وخصائل ایسے تھے، جو قابل ذکر اور گزشتہ سوسائٹی کی یادگار ہیں۔ مثلاً پابندئ اوقات۔ اُن کی زندگی کے

تمام اوقات اِس درجہ منتظم تھے کہ نشست و برخاست، اکل و شرب، ملاقات وصحبت، تحریر و تقریر، اِن تمام باتوں کے لیے جو اوقات قرار پاگیے تھے۔ اُن میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی۔ ہم لوگ اُن کے اوقات سے گھڑی کی طرح وقت معلوم کرتے تھے اور جب کبھی دونوں میں اختلاف ہوتا، تو گھڑی کو غلط سمجھتے تھے:

صبح ٹھیک تین بجے وہ اُٹھتے اور اِس میں ایک منٹ کا بھی کبھی فرق نہ ہوتا تھا۔ پھر تین بجے سے صبح صادق تک اُن کا قاعدہ تھا کہ جائے نماز ہی بیٹھے رہتے، اور نوافل اور دو رکعات صبح کے بعد نماز فرض کے انتظار میں رہتے۔ اس اثنا میں یا تو کچھ بلند آواز سے پڑھتے اور یا خاموش غنودگی کی سی حالت میں رہتے۔ البتہ صبح کی نماز اس قدر اسفار میں پڑھتے کہ ادھر سلام اور ادھر آفتاب طلوع ہوتا۔ اسکے بعد آفتاب کی بلندی تک جائے نماز ہی پر رہتے اور اشراق پڑھ کے بطور ناشتے کے صرف مکھن اور چند بادام کھاتے، اور پھر تحریر و تصنیف میں مشغول ہو جاتے۔

دس بجے صبح کا کھانا کھاتے۔ اور اس کے بعد اُن آدمیوں سے ملتے، جن سے خاص طور پر ملنا مقصود ہوتا۔ دوپہر کو کسی قدر قیلولہ کرتے اور پھر ظہر کی نماز پڑھ کے یا تو ہم لوگوں کو سبق دیتے، اور جب ہم دوسروں سے پڑھنے لگے تھے تو پھر ہمارا سبق سنتے، یا کسی دن اِس طرح کی کوئی بات نہ ہوتی، تو جب بھی ضروری ہوتا کہ عصر تک اُن کے حضور میں بیٹھے رہیں۔ یہ بھی گویا ایک پوری تعلیم تھی، جس میں کتاب سے زیادہ معلومات و تربیت حاصل ہوتی تھی۔

اِس کے بعد عصر پڑھتے اور پھر گھنٹہ آدھ گھنٹہ عام طور پر لوگوں سے ملتے، لیکن آخر عمر میں یہ عام صحبت بند ہو گئی تھی۔ مغرب کے بعد پھر اُن لوگوں سے ملتے، جن سے خاص طور پر اِس شب کی ملاقات کا تعیّن پہلے سے ہو چکا تھا۔ عشاء کی نماز عموماً موجودہ اشخاص کے ساتھ ہوتی۔ نماز کے بعد جو لوگ خاص طور پر ذکر و شغل کرتے تھے، اُن کو لے کر حلقے میں بیٹھتے تھے۔ ہم لوگوں کو بھی، جب کہ کچھ بڑے ہو گئے تھے، بالالتزام اِس میں شرکت کرنے کا حکم تھا۔ اِس میں کبھی تو خاص طور پر ارشاد و تزکیۂ باطن کے متعلق زبانی تعلیم دیتے تھے، کبھی بعض اقسامِ ذکرِ جہر کی مشق کراتے، کبھی ذکرِ خفی اور کشادگیٔ لطائف کی صحبت جاری رہتی تھی، اور کبھی محض خاموش حلقہ ہوتا تھا، اور ترقی یافتہ اشخاص کو کچھ دیر تک توجہ دیتے تھے۔ اُس وقت کی صحبت اِس درجہ پُر اثر اور ایک حد تک پُر رعب ہوتی تھی کہ اِس کا اثر مدتوں دل سے نہ جاتا تھا۔

ہم لوگوں کا احساس اس وقت یہ تھا کہ اِتنی دیر تک اُن کی تمام باتیں منقلب ہو جاتی ہیں، حتیٰ کہ ہم کو ایسا نظر آتا تھا کہ اُن کا چہرہ بھی منقلب ہو جاتا ہے، چنانچہ ہم اِس پر پورا یقین رکھتے تھے!

گیارہ بجے اُٹھ کے وہ اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے اور سونے سے پہلے سیر بھر دودھ پیا کرتے تھے۔ اِس کے بعد آدھ گھنٹے تک اپنے گزشتہ و موجودہ احباب اور ارادت مندوں کے لیے دعا مانگتے تھے۔ بسا اوقات ہم نے لیٹے لیٹے اُن کی دعائیں سُنی ہیں۔ وہ نام بنام سب کا ذکر کرتے تھے، اور یہ وہ لوگ تھے، جن سے اُن کو محبت رہی تھی، یا جنہوں نے اُن کے

ساتھ نیک سلوک کیا تھا۔ بلا اِس دعا کے وہ کبھی تکیے پر سر نہ رکھتے تھے۔

اوقات کی پابندی کا یہ حال تھا کہ اُن سے علائق رکھنے والے اشخاص بھی اِس بات کے عادی ہو گیے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ ملاقات کے اوقات کے علاوہ ایک لمحے کے لیے بھی کسی شخص سے ملیں، خواہ کیسی ہی ضرورت کیوں نہ پڑ جائے۔ مثلاً صبح کے وقت تقریباً محال تھا کہ کوئی شخص، خواہ وہ کیسا ہی معزز ہو، اُس سے ملیں۔ اکثر اوقات نئے لوگ آتے تھے اور ناواقفیت کی وجہ سے خیال کرتے تھے کہ اُن کا غرور و تجبّر ہے۔

خاص طور پر تنہائی میں جو لوگ ملنا چاہتے تھے، اُن کے لیے ضروری تھا کہ ایک دن پہلے سے آکر اور خادم کے ذریعے سے خبر دے کر وقت معین کرالیں۔ بجز اِس صورت کے یکایک آکر ملنا محال تھا۔ حافظ ولی اللہ مرحوم کا یہ کام تھا کہ یادداشت کی ایک کتاب رکھتے تھے اور ملاقات کی یادداشتیں نوٹ کر لیتے تھے۔ مغرب سے فارغ ہو کر وہ عرض کر دیتے تھے کہ آج فلاں فلاں آدمی سے وعدہ ہے۔

اِس بارے میں اُن کی پابندیوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا گویا دربارِ شاہی کی پابندیاں ہیں، جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتیں کیسی کیسی مشکلیں اور رکاوٹیں پیش آئی ہیں لیکن اِن پابندیوں میں کبھی فرق نہیں پڑا ہے۔ باہر کے قیام اور سیر و سیاحت کے شوق کی وجہ سے بڑا وقت سفر میں کٹا، لیکن حافظ ولی اللہ اور محمد خاں جو اُن کے سفر و حضر کے خادم تھے، کہا کرتے تھے کہ ہم نے ہمیشہ ریل اور جہاز میں بھی اِن پابندیوں کو بدستور قائم پایا۔ جہاز میں بھی اگر کوئی شخص ملنا چاہتا

تھا، تو اُس کے لیے بھی وہی اوقات تھے، جو حضر میں۔ ریل کے سفر میں ہمیشہ درجہ اوّل کا ایک کمپارٹمنٹ ریزرو کروا لیتے تھے اور اگر راستے میں بھی کوئی شخص ملنا چاہتا تھا تو ضروری تھا کہ اُنہی اوقات میں ملے، اس لیے کہ خود سفر میں بھی اُن کے معمولات وہی رہتے تھے اور اُن میں فرق آنا گوارا نہ تھا۔

ایک بہت بڑی بات جو اُن کے یہاں پہنچ کر ہر شخص محسوس کر لیتا تھا وہ بندگانِ الٰہی کے ساتھ یکساں سلوک تھا، جس میں امیر غریب کی کوئی تفریق نہ تھی۔ ملاقات کے لیے جس ہال میں سب لوگوں کو انتظار کرنا پڑتا تھا، اس میں صرف چٹائی کا فرش ہوتا تھا اور رئیس و غریب سب کو وہیں جا کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ جس کمرے میں وہ لوگ ملتے تھے، اُس میں دری کا فرش، ایک گاؤ تکیہ، اور ایک چھوٹی سی گدی ہوتی تھی، جس پر وہ خود چوبیس گھنٹے بیٹھتے تھے، اور خواہ کوئی شخص آئے، اُس کو وہیں اُن کے سامنے بیٹھنا پڑتا تھا۔

اُن کی تعلیم و تربیت اُس سوسائٹی میں ہوئی تھی، جو ہندستان کی قدیم اسلامی تہذیب کی آخری یادگار تھی، اور جس میں اگرچہ امتدادِ زمانہ اور تنزلِ حکومت و سلطنت سے بکثرت معائب پیدا ہو گئے تھے، تاہم بے شمار خوبیاں بھی تھیں، جو اب بالکل معدوم ہیں۔ خود قلعے میں بھی اپنے نانا کے سرکاری تعلقات کی وجہ سے بے روک ٹوک آمد و رفت رکھتے تھے۔ اور وہاں کی مخصوص سوسائٹی سے متمتع ہوتے تھے، جس میں کتنے ہی نقائص پیدا ہو گئے ہوں، پھر بھی چھ صدی کی تیموری مدنیت مٹنے پر بھی ایسے جوہر رکھتی تھی، جن

سے اب ہندستان ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا ہے، غرضکہ اِس سوسائٹی، خاندانی وراثت، اور ذاتی اعتدالِ طبیعت کی وجہ سے اُن کے اخلاق وعادات میں بہت سی باتیں ایسی جمع ہوگئی تھیں، جو اِس زمانے میں کم نظر آتی ہیں۔

ازانجملہ اُن کی خودداری تھی۔ عمر بھر کسی امیر و رئیس کی تعظیم نہیں کی اور بجز علما اور اپنے اساتذہ کے اور کسی کی تعظیم میں کبھی کھڑے نہیں ہوئے کبھی کسی امیر کے دروازے نہیں گیے اور باوجود سخت سخت التجاؤں کے بھی کبھی امرا کی دعوتیں قبول نہیں کیں۔ ایک سال میں وہ کتنے مرتبہ اور کس کس کے یہاں جائیں گے ؟ یہ بالکل ایک طے شدہ معاملہ تھا، اور نہ گھٹتا تھا نہ بڑھتا تھا۔ اُن کے معتقدین میں صرف دو شخص تھے، جن کے یہاں میلاد کی مجلس، ماہ ربیع الاوّل میں ہوتی تھی، اور اُنھی کے یہاں جاتے تھے، اور اِس بات میں اُن کی مجلس تمام شہر میں ممتاز تھی۔ اِس کے علاوہ اور کبھی کسی شخص کے یہاں نہیں گیے۔ جو کوئی ہو، اگر وہ ملنا چاہتا ہے، تو اِس طریقے کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہ تھا کہ خود اُن کی چوکھٹ پر آئے۔ وقت مقرر کرائے اور کم سے کم وقت میں مل کر چلا جائے۔

مکّے میں جب نہرِ زبیدہ کی تعمیر کا معاملہ شروع ہوا، تو اس سال اتفاق سے ہندستان کے دو بڑے رئیس: نواب کلب علی خاں اور عبدالغنی خاں گیے ہوئے تھے۔ جب وہ روانگی کے خیال سے جدہ آگیے، تو والد مرحوم کو خیال ہوا کہ اِس معاملے میں اُن سے مدد لینی چاہیے۔ چونکہ وقت کم تھا اور

معاملہ ذاتی نہ تھا، اِس لئے خود جدّے پہنچے، مگر اُن کی قیام گاہ پر ملنے نہیں گیے بلکہ اپنے ایک معتقد کے یہاں ٹھہر گیے اور حاجی عبدالواحد کو اِن دونوں کی ملاقات کے لیے بھیجا۔ وہ خود ہی اِن کی ملاقات کے خواہش مند تھے۔ اِس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور اِن سے آکر ملے اور بڑی بڑی رقمیں نہر کے لیے پیش کیں۔

کلکتے میں نواب عبدالغنی خاں نے ایک مرتبہ سخت اصرار کیا کہ اُن کے لڑکے کی شادی کے موقعہ پر آئیں، لیکن انھوں نے انکار کردیا اور نہیں گیے۔ اِس زمانے میں نواب عبداللطیف خاں سی، ایس، آئی کلکتے میں بہت ممتاز تھے اور تمام مسلمانانِ بنگال میں باعتبار سرکاری تعزّز کے خاص آدمی سمجھے جاتے تھے۔ وہ ہر سال مجلس میلاد کرتے تھے اور تمام منتخب آدمی اُس میں جاتے تھے، ایک مرتبہ سید امیر علی کو، جو زمانہ غدر میں عظیم آباد کے کمشنر تھے، اور بعد کو واجد علی شاہ کے وزیر ہوئے، ساتھ لے کر آئے اور سخت التجائیں کیں کہ مجلس میں آئیں، لیکن اُنھوں نے صاف کہہ دیا کہ میں ایک گوشہ نشین فقیر ہوں۔ مجھے امرا کی صحبتوں سے کوئی مناسبت نہیں! ایک شرعی مسئلے کے لیے، جس نے قانونی شکل اختیار کرلی تھی، لارڈ لٹن نے ملاقات کے لیے بلایا، تو صاف انکار کردیا۔ البتہ نواب عبداللطیف خاں کو اِس بارے میں شرعی تحریر لکھ دی۔

شہر کے مسلمان حکام، مثلاً عدالتوں کے جج، ہائی کورٹ کے رجسٹرار وغیرہ ہمیشہ آتے تھے، لیکن ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ یہ اُن کے یہاں

کسی مجلس یا دعوت میں گیے ہوں۔ نواب امیر حسن خاں کو اِس کی بڑی آرزو تھی کہ اپنے مکان میں اُنھیں لے جائیں، سالہا سال تک اِس کوشش میں رہے، لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ پرنس فرخ شاہ نے، جو خاندان میسور کے ہیڈ[ع] تھے بڑی سعی کی۔ اپنی تعمیر کردہ مسجد میں وعظ کرایا، یہ سب ہوا لیکن جب وعظ کے بعد خاموشی سے اُن کی پالکی، اُن کے مکان کے احاطے میں داخل ہوئی، تو اِنھوں نے اُسی وقت پالکی رُکوائی اور دریافت کیا، اور جب فرخ شاہ نے نکل کر کہا کہ پانچ لمحے کے لیے صرف اپنے قدم رکھکر واپس چلے جائیں، تو صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں مسجد میں آیا تھا۔ میں نے وعظ کہا اِسی کا آپ سے وعدہ تھا۔ اِس سے زیادہ کے لیے اصرار نہ کیجیے!

حق گوئی

سب سے زیادہ قابلِ ذکر واقعہ اُن کی بے لاگ اور بے باک حق گوئی کا ہے جو ہمیشہ اہلِ دول کے مقابلے میں نمایاں رہتی تھی۔ جن اشخاص کے متعلق اُن کو جو باتیں معلوم ہو جاتی تھیں، وہ بے دھڑک اول صحبت ہی میں اُن کو متنبہ کرتے تھے اور رعب و ہیبت کا یہ حال تھا کہ اُنھیں سر جھکا کر سب کچھ سننا پڑتا تھا۔

اِنہی فرخ شاہ کو ایک مرتبہ مغرب کی صحبت میں، جبکہ تقریباً پچاس

ع یعنی ٹیپو سلطان شہید کا خاندان۔

ساٹھ آدمی بیٹھے تھے، اُن کے انگریزی لباس اور غیر اسلامی وضع و اسلوب پر اس قدر سرزنش کی کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ بالکل انگریزی وضع میں رہتے تھے، لیکن جب والد مرحوم کے سامنے آتے تھے، تو ہندستانی کپڑے پہن کر آتے تھے، تاہم اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کو بدل نہیں سکتے تھے۔ اِسی طرح جب کبھی مجلس وعظ میں امرا موجود ہوتے، تو سب سے پہلا کام ان کا یہ ہوتا تھا کہ اُن کو متوجہ کرکے خاص طور پر اُن کے معائب پر سرزنش کرتے تھے۔ اِس بارے میں اتنے بے شمار واقعات ہیں کہ اُن کا استقصا دشوار ہے۔

دراصل یہ نتیجہ اُس جوہر کا تھا، جس کے بغیر انسان میں جرأت اور بے باکانہ حق گوئی پیدا ہی نہیں ہو سکتی، یعنی استغنا۔ یہ چیز اُن پر اِس درجہ غالب تھی کہ بعض اوقات لوگ خیال کرتے تھے کہ حدِ اعتدال سے بھی متجاوز ہو رہے ہیں۔

وہ غربا کی دعوتیں نہایت خوشی سے قبول بھی کر لیتے تھے، لیکن اہلِ دُوَل و امرا سے اُن کا تعلق بالکل بے لاگ رہتا تھا، اور ممکن نہ تھا کہ ایک ذرہ بھر بھی دُنیاوی احسان اُن کا اپنی گردن پر لیں۔ وہ لوگ آتے تھے۔ اپنے دینی و دنیاوی معاملات پیش کرتے تھے اور ہر طرح کی اعانت اُنھیں حاصل ہوتی تھی، لیکن وہ خود اُن سے کسی طرح کی اعانت قبول نہ کرتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ اُن کو بادشاہوں کی طرح حکم دیتے تھے، اور بے نیازوں کی طرح اُن کے گھمنڈ اور غرور کو ٹھکراتے تھے!

غرور و عجز

ہمیشہ ہم لوگوں کو نصیحت کرتے تھے کہ امیروں سے غرور اور غریبوں کے مقابلے میں عجز دنیاز، یہی صحیح عادلانہ اخلاق ہے۔ خود اُن کا عمل بھی ٹھیک یہی تھا۔ یہ بات کیسی تعجب انگیز سمجھی جائے گی کہ بڑے بڑے امرا تو برسوں تک اِس آرزو میں رہتے تھے کہ ایک مرتبہ اپنے یہاں لے جائیں اور نہیں جاتے تھے، مگر کتنے ہی غریب و فقیر اُن کے عقیدت مند ایسے تھے، جن کے چھپّر کے کچّے مکانوں میں وہ چلے جاتے تھے، اور اُن کا ماحضر قبول کر لیتے تھے۔

چنانچہ ہم کو یاد ہے کہ ایک مسلمان دھوبی کی، جس کا نام یاد نہیں رہا، اور جو بہت ہی اخلاص و عقیدت رکھتا تھا، آرزو تھی کہ ایک مرتبہ اُن کو اپنے گھر لے جائے۔ اِس بے چارے کا گھر ہی کیا تھا؟ پھونس کا ایک چھپر تھا، لیکن والد ایک مرتبہ اُس کے یہاں گئے۔ ہم بھی ساتھ گئے تھے۔ مٹّی کے برتنوں میں اُس نے فِرنی نکال کر رکھی تھی۔ وہ اُس نے پیش کی اور ہم سب نے کھائی، لیکن نواب عبدالغنی کے محل میں جانے سے اُن کو انکار تھا!
بمبئی میں بڑے بڑے کروڑپتی میمن اُن کے مرید تھے، لیکن بجز حاجی عبدالواحد جن کے خاص تعلقات کا ذکر اوپر آچکا ہے، کسی کے یہاں نہیں جاتے تھے۔ حاجی عبدالواحد کے بارے میں بھی یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ دولتمند تھے۔ اور یہ اُن کے یہاں گئے۔ یہ بات نہ تھی، بلکہ اُن کا واقعہ یہ ہے کہ جب وہ اُن

کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مرید ہوئے، تو اُس وقت نہایت ہی فقیر تھے۔ بے سروسامان اور کس مپرس آدمی تھے، حتیٰ کہ دو وقت کی روٹی کا بھی سہارا نہ تھا۔ اکثر اوقات آتے اور انھی کے یہاں رات کو پڑ رہتے تھے۔ والد ہی کی دعاؤں سے اچانک اُن کی حالت بدلی اور پھر یہ حال ہوا کہ کلکتہ و بمبئی کے سب سے بڑے مسلمان تاجر تسلیم کیے گیے، جن کے دریاؤں میں جہاز چلتے تھے اور بحرِ عرب اور بحرِ چین تک تجارت ہوتی تھی۔ پس اُن سے بھی والد مرحوم کے مراسم اُن کی ابتدائی اور اصلی حالت کی بنا پر تھے، نہ کہ درمیانی اور آخری حالت کی بنا پر۔

مُرادیں بر آنے کے اسباب

اُن کی زندگی کے واقعات میں اِس تذکرے سے یہ بات بھی یاد آگئی کہ اگر ایسے آدمیوں کا شمار کیا جائے، جو پریشانی و غربت کی حالت میں اُن کی دعاؤں کے طالب ہوئے اور پھر اچانک انتہا درجے کی خوشحالی تک پہنچ گیے، تو اُن کی تعداد اتنی وسیع ہے کہ شمار نہیں کی جا سکتی۔ ہم نے اپنے بچپنے سے لے کر اُن کی وفات تک ایسے بے شمار حالات دیکھے ہیں۔ اِس بارے میں کچھ عجیب حالت تھی، حتیٰ کہ اُن کی نسبت یہ دُور دُور تک مشہور ہو گیا تھا کہ غریب آدمی اُن سے مرید ہوتا ہے اور دولت و سعادت لے کر واپس ہوتا ہے! میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ایک خاص سبب تھا من جملہ اُن اسباب کے جو دُور دُور سے ہزاروں آدمیوں کو اُن کے دروازے

تک پہنچا دیتا تھا۔

ہم نے حاجی محمد طاہر کو دیکھا، جو بے چارہ چھینکے بنا کے اور کاندھے پر ڈال کے سڑکوں پر صدائیں لگایا کرتا تھا، لیکن یہ اُس کا ایک روزانہ کا معمول تھا کہ ملاقات ہو یا نہ ہو، لیکن شب کو ایک مرتبہ اُن کے یہاں حاضر ہو جاتا تھا۔ پھر اِسی حاجی محمد طاہر کے مکانوں سے بمبئی کا ایک پورا محلہ رُکا ہوا ہے، اور اُس کے خاندان کا شمار بلائی میمنوں کے رؤسا سے ہے!

ہم نے عبد الجلیل نامی ایک شخص کو دیکھا، جس کو تین تین وقت فاقے رہتے تھے، لیکن فاقے کی راتیں بھی وہ اِنھی کی چوکھٹ پر بسر کرتا تھا، اور اُس کو بھی بہتوں کی طرح یقین تھا کہ یہیں سے اُس کی حالت بدلے گی، واقعی بدلی اور تھوڑے دِنوں کے بعد اِسی چوکھٹ پر وہ گھوڑے کی گاڑی پر بیٹھ کر آنے لگا!

حاجی محمد صدیق، جزیرہ مورشیش کی شکر کا بہت بڑا تاجر تھا، لیکن اچانک بالکل تباہ ہو گیا اور یہ حالت ہو گئی کہ شام کا کھانا بھی یہیں آکر کھاتا تھا، مگر اُسے یقین تھا کہ یہیں سے میری حالت بدلے گی۔ سال بھر تک بلاناغہ سہ پہر کو آتا اور نصف شب کے بعد چلا جاتا، عام اِس سے کہ ملاقات ہوتی یا نہ ہوتی۔ ایک مرتبہ سیڑھیوں پر سے گزرتے ہوئے والد مرحوم نے اُس کو دیکھا اور حالات پوچھے۔ پھر ہم نے خود دیکھا کہ وہ نہ صرف خوش حال بلکہ ہمارے مکان کے ہمسائے میں لاکھوں روپیہ کی جو جائداد تھی، اس کا وہی مالک تھا!

ایسے بے شمار واقعات ہیں۔ جو تقریباً ہمیشہ صدہا آدمی اسی طرح کے مقاصد اپنے اندر لیے اُن کی ڈیوڑھی پر حاضر باش نظر آتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایسے بھی لوگ کم نہیں ہیں، جو میری معلومات میں برسوں اپنی اپنی کامیابی کے لیے آتے رہے، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، بلکہ ایک دو نظیریں ایسی بھی یاد ہیں، جن کی روز بروز فلاکت و بدحالی بڑھتی ہی گئی۔ عام طور پر جیسا کہ خوش اعتقاد لوگوں کا قاعدہ ہے، یہ لوگ اپنی ناکامیوں کو یا تو اپنی نحوست و محرومی سے منسوب کرتے تھے، یا اس بدقسمتی سے کہ وہ اُن کی نظر توجہ کو جلب نہ کر سکے، لیکن کبھی اُن کے اعتقاد میں تنزلزل نہیں ہوتا تھا، اور ناکامیوں کی مثالیں، کامیابیوں کی مثالوں کی شہرت پر غالب نہ آتی تھیں۔

میرے نزدیک اِن واقعات کے خاص اسباب ہیں۔ پہلا سبب تو قدرتی حالات کا عام طور پر نمایاں نہ ہونا ہے۔ اگر سو بیمار یہ عہد کریں کہ دوا نہ کریں گے اور صرف ایک درخت کے نیچے بیٹھے رہیں گے، تو قدرتی طور پر یہی ہوگا کہ پچاس تو مر جائیں گے اور پچاس خود بخود اچھے ہو جائیں گے، لیکن کوئی اس کا تجربہ نہیں کرتا۔ اب اگر ارادت و اعتقاد کے ساتھ سو آدمی ایک درخت کے نیچے بیٹھیں اور اس کی شہرت ہو، تو وہی پچاس فی صدی کا نتیجہ ایک غیر معمولی اُعجوبہ بن جائے گا۔ اسی طرح خوش اعتقاد لوگوں کی ایک بڑی تعداد جب کسی طرف رجوع ہوتی ہے، تو قدرتی طور پر نتائج ایک غیر معمولی عجوبہ بن جاتے ہیں۔ جن دُنیاوی مقاصد کے لیے یہ تعداد اس طرف رجوع ہوتی تھی، اس کی تعداد بہر حال ہیں کامیاب اور ایک حصہ ہر حال میں ناکامیاب رہنے

والا تھا۔

دوسرا سبب ذہنی و معقولی ہے اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ اسباب سے قطع نظر کر کے اِس قسم کے جذبات پیدا کرتے ہیں، ظاہر ہے، وہ کمزور دل و دماغ رکھتے ہیں، لیکن اِس قسم کے مراکز اُن کے مرضِ کمزوری کے لیے ایک طرح کا نسخۂ شفا بن جاتے ہیں۔ وہ اگر رجوع نہ ہوتے تو یقیناً اپنی کمزوری کی وجہ سے کسی طرح بھی دوبارہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتے تھے، لیکن جب ایک بزرگ کے پاس بڑے قوی اور یقینی جذبۂ اعتقاد کے ساتھ آنے لگے، تو قدرتی طور پر اُن کے اندر ایک نہایت قوی ارادہ اور عزم پیدا ہو گیا، اور اُن کے مساعی و اعمال میں کام دینے لگا۔

تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ واقعی ایسے بزرگوں کا مفید مشورہ اور پند نصائح، تقویتِ ارادہ اور تحریکِ عزائم کا کام دیتے ہیں۔ وہ ایسے ضعیف آدمیوں کو جب مشورہ دیتے ہیں اور وہ خوش اعتقادی کی وجہ سے سمجھتے ہیں کہ اُن کی مافوق الفطرت کرامت، کی وجہ سے اُن کے احکام کی تعمیل ہمیں کامیاب و فتح مند کرے گی، تو قدرتی طور پر اُن کے اندر ایک طاقت و قوتِ فعل پیدا ہو جاتی ہے، جو کامیابی کی طرف لے جاتی ہے، لیکن اگر اِس کے باوجود ناکام رہتے ہیں، تو اِس کی توجیہیں کر لیتے ہیں، اور شہرتِ عام پر اِس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

بہرحال جو کچھ بھی ہو، لیکن ہمیشہ ہزاروں آدمیوں کا اُن کے دروازے پر ہجوم رہتا تھا۔ بیمار شفا کے لیے آتے تھے مفلس دولت کے لیے، بانجھ

اولاد کے لیے، کاروباری مشورے کے لیے، اور اس ہجوم میں خال خال وہ بھی ہوتے تھے، جو خدا کی طلب میں آتے تھے۔ اِس کا بلا شبہ اُنہیں ہمیشہ سخت ماتم رہتا تھا۔ گھر میں بارہا ہم نے دیکھا کہ سرد آہیں بھرتے تھے اور کہتے تھے کہ تمام وقت، طلب گاران دنیا کے لیے صرف ہو جاتا ہے، اور طلب گارِ آخرت کوئی بھی نہیں ملتا۔ اِسی وجہ سے وہ ایسے لوگوں کے بڑے خواہش مند و شائق رہتے تھے، اور جو اِس طلب میں آتے تھے، اُن سے بڑی محبت کرتے تھے۔

دریادلی

ایک خاص وصف اُن کی طبیعت کا، جو اُن کو عام صف سے الگ کر دیتا ہے، طبیعت کی فیاضی، سیر چشمی، اور دریا دلی تھی۔ اُن کو دیکھ کر خیال نہیں ہوتا تھا کہ یہ لوگوں سے لینے والے ہیں، بلکہ ہر آنکھ محسوس کر لیتی تھی کہ لوگوں کے دستِ سوال پر اُن کا دستِ بخشش اُٹھا ہوا ہے۔ کوئی دن ہم نے ایسا نہیں دیکھا کہ کم سے کم پندرہ بیس آدمیوں نے اُن کے دستر خوان پر کھانا نہ کھایا ہو۔ طبیعت میں بے انتہا علو و بلندی تھی۔ دنایت و خسّت سے نہایت سخت نفرت کرتے تھے، اور اِسی کی ہم سب کو تلقین کرتے تھے۔ جو چیز لیتے، قیمتی لیتے۔ جس کو کچھ دیتے، زیادہ سے زیادہ دیتے۔ علما و فقرائے وقت میں سے کوئی شخص ایسا نہ ہوگا، جو اُن سے ملا ہو، اور جاتے وقت اُس کو انھوں نے ایک رومال نہ دیا ہو، جس کے کونے میں نوٹ

بندھے ہوتے تھے۔

اُن کی طبیعت میں مذاہب واقوام کی نسبت بھی ایک عجیب طرح کی بے تعصبی تھی۔ ہزاروں ہندو، پارسی، یہودی، عیسائی عقیدت مندانہ اُن کے پاس آتے تھے اور اپنے مقاصد پیش کرتے تھے۔ اُن کے معتقدین میں بمبئی کے چند پارسی اور ہندو ایسا غیر معمولی اعتقاد رکھتے تھے کہ اُن کے انتقال کے بعد جب اُنھوں نے مجھ سے پوچھا کہ ہم اُن کو کیونکر خوش کر سکتے ہیں، اور میں نے کہا کہ مسلمان ہوکر، تو اُن میں سے ہُرمزجی نرسی مسلمان ہوگیا۔ یہ ایک بہت بڑا دلال تھا۔

نفاست پسندی

اُن کی طبیعت میں یہ بات بھی تھی کہ ہمیشہ خوش پوشاک رہتے تھے، اور اِس بارے میں بڑا خیال رکھتے تھے۔ نہایت قیمتی لباس پہنتے اور ہر طرح کا کپڑا، جو گھر میں مستعمل ہوتا، قیمتی سے قیمتی منگواتے تھے۔ وہ ہم لوگوں سے کہتے تھے کہ یہ اللہ کی نعمت کا بہترین ذریعۂ شکر ہے اور امام مالک اور امام ابوحنیفہ کی خوش پوشاکی کے واقعات سُناتے۔

عطر کا نہایت شوق تھا اور سَو سَو روپیہ تولے کا اڈر یا نویل کا گلاب اُن کے عطردان میں ہمیشہ رہتا تھا۔

اُن کا خط نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔ اپنے ہاتھ سے اپنی جو کتابیں، اُنھوں نے صاف کی ہیں، ایسا عجیب خط آج تک نظر سے نہیں گزرا۔

کہتے تھے کہ یہ ہمارا خاندانی ورثہ ہے، اور ہم لوگوں کو سخت تاکید کرتے تھے کہ خط درست کرو، لیکن چونکہ مجھے شروع ہی سے انگریزی نب سے لکھنے کی عادت پڑ گئی تھی، اِس لیے اُن کو خوش ہونے کا کبھی موقع ہی نہ ملا۔[ع]

"وہابیوں" سے تعصب

ابتدا ہی سے اُن کی طبیعت میں وہابیوں کے متعلق سخت تعصب قائم ہو گیا تھا، اور یہ آخر تک بڑھتا ہی گیا۔ اِس بارے میں اُن کی طبیعت کا کچھ عجیب حال تھا۔ ہر طرح کی رسوم، ہر طرح کی بدعات، جو سخت سے سخت آخری درجے کی کہی جا سکتی ہیں، اِن سب کی وہ توجیہیں کرتے تھے اور کسی کو بھی قابلِ رد اور قابلِ اعتراض نہ قرار دیتے تھے، اور اگر کوئی ذرا سا بھی اُن پر اعتراض کرے، تو اُس کو وہابیوں کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔ بعد کو میں نے دیکھا، تو اِس بارے میں مقلدین حنفیہ کے جو مختلف حلقے نظر آتے ہیں، اُن میں سب سے زیادہ تنگ حلقہ اِن کے مشرب کا تھا اور ہندستان کے گذشتہ علما میں صرف مولوی فضل رسول بدایونی، جنہوں نے تقویۃ الایمان کے رد میں سوط الرحمان لکھی ہے، ٹھیک اُسی رنگ پر تھے، جو اِس بارے میں والد مرحوم کا تھا۔ اِن کے علاوہ ہندستان کا کوئی سخت سے سخت حنفی عالم بھی اُن کے معیارِ حنفیت پر نہیں اُتر سکتا تھا۔ جن لوگوں نے اپنی زندگیاں

ع حالانکہ مولانا کا خط بہت عمدہ تھا!

تقلید کی حمایت اور حنفیت کی نصرت میں بسر کردیں، وہ بھی بعض شدید بدعات ورسوم کی مخالفت کی وجہ سے اُن کے نزدیک وہابی تھے!

"اِسماعیلیہ واِسحاقیہ!"

اُنھوں نے وہابیوں کو دو اصولی قسموں میں بانٹ دیا تھا۔ کہتے تھے دو فرقے ہیں: ایک اسماعیلیہ ہے، دوسرا اسحاقیہ۔ اسماعیلیہ سے مقصود وہ فرقہ تھا، جو بدعات ورسوم کی مخالفت کے ساتھ تقلید شخصی کا بھی تارک ہو، جیساکہ مولانا اسماعیل شہید نے تقویۃ الایمان اور جلاء العینین وغیرہ میں لکھا ہے۔ اسحاقیہ سے مقصود وہ فرقہ ہے، جو حنفیت وتقلید سے تو انکار نہیں کرتا، لیکن بدعات ورسوم کا مخالف ہے۔ اِس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ شاہ محمد اسحاق نے مائۃ مسائل میں بدعات ورسوم سے اختلاف کیا ہے، مگر تقلید وحنفیت کے خلاف کوئی بات نہیں کہی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ جب اسماعیلیہ غیر مقبول ہوگئی، تو وہابیت نے اپنے مکائد کی اشاعت کے لیے راہ تقیہ اختیار کی اور حنفیت کی آڑ قائم کرکے اپنے دیگر عقائد کی اشاعت کرنے لگے۔ جہاں تک مجھے خیال ہے، وہ وہابیوں کے کفر پر وثوق کے ساتھ یقین رکھتے تھے۔ اُنھوں نے بارہا فتویٰ دیا کہ وہابیہ یا وہابی کے ساتھ نکاح جائز نہیں!

کسی حنفی کے لیے کسوٹی یہ تھی کہ اُس سے سید احمد صاحب بریلویؒ، مولانا اسماعیل شہیدؒ، مولانا اسحاقؒ، اور تقویۃ الایمان، صراط مستقیم،

مائۃ مسائل ، اربعین کی نسبت سوال کرتے۔ اگر وہ شخص " بد قسمتی " سے
ان بزرگوں اور کتابوں کے خلاف عقیدہ ظاہر کرنے میں ذرا بھی تامل کرتا، تو
بس یہ وہابیت کا قطعی ثبوت ہوتا۔ علاوہ بریں بعض اور جزیات، جن پر
اُن کو اصرار تھا، اُن کے انکار کو بھی وہابیت قرار دیتے تھے!

غالباً ۱۹۰۱ء کی بات ہے کہ مولوی احمد رضا خاں بریلوی اُن سے
ملنے کے لیے کلکتہ آئے، جن سے اُن کے برابر تعلقات رہے تھے، اور بارہا
ہم لوگوں سے کہا تھا کہ یہ شخص بلاشبہ صحیح الاعتقاد ہے۔ لیکن بدقسمتی سے
وہ اپنے ساتھ بعض اپنی تصانیف لائے، اور چونکہ شیخ احمد دحلان، والد کے
خاص دوست تھے، اس لیے اُنھوں نے خاص طور پر اپنا ایک رسالہ
دیا، جو اُن کے رد میں لکھا تھا، اور اُس میں عدم ایمان ابوین آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم اور ایمان ابو طالب پر زور دیا تھا۔ چنانچہ اِس پر کچھ دیر
تک والد نے اُن کا ایسا تعاقب کیا کہ آخر وہ ہکا بکا رہ گیے اور خاموش
چلے گیے۔ جانے کے بعد ہم سے کہا کہ اِس شخص کے عقیدے میں بھی فتور
ہے!

البتہ علمائے حال میں مولانا عبد القادر بدایونی کی تعریف کرتے
تھے، اور اُن کی حنفیت پر معترض نہ تھے۔ جس زمانے میں مولوی ظہیر الحسن
شوق مرحوم سے اردو شاعری میں کیں اصلاح لیتا تھا اور اِس تعلق سے
اُن سے واقفیت ہوئی تھی، ان کی ایک دو کتابیں میں نے والد کو سنائیں،
جو تقلید و حنفیت کے اثبات میں تھیں اور بڑے ہی غلو کے ساتھ لکھی گئی

تھیں، مثلاً حبل المتین میں آمین بالجہر کے جواز ہی سے انکار کیا گیا ہے، لیکن وہ بھی اُن کے معیار پر ٹھیک نہ اُترے۔ شوق مرحوم اِس زمانے میں آثار السُّنَن لکھ رہے تھے، اور اِس کے لیے مالی اعانت کے طلب گار تھے۔ میری تحریک سے کلکتہ آئے اور والد مرحوم سے ملے، لیکن انہوں نے جب اُن سے معیارِ حنفیت کے سوالات کیے اور وہ ساکت رہ گیے، تو اِنھوں نے رائے قائم کر لی کہ اُن کی حنفیت بھی مشتبہ ہے، تاہم یہ عجیب بات تھی کہ باوجود اِس درجہ تشدد اور وہابیوں سے نفرت کے طبیعت میں قدیم سوسائٹی کی وضعداری اور مہمان نوازی کا جذبہ اِتنا قوی تھا کہ کوئی ہو، خواہ مولانا اسماعیل شہید ہی اُن کے مہمان کیوں نہ ہو جاتے، لیکن کفر کے فتوے کے ساتھ اُن کی خاطرداری اور خدمت بھی کرتے تھے۔ مولوی ظہیر الحسن سے وہ خوش نہ ہوئے، تاہم چلتے وقت اُن کو پانچ سَو روپے دیے تاکہ آثار السنن کا پہلا حصہ شایع کریں۔ اِس میں تین سَو اُنھوں نے اپنے پاس سے دیے تھے اور دو سو اپنے ایک معتقد سے دلائے تھے۔

موتیا بند

قوائے جسمانی آخر تک اِس درجہ مضبوط تھے کہ تقریباً نوّے برس کی عمر میں ایک دانت بھی نہ ٹوٹا تھا اور قد میں ذرا بھی خمیدگی نہ آئی تھی۔ البتہ انتقال سے تقریباً بارہ تیرہ برس پہلے اُن کی آنکھوں میں موتیا بند

کی شکایت بتدریج شروع ہوئی ۔ پہلے بائیں میں پھر دہنی میں ۔ تقریباً تین سال میں پہلی آنکھ پختہ ہو گئی تھی ، جس پر ڈاکٹر سنڈرسن نے عمل جراحی کیا لیکن چونکہ ڈاکٹر کے ہاتھ میں رعشہ ہو چکا تھا ، اس لیے عمل زیادہ کامیاب نہ ہوا ، اور اب گویا دوسری آنکھ میں پختگی کے انتظار میں تین سال تک رہنا پڑا ، لیکن اُنھوں نے اسی صبر و سکون کے ساتھ اِسے گوارا کیا ، جو اُن کی عادت و خصائل کا جزو اعظم تھا جس دن وہ پٹی کھلی ہے ، تو ڈاکٹر نے نہایت افسوس کے ساتھ کہا کہ یہ عمل بے کار ہوا اور یہ آنکھ کام نہیں دے گی ، تو یہ گویا اس وقت کہا گیا ، جب کہ تین سال کے طویل انتظار کے بعد توقع تھی کہ اب روشنی کا پیام سننے میں آئے گا ، لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ سننے کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی اُنھوں نے کوئی اضطراب یا حسرت ظاہر نہیں کی ۔ یہ تک دُہرا کے نہ پوچھا کہ ایسا کیوں ہوا اور کیوں بالکل ناامیدی ہو گئی ہے ؛ اپنی عادت کے مطابق صرف اِتنا ہی کہا کہ خدا کی ایسی ہی مشیت تھی ، جس پر افسوس نہیں کرنا چاہیے ۔ اُس وقت ڈاکٹر ہنڈرسن نے نہایت متعجب ہو کر کہا کہ میری زندگی ، ہزاروں مریضوں کے معائنے میں صرف ہو گئی ، مگر نہ تو میں نے ویسا سکون دیکھا ، جیسا عملِ جراحی کے وقت آپ میں پایا ، اور نہ ایسا صبر دیکھا ۔ مجھے یہ بات عملِ جراحی کے وقت ہی معلوم ہو گئی تھی لیکن میں اچانک آپ کو مایوس کرتے ہوئے ڈرتا تھا ۔ اب آپ نے جس اطمینان کے ساتھ یہ بات سنی ، اُس نے مجھے متحیر کر دیا ہے !

تین سال بعد اُنھوں نے ڈاکٹر مناڈے سے پھر آپریشن کرایا اور اِس

کے بعد وفات تک وہی آنکھ کام دیتی رہی۔ اِس کے بعد وہ اچھی طرح لکھ پڑھ بھی لیتے تھے۔ اُن کی صحت کی باقاعدگی اور زندگی کی حرکات کا نظم و اسلوب کچھ اِس طرح کا واقع ہوا تھا کہ اِس چھ سات سال کے زمانے میں جو اِس حالت میں گزرا، بجز گھر کے آدمیوں کے اور کسی شخص کو معلوم نہ ہوا کہ اُن کی بینائی میں کچھ فتور ہے۔ یہ بات تعجب انگیز سمجھی جائے گی، مگر واقعہ یہی ہے کچھ یہ بات نہیں ہے کہ وہ اِس زمانے میں بالکل گوشہ نشین ہو گیے ہوں۔ گوشہ نشین تو وہ ہمیشہ سے تھے ہی، لیکن بینائی کی حالت میں جو معمولات و اشغال تھے، وہ بدستور بلا کسی تغیرّ کے قائم رہے۔ اُن کا چلنا پھرنا، آنا جانا جتنی مقدار میں تھا، اب بھی برابر ہوتا رہتا تھا، لیکن طبیعت اِس درجہ تمام حرکات و افعال میں منظّم اور سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو گئی تھی کہ وہ ہر حرکت اپنی عام عادت کے سلسلے میں اِس طرح انجام دیتے تھے کہ اُن کے لیے بینائی و عدم بینائی دونوں برابر تھے۔ وعظ کی مجلسوں میں مجھے یاد ہے کہ کنار مجلس پر معمول کے مطابق پالکی رکھی جاتی تھی، پاؤں کے لنگ کی وجہ سے لکڑی ہمیشہ ہاتھ میں رہا ہی کرتی تھی۔ وہ اپنے معمول کے مطابق پالکی سے نکلتے، اور چونکہ یہ بات ہوتی چلی آتی تھی کہ وہاں سے منبر تک خطِ مستقیم اُن کے جانے کا راستہ موجود ہوتا تھا۔ پہلے ہی سے لوگ دونوں طرف ہٹ کر اور ایک آدمی کے جانے کی راہ رکھ کر بیٹھا کرتے تھے، اِس لیے وہ نکلتے اور بلا ادنی لغزش یا رکاوٹ کے سیدھے چلے جاتے، اور اُن کی لکڑی جوں ہی جا کر منبر کے زینے سے مَس ہوتی، معاً اُس کا کنگورہ پکڑ لیتے اور اپنی معمولی آہستہ پسندی کے

مطابق اُس پر بیٹھ جاتے۔ کوئی شخص محسوس نہیں کرتا تھا کہ اُن کی بینائی جاتی رہی ہے۔

اگر اِس کے علاوہ کہیں جانے کا اتفاق ہوتا، تو بھی وہ بلا کسی کے سہارے یا ہاتھ کے چلے جاتے اور اِس باریکی کے ساتھ آواز محسوس کرتے کہ بینائی سے کام لینے کی ضرورت ہی نہ پیش آتی۔ اِس چھ سال کے زمانے میں صرف ایک مرتبہ ایک شخص نے اُن سے پوچھا تھا کہ خدا نخواستہ بینائی میں تو کچھ فتور نہیں ہے؟ غلام حسین عارف کے یہاں مجلس میلاد تھی اور چونکہ مجلس ندوۃ العلماء کا جلسہ اِسی زمانے میں ہوا تھا، اِس لیے مقصود اُس کے تمام علما کا وہاں اجتماع تھا، اور بڑی منتوں اور اصرار کے بعد اِن سے شرکت کا وعدہ لیا گیا تھا۔ مجلس دوسری منزل پر تھی۔ جاتے ہوئے حسب معمول گیے۔ سیڑھی کے اوپر چڑھے۔ پہلے سے صدر میں جو جگہ اِن کے لیے رکھی گئی تھی، وہاں بٹھا دییے گیے۔ واپسی میں جب اُتر رہے تھے، تو سیڑھی ختم ہو گئی تھی۔ اُنھوں نے لکڑی آہستگی سے اِس انداز پر رکھی، گویا معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اور کوئی زینہ تو باقی نہیں ہے۔ اِس کے بعد بائیں جانب کی آواز سے اُنھیں معلوم ہو گیا تھا کہ دروازہ بائیں جانب ہے، چنانچہ بے تأمل گاڑی تک چلے گیے۔ بس صرف یہی ایک واقعہ مجھے اِس حالت کا یاد ہے۔ مقصود اِس سے یہ تھا کہ اِن لوگوں کی زندگی اِس درجہ باقاعدہ اور استوار ہوتی تھی کہ خواہ کیسے ہی حالات پیش آ جائیں، اُس کی رفتار و اسلوب میں کوئی فرق واقع نہ ہوتا تھا۔

جب اُن کی بینائی جاتی رہی تھی، تو مطالعہ بالکل بند ہو گیا تھا جب کبھی کسی کتاب کے دیکھنے کی ضرورت پیش آتی، تو وہ صرف یہی نہیں کہ کتاب کا نام بتلاتے بلکہ یہ بھی کہہ دیتے کہ فلاں رنگ کی جلد ہے۔ یہ تقطیع ہے۔ فلاں باب، صفحے کے فلاں جانب، اور بسا اوقات صفحے کا عدد تو نہیں، مگر کتاب کے صفحات کے اعتبار سے نصف یا رُبع یا ثُلث یا دس بیس صفحوں کے بعد، اس طرح کا حوالہ بھی دیدیتے تھے، اور صدہا مرتبہ میں ایک واقعہ بھی مجھے یاد نہیں ہے کہ اُن کی نشان دہی غلط نکلی ہو۔ یہ اُن کی نشان دہی چند کتابوں کے اندر نہ تھی، بلکہ تقریباً سات آٹھ ہزار کتابوں کے اندر پھیلی ہوئی تھی۔

کتابوں کا شوق

کتابوں کا شوق بھی اُن کا وہ جذبہ تھا، جس کی کوئی انتہا ہم معلوم نہ کرسکے۔ دنیا کی مرغوبات میں کوئی چیز بھی اُن کو اس درجہ مضطرب نہیں کرسکتی تھی، جس قدر کسی ایک کتاب کا وجود، جو اُن کے ذوق کی ہو۔ عاریتاً کی کتاب سے نہایت کبیدہ خاطر رہتے تھے، اور ذاتی کتاب ہی سے خوش ہوتے تھے۔

بچپن ہی سے اُن کا یہ خیال رہا اور زندگی کے ہر حصے میں، خواہ عُسر رہا ہو یا یُسر، اُن کے مصارفِ حیات میں سب سے بڑا مصرف، کتابوں کا خریدنا ہی رہا۔ حجاز، عراق، مصر و شام قسطنطنیہ اور ہندستان کے تمام بڑے بڑے کتب خانے اُن کی نظر سے گزر چکے تھے قسطنطنیہ اور مصر میں

اِتنے طویل عرصے تک یعنی سال سال دو دو سال صرف کتابوں ہی کے عشق کی وجہ سے رہے۔ قسطنطنیہ کے کتب خانوں کا حال جب بیان کرتے تھے، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی وہاں سے اُٹھ کے آئے ہیں۔ کہتے تھے کتب خانۂ جامع ایا صوفیا اور کتب خانۂ جامع فاتح، اور کتب خانۂ جامع بایزید بہینوں تک میرے تمام تمام دِن کا مسکن رہے ہیں۔ سرکاری طور پر اُنھوں نے ہر طرح کے مطالعہ و تصرّف کا خاص پروانہ حاصل کر لیا تھا، اور کتب خانے کے سرکاری کاتبوں کو سلطانی حکم مل گیا تھا کہ جن جن کتابوں کی نقلیں یہ چاہیں، سلطانی خرچ سے دیدی جائیں۔ چنانچہ تقریباً دو سو قلمی کتابیں وہاں سے لائے، جن میں بہت سی خود اُن کے ہاتھ کی ہی نقل کی ہوئی تھیں۔ تفسیر یاقوت التاویل کا وہ نسخہ، جو امام غزالی کی طرف منسوب ہے، لیکن میں اُسے امام صاحب کا نہیں سمجھتا، اُس کی سات جلدیں، جامع ایا صوفیا میں ہیں۔ ایک جلد والد مرحوم کے خود ہاتھ کی نقل کی ہوئی ہم نے دیکھی اور باقی دوسرے کاتبوں کی۔ اِسی طرح تفسیر و فقہ و عقائد کی دو سو کتابیں قسطنطنیہ سے لائے تھے، جن میں زیادہ حصّہ تفسیر کا تھا۔

مصر کے کتب خانے میں بھی اُنھوں نے متعدد کتابیں خود نقل کیں، اور لوگوں سے نقل کرائیں۔ شوقِ کتب میں آکر مصری مطبوعات اِس قدر خریدیں کہ مصر سے واپسی کے لیے اُن کے پاس خرچ بالکل نہیں رہا۔ آخر اور تین مہینے قرض لے کر ٹھہرنا پڑا، یہاں تک کہ بمبئی سے روپیہ اُن کے پاس پہنچ گیا۔

حافظ صاحب کہتے تھے کہ ہر سفر میں اُن کے ساتھ دس دس پندرہ پندرہ صندوق کتابوں کے آیا کرتے تھے۔

کتابوں کی ظاہری صورت کا بھی نہایت شوق تھا۔ اگر ایک کتاب اُن کے پاس موجود ہے، اور اب اُس کا کوئی اور قیمتی ایڈیشن نکلا ہے، تو اُسے ضرور خرید لیں گے، خواہ کتنی ہی قیمت ہو۔ فتح الباری اُن کے پاس قلمی تھی، جو وہ قسطنطنیہ سے لائے تھے، اور اِس کا مقدّمہ خود اُن کے ہاتھ کا نقل کیا ہوا تھا، لیکن جب نواب صدیق حسن خاں نے مصر میں چھپوائی، تو انھوں نے مکے میں اُسی وقت خرید لی، لیکن جلد ساز نے جلد باندھتے ہوئے اُس کا حاشیہ، خوبصورتی کے لیے بہت کاٹ دیا۔ اِس کا اُن کو بہت شوق تھا کہ کتابوں کا حاشیہ بڑا رہے، اور اِس میں بڑا اہتمام کرتے تھے، چنانچہ دوبارہ دوسرا نسخہ خریدا۔ قاضی زادہ کا حاشیہ بیضاوی آٹھ جلدوں میں چھپ رہا تھا تو یہ قسطنطنیہ ہی میں تھے، اِس کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی کہ جلد ساز نے اُس کی جلد خراب باندھی، لہٰذا دوسرا نسخہ خرید لیا۔ اب تک دونوں نسخے میرے پاس موجود ہیں۔

اُس زمانے میں کلکتہ انگریزی قسم کی جلد سازی میں مکے تک مشہور تھا، اور واقعی اِس سے بہتر جلد اور کہیں نہیں بندھتی تھی۔ جب والد مرحوم مکہ معظمہ میں تھے، تو وہاں سے بے جلد کی کتابیں کلکتے میں صرف جلد باندھنے کے لیے بھیجی ہیں، اور یہاں سے جلد بندھ کر گئی ہیں۔ چنانچہ اُن کی کتابوں میں سیکڑوں جلدیں سُرخ ولایتی پشتے اور سبز کپڑے کی، جو انھیں بہت مرغوب

تھی، وہی جلدیں جو اثنائے قیام حجاز میں کلکتے سے جلد بندھ کر گئی تھیں ایک والیِ ملک کے لیے یہ انتظام عجیب نہ ہو، لیکن ایک عالم کے لیے یقیناً غیر معمولی ہے۔ اُنھوں نے اپنی پوری زندگی کے ہر حصّے میں دولتِ دُنیا کی طرف سے ایسی فارغ البالی پائی تھی، جو علما و مشائخ کو بہت کم میسر آتی ہے، لیکن اُن کی تمام دولت کتابوں ہی میں خرچ ہوئی۔

تاریخ کبیر لبغداد للخطیب، تاریخ کبیر دمشق لابن عساکر، طبقات الشافعیہ للسبکی، جمع الجوامع للسبکی، مشکل الآثار اور معانی الآثار للطحاوی، تصنیفاتِ ابن عربی، علاوہ فتوحات و فصوص، مصنّفات امام غزالی، علاوہ کتب متعارفہ، تہذیب للحافظ مزّی، تاریخ للذہبی، تفسیر سراج المنیر وغیرہ بہت سی نایاب کتابیں اُنھوں نے بڑے ہی اہتمام سے نقل کرائیں۔ کتب خانۂ محمودیہ، کتب خانۂ حرم، کتب خانۂ باب السلام کی کوئی کتاب ایسی نہ تھی، جسے اُنھوں نے نقل نہ کرالیا ہو۔ خود لکھتے تھے کہ تاریخ صغیر امام بخاری کا ناتمام نسخہ، کتب خانۂ محمودیہ میں ہے، لیکن میں نے کتب خانۂ جامع ... عہ سے مکمل نسخہ نکال کے اپنا نسخہ مکمل کرلیا۔ فتوحات اُنھوں نے تصحیح کر کے "مطبع بولاق میری" میں چھپنے کو دے دی۔

اُنھوں نے نجم المبین کے مقدمے میں اپنے ماخذ کی فہرست

عہ مسودے میں جگہ خالی ہے۔

دی ہے، جس میں صرف تفسیر کی کتابیں دو سو کے قریب ہیں، اور یہ وہ ہیں جو اُن کے مطالعے میں آئیں۔ مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے مبحث میں سو کے قریب تفسیروں کے اقوال نقل کیے ہیں۔

لیکن بد قسمتی سے ایسے حالات پیش آئے کہ اِس نایاب کتب خانے کا، جو مقدار کے لحاظ سے بڑے بڑے تیس صندوقوں میں ایک مرتبہ بند ہوا تھا، بڑا حصہ ضایع ہو گیا۔ جب دوسری مرتبہ حجاز سے آئے اور کئی سال کے بعد واپس گیے، تو کتابیں چونکہ صندوقوں میں بند تھیں اور لوگوں نے اُن کی کافی نگہ داشت نہ کی تھی، اِس لیے علم کے سب سے بڑے دشمن، یعنی کیڑوں کو حملے کا موقع مل گیا۔ آخری مرتبہ جب ہندستان آئے، تو ایسے حالات پیش آئے کہ یہاں کے قیام نے بہت طول پکڑا۔ پہلا تجربہ چونکہ ہو چکا تھا، اِس لیے اُنھوں نے اپنے معتمدین کو یہاں لکھا اور کتابوں کی فہرست بھیج دی کہ اُنھیں کتب خانۂ محمودیہ میں داخل کر دیا جائے۔ شریف عون کا زمانہ شروع ہو چکا تھا اور اُس نے طرح طرح کی کارروائیاں ذاتی مطامع کی اختیار کر رکھی تھیں، چنانچہ چاہا کہ یہ کتابیں بھی خود اُس مدرسے کے کتب خانے میں رکھ دے، جو اپنے نام سے اُس نے وہاں قائم کیا تھا۔ تب والد مرحوم نے حاجی محمد قاسم کو، جو جدے کے بہت بڑے تاجر اور رئیس تھے، اِس کام پر مامور کیا اور اُنھوں نے بڑی کوشش کر کے ان کتابوں کو کتب خانہ محمودیہ میں داخل کیا۔

لیکن یہاں ہندستان آ کر دس پندرہ برس کے عرصے میں سترہ اٹھارہ

صندوق اور کتابوں سے بھر گیے تھے۔ اِن میں بہت سی کتابیں ایسی بھی تھیں جو اُن کے کتب خانۂ حرم میں موجود تھیں۔ یہاں ضرورت پیش آئی، یا عمدہ ایڈیشن چھپ گیا اور مکرّر خرید لیں۔ کتابوں کے شوق کی وجہ سے آخر تک یہ حال تھا کہ جس زمانے میں بینائی کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ مطالعہ بالکل نہیں کر سکتے تھے، اور آیندہ بھی مطالعے کے لیے عمر کی کوئی مہلت نظر نہ آتی تھی، اِس پر بھی ہم لوگوں نے جوں ہی کسی کتاب کا ذکر کیا، فوراً اُسے خرید لیتے تھے۔ اردو کتابوں سے بالکل رغبت نہ تھی، بلکہ ایک طرح کی حقارت اُن میں نظر آتی تھی۔ وہ تصور ہی نہیں کر سکتے تھے۔ کہ کوئی عالم، عالم ہو کر اردو میں بھی کتابیں تصنیف کر سکتا ہے۔ کہتے تھے کہ یہ صرف عوام کے لیے ہے، لیکن اِس پر بھی اگر کوئی کتاب، موضوع کے اعتبار سے اُن کے خیال میں جچ جاتی، تو ہم لوگوں کی ترغیب، جو زیادہ تر اپنے ذاتی مطالعے کی طمع سے ہوتی تھی، ضایع نہیں جاتی تھی۔ تمدّنِ عرب کا ترجمہ جب شایع ہوا، تو اُس کی قیمت باون روپیہ تھی۔ ہماری استطاعت سے باہر تھا کہ اُسے منگواتے۔ اُس کی فہرست بطور اشتہار کے چھپی تھی۔ ایک دن اُنھیں خوش دیکھ کر میں نے سُنائی۔ کہا کہ بیکار ہے، مگر منگا لو۔

لیکن افسوس یہ چیز بھی بُری طرح ضایع ہوئی۔ آخر مرتبہ جب بمبئی سے کلکتہ آئے، تو تمام سامان بمبئی میں چھوڑ آئے تھے۔ جب انتقال ہوا، تو عرصے تک بعض مجبوریوں کی وجہ سے بمبئی نہ جا سکا۔ بعض اور اعزہ وہاں چلے گیے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب میں گیا، تو دو بڑے ہال، جو طرح طرح کے سامانوں سے

بھرے ہوئے تھے، اُن میں بجز خالی صندوقوں کے اور کچھ نہ تھا، یا تھوڑی سی بچی بچائی کتابیں رہ گئی تھیں۔

یہ پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ والد کو اچھی اشیا کا بہت شوق تھا۔ خود بھی خریدتے تھے اور ظاہر ہے، دُور دُور سے ہزاروں معتقدین طرح طرح کی قیمتی چیزیں تحفتہً بھیجتے تھے۔ پرانی کشمیری کام کی شالوں سے، جو اب نایاب ہیں، ایک پورا صندوق بھرا ہوا رہتا تھا۔ قیمتی قالین، دریاں، ہاتھی دانت اور صندل کی طرح طرح کی اشیا، ڈھاکے اور مرشد آباد کے قیمتی کپڑے، مراد آباد اور بنارس کے برتن، اور دوسری طرح طرح کی چیزوں سے صندوق کے صندوق بھرے ہوئے تھے، لیکن انتقال کے بعد مجھے ان میں سے کوئی ایک چیز بھی نہیں ملی۔ اس کا مجھے کچھ افسوس نہ ہوا، لیکن کتابوں کے تلف ہو جانے کا بہت ہی افسوس ہوا ہے۔ یہ کتابیں ٹوکروں میں ڈال ڈال کر بازار میں فروخت کی گئیں۔ میں نے بعد کو بہت کوشش کی کہ سُراغ ملے، تو واپسی کی کوشش کروں، اور ایک حد تک سُراغ ملا بھی لیکن کتابیں نہ مِل سکیں۔ بہرحال یہ کارِ خیر ہوا کہ اُن کی کتابوں کا اولین ذخیرہ مکّہ معظمہ میں عام مطالعے کے لیے وقف ہو گیا۔

مولانا ابو نصر مرحوم

میرے بڑے بھائی کا نام، ابو نصرؒ تھا۔ وہ مجھ سے دو تین برس بڑے تھے۔ تعلیم میں ہم دونوں تقریباً ہم درس رہے۔ ذہانت، طبّاعی، حافظہ، ذوقِ علمی، اِن ساری چیزوں میں وہ ایک غیر معمولی قوت رکھتے تھے۔ ادب عربی سے اُن کو خاص مناسبت تھی۔ اردو شاعری سے بھی بہت ذوق تھا، اور داغ مرحوم اُن کو اپنا ایک تلمیذ رشید تصوّر کرتے تھے۔

اردو، فارسی، عربی کے علاوہ تُرکی زبان میں بھی بہت عمدہ قابلیت ہندوستان ہی میں پیدا کر لی تھی اور پھر بغداد جاکر اُس کی پوری تکمیل کی۔ اردو تحریر میں اُن کو بہت عمدہ سلیقہ ہو گیا تھا۔ اُن کے مضامین، وقت کے اخبارات و رسائل میں چھپتے تھے، مثلاً مخزن، خدنگ نظر، وکیل، وطن وغیرہ۔ سفر بغداد کے متعلق اُن کے جو مراسلات، وطن میں شایع ہوئے تھے،

ؒ نام اصل میں غلام لیسین تھا

وہ بہت مفید و دلچسپ ہوتے تھے۔

وہ اگر زندہ رہتے، تو یہ قطعی بات تھی کہ علم و قابلیت کے اعتبار سے بہت جلد ایک نمایاں مقام حاصل کر لیتے۔ بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کا اُن کو بہت شوق تھا۔ چنانچہ اِسی سلسلے میں جب ایک ساتھی، یعنی حافظ عبدالرحمان امرتسری مل گیے، تو اُنھوں نے عراق کا ارادہ کیا۔ عراق ہم دونوں ساتھ گیے۔ لیکن میں وہاں پہنچ کر سخت بیمار ہو گیا اور واپس چلا آیا۔ اور وہ حافظ صاحب کے ہمراہ براہِ موصل و دیارِ بکر شام کی طرف گیے۔ اِس سال دیارِ بکر میں بہت سخت سردی اور برف باری ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہیں اُس مرض کی بنیاد پڑی، جو بالآخر اُن کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔

افسوس کے ساتھ بعد کو معلوم ہوا کہ حافظ صاحب نے بحیثیت ایک رفیق سفر ہونے کے کچھ بہتر حق رفاقت ادا نہیں کیا۔ بہر حال جب کہ وہ دنیا میں باقی نہیں، تو یہ تذکرہ فضول ہے۔

جو حالت اُن کی وہاں بیماری اور تنہائی کی وجہ سے ہو گئی تھی، وہ نہایت ہی دردانگیز ہے۔ بالآخر انگریزی قونصل کے ذریعہ وہ بغداد پہنچائے گیے۔ اتفاق سے مسٹر سجاد حیدر اس وقت بغداد کے قونصل خانے میں اسسٹنٹی پر موجود تھے۔ اُنھوں نے واقعی ہمدردی کی اور بمبئی میں والد کو مطلع کیا۔ اُن کے پاس جس قدر روپیہ تھا، وہ بھی بیماری کی حالت میں لوگوں نے خُرد بُرد کر لیا تھا۔ بہر حال برٹش قونصل کے ذریعے سے روپیہ بھیجا گیا اور وہ بمبئی آئے، لیکن اِس درجہ ضعیف و نحیف ہو گیے تھے کہ سنبھلنا دشوار معلوم ہوتا تھا۔ بالآخر چند

ماہ نہایت سخت تکلیف اُٹھا کر ۱۹۰۷ء میں راہ گزار عدم ہوئے۔

انتقال کے وقت اُن کی عمر بیس اکیس برس کی تھی۔ شادی ہو چکی تھی۔ اُن کی یادگار کا کافی ذخیرہ موجود ہے، اگر اخبارات و رسائل سے جمع کیا جائے۔ ترکی قواعد کی ایک کتاب ہے۔ عمر خیام کی ایک مختصر سوانح عمری لکھی ہے، جو لکھنؤ میں چھپ گئی ہے۔ اُن کا اردو دیوان بھی تقریباً مکمل تھا، جس میں ہر صنف کا معتد بہ کلام موجود تھا، لیکن افسوس ہے کہ جب میں نے تلاش کیا تو نہیں ملا۔

ترکی، عربی، اور انگریزی سے ترجمہ کر کے اُنھوں نے متعدد نئے قسم کی عمدہ نظمیں لکھی تھیں، جن میں سے بعض انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں پڑھی بھی تھیں، اور بعض اخبارات و رسائل میں شایع ہوئی تھیں۔ اگر وہ سب جمع کی جائیں، تو ایک نہایت عمدہ مجموعہ ہو جائے۔

"غِبطۃُ النّاظِر" نام عربی کا ایک رسالہ، شیخ عبد القادر جیلانی کے حالات میں ہے۔ ڈاکٹر راس پرنسپل مدرسہ عالیہ (کلکتہ) نے ایڈٹ کر کے شایع کیا تھا۔ اِس کا بھی اُنھوں نے اردو میں ترجمہ کیا، جو چھپ گیا ہے۔

تحریر کے علاوہ ان کو تقریر کا بھی بہت عمدہ سلیقہ ہو گیا تھا۔ اُس زمانے میں جلسوں میں ہم لوگ ابتدائی مشق کے طور پر تقریریں کیا کرتے تھے۔ اِس کے بعد انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں جس سال میں نے تقریر کی، اُسی سال اُنھوں نے ایک نظم پڑھی تھی۔ اِس کے بعد اسلامیہ کالج کے ہال میں جو ایک خاص جلسہ اہل شہر کا ہوا تھا، اُس میں اُنھوں نے بھی لکچر دیا تھا۔

بمبئی میں غیر مذہب والوں سے بحث و مباحثے کا بھی شوق ہوا۔ وائی، ایم، ایس کے پریچنگ ہال میں وہ ہفتہ وار جایا کرتے تھے اور پادریوں اور آریوں سے نہایت سرگرم مباحثے کرتے تھے۔ لوگ اُن کے مباحثے کی تقریریں بڑے شوق اور دلچسپی سے سنتے تھے۔

وہ اپنی تمام باتوں میں والد مرحوم کے پورے جانشین اور قدم بقدم تھے۔ وعظ کی مجلسوں میں ٹھیک اُسی اسلوب پر وعظ کرنے لگے تھے، جو والد مرحوم کا تھا، چنانچہ سفرِ عراق سے پہلے مختلف محلّوں میں بہت سی وعظ کی صحبتیں ہوئیں اور اُن میں اُنھوں نے وعظ بیان کیا اور جن لوگوں نے مدّۃ العمر والد مرحوم کا وعظ سُنا تھا، کہا کہ وہی کیف اِس میں بھی آنے لگی ہے۔

ایک بڑی بات یہ تھی کہ مذہبی عقائد و افکار کی جس کشمکش اور ابتلا میں مَیں مبتلا ہو گیا تھا، وہ اُس سے بالکل محفوظ تھے، اور اپنی خاندانی روایات کے استغراق میں اس طرح تھے کہ شک و شبہ کی گرد و غبار سے بالکل محفوظ تھے۔

والد مرحوم سے اُن کو بھی بیعت و اجازت تھی اور اُنھوں نے اپنی زندگی ہی میں لوگوں کو اُن کی جانب رجوع ہونے کا حکم دیدیا تھا، چنانچہ صدہا آدمیوں نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور اُنہی سے اشغال و اذکار حاصل کیے تھے۔ وہ اپنے لباس، چال ڈھال، وضع و کردار، اِن ساری باتوں میں والد مرحوم کے قدم بقدم چلتے تھے۔

اُنھوں نے حجاز، عراق، دیارِ بکر، موصل، شام کا سفر کیا تھا۔ شاعری میں "آہ" تخلص کرتے تھے۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی اُن کا کافی مقدار میں کلام

موجود ہے۔ فارسی کا خاص شوق تھا۔

(یہاں ملیح آبادی عرض کرتا ہے کہ حضرت آہ مرحوم کا کچھ کلام پیش کرتا ہوں۔ منتخب کلام نہیں ہے۔ جو کچھ سامنے آگیا، وہی لے لیا ہے۔)

غزل

طالعِ بد سے نہ آئی راست اِک تدبیر بھی
تو پھرا کیا ہم سے ظالم پھر گئی تقدیر بھی

دِل میں لازم ہے خیالِ روئے پُر تنویر بھی
چاہیے اس آئینے کو نور کی تصویر بھی

مستعد ہے جان دینے کو دلِ نخچیر بھی
ناوک افگن پاس تیرے ہے کماں بھی تیر بھی

سوئے زنداں جب ترا دیوانۂ گیسو چلا
پانوں پڑنے کے لیے آگے بڑھی زنجیر بھی

خاک میں مِلنا ہے تجھ کو خاک کا پُتلا ہے تو
خاک ہے منعم یہ سازِ عیش بھی تعمیر بھی

جم گیا نقشہ رقیبوں کا دلِ دلدار پر
ہو گئی بے کار اب تحریر بھی تقریر بھی

سَر میں سودا زلف کا ہے ابرووں کی دُھن میں پانو
جان کے پیچھے پڑا ہے طوق بھی زنجیر بھی

بسملِ نوکِ مژہ ہوں کشتۂ ابروئے یار
ساتھ میرے ہو لحد میں تیر بھی شمشیر بھی

کم سِنی میں چاہتے ہو تم اگر مشقِ جفا
ترچھی چتون سے ذرا سیکھو لگانا تیر بھی

حال زخمیِ محبت سے کسے صدمہ نہیں
خم کیے سر کو اے قاتل تری شمشیر بھی

رُوح سارے جسم کی آتی ہے کھنچ کر کان میں
سحر ہے ظالم تری جادو بھری تقریر بھی

آہ اُس سفّاک نے ہم پر کبھی کھایا نہ رحم
روتے جاتے ہیں ہمارے حال پر رہگیر بھی

غزل

کبھی اُو ستم گار وعدہ وفا کر
مریضِ تپِ ہجر کی کچھ دوا کر

رقیبوں سے ہنستے ہو باتیں بنا کر
مری جان لینا ہے تم کو رُلا کر

تپِ عشق کی آگ بھڑکی ہوئی ہے
مجھے بھی جلائے گی دل کو جلا کر

شکایت یہ ہے دستِ قدرت سے ہم کو
بگاڑا تمہیں خوبصورت بنا کر

تجلّی پہ ہو جائیں مائل نہ موسیٰ
وہ بیٹھے ہیں پردے میں کیوں منہ چھپا کر

ہوا بوئے مے لائی کیا میکدے سے
گرے شیخ مسجد میں کیوں لڑکھڑا کر

ہنسیں بولیں میّت پہ آ کر ہماری
وہ بیٹھے ہیں کیوں رُوتی صورت بنا کر

ہزاروں سے وعدے ہیں لاکھوں سے پیماں
بہت سی نہیں ایک وہی وفا کر

ترقی پہ ہے بے وفائی کسی کی
ابھی اور اے زندگی کچھ وفا کر

قیامت کا غصہ غضب کے ہیں تیور
مری جان لیتے ہو آنکھیں دکھا کر

زمانے کی نیرنگیاں کوئی دیکھے
بگاڑے بہت خوبصورت بنا کر

مرا دردِ پنہاں مرے دل کی حسرت
وہ پوچھے کبھی آہ مجھ کو بُلا کر

غزل

کہتا ہوں جب کہ مجھ پہ نگاہِ کرم نہیں
کہتے ہیں ناز سے وہ خدا کی قسم نہیں

تیرے جفا و جور کا ہم کو الم نہیں
جینے کا اپنے رنج ہے مرنے کا غم نہیں

تکتے ہیں گاہ مجھکو کبھی وہ رقیب کو
شوخی سے شرم شرم سی شوخی بھی کم نہیں

اِک میں کہ جان دیتا ہوں کس ذوق و شوق سے — اِک تُو کہ میرے مرنے کا کچھ بھی الم نہیں
دل کی تڑپ میں شوخیِ جاناں کا ہے مزہ — اب آرزوئے وصل خدا کی قسم نہیں
آئی صدا مری لحدِ پائمال سے — رفتارِ یار فتنۂ محشر سے کم نہیں
ملتے ہی آنکھ دل مرا چور رنگ ہو گیا — ترچھی نظر حضور کی برچھی سے کم نہیں
کھنچ جانا بات بات پہ اُنکا شبِ وصال — میرے لیے تو خنجرِ بُرّاں سے کم نہیں
تم ہو زباں دراز تو ہم بے زبان ہیں — تم ہم سے کم نہیں تو ہم تم سے کم نہیں
جب سے کہ خطِّ سبز کا نظارہ ہو گیا — ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے آپے میں ہم نہیں
عاشق نہ ہو دہان و کمر کا جو اُس کی آہ — کچھ وہ مسافرِ رہِ ملکِ عدم نہیں

غزل

جب سے دل میں اس حسیں کی یاد ہے — جور پیکر شعلۂ فریاد ہے
ایک مسرور ہے اِک ناشاد ہے — بزمِ ہستی کی عجب روداد ہے
تم کو چاہا سب کی نظروں سے گرے — یہ ہمارے عشق کی افتاد ہے
قید میں جلتا نہیں بلبل کا دل — یہ چراغِ خانۂ صیاد ہے
ناز ہم سے اور غیروں سے نیاز — مہرباں یہ آپ کا ایجاد ہے
ایک عالم کی اُڑائی اُس نے نیند — اب مری فریاد کی فریاد ہے
زندگی میں تھیں ہزاروں گردشیں — مر کے بھی مٹی مری برباد ہے
ہو گئی برباد اپنی خاک بھی — وہ ابھی تک بر سرِ بیداد ہے
لطف کے پردے میں ظلم و جور ہیں — کس ستم کا وہ ستم ایجاد ہے

بن پڑے تو ہم بھی دیں حوروں کو دل | دشمنِ جاں حسنِ آدم زاد ہے
خاک کر دے آسماں کو تو بھی | دوسری بجلی مری فریاد ہے
ہجر کی شب دیکھیے کیونکر کٹے | ہر ستارہ دیدۂ جلاد ہے
جس کو سب کہتے ہیں آہِ نیم جاں | یہ وہی تو خانماں برباد ہے

متفرق اشعار

کیسے بے درد ہو سفاک ہو تم، جاؤ بھی | آپ ہی ظلم کرو آپ ہی پچھتاؤ بھی
آ کے دِل کا بھی دھو جائے بسِ مرگ غبار | چند آنسو کبھی تُربت پہ بہا جاؤ بھی

مری قبر پہ آ کے کہتے ہیں وہ | بہت نیند کے آپ ماتے ہوئے!

نہ توڑو نہ توڑو دِل شکستوں کے دِل | ڈرو گھر خدا کا گراتے ہوئے
خدا جانے کب دل میں آئے گئے | اُنھیں آتے دیکھا نہ جاتے ہوئے

ظاہری صاحب سلامت اور ہے | اور راہ و رسمِ الفت اور ہے
تھا لڑکپن قہر، اب آیا شباب | یہ قیامت پر قیامت اور ہے

مولانا آزاد کے حالات

سالِ پیدائش، ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ — ۱۸۸۸ء ۔ مقامِ پیدائش، محلّہ قُدوہ، متصل بابُ السّلام، مکّہ معظّمہ۔

بسم اللہ کی رسم

مجھے اپنی زندگی کے ابتدائی واقعات، ابتدائے طفولیت سے یاد ہیں۔ مجھے بارہا خیال ہوا ہے کہ میں اپنی چار برس کی عمر کے چند نمایاں واقعات اچھی طرح یاد رکھتا ہوں، میری پیدائش، مکّے میں ہوئی اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے ماموں، محمد ہاشم مرحوم مکان کی سیڑھیوں سے مجھے گود میں لیے ہوئے گرے، اور اس کے بعد اُن کو اُٹھا کر نیچے کی منزل میں لائے، اور جب پلنگ پر لٹایا، اُس پر زرد شال

بچھی ہوئی تھی۔ میری عمر اس وقت، جیسا کہ بعد کو مجھے بتلایا گیا، تقریباً چار برس کی تھی۔ والد مرحوم نے جب آخری سفر، ہندستان کا کیا، تو اُس وقت میری عمر سات آٹھ برس کی تھی، اور اُسی زمانے میں والدہ مرحومہ کا انتقال ہوگیا۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے، جب حرم شریف میں بسم اللہ کی تقریب کرائی گئی۔ اُس وقت میری عمر، پانچ برس کی تھی۔ عصر کا وقت تھا، اور مرحوم شیخ عبداللہ مرداد سے والد مرحوم نے یہ رسم ادا کرائی تھی۔ اُنھوں نے مجھ سے تین مرتبہ "یا فتاح!" کہلوایا اور "رب یسّر ولا تعسّر" کہلوایا، اور اس کے بعد الف سے شین تک حروف شناخت کرائے۔ یہ تمام واقعات مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔

میٹھے سموسے، قاب میں بھرے ہوئے ہمارے ہاں سے آئے تھے، جو وہاں تقسیم کیے گئے۔ میں للچائی ہوئی نظروں سے اُنھیں دیکھ رہا تھا، اور حافظ صاحب تقسیم کر رہے تھے، لیکن شیخ عبداللہ نے اُس قاب سے، جو اُن کے سامنے پڑی تھی، ایک سموسہ اُٹھا کے مجھے دیا، اور جب میں اسے لینے لگا، تو اُنھوں نے نہیں دیا، اور اپنے ہاتھ سے میرے منہ میں رکھ دیا، دراصل یہ تقریب بھائی مرحوم کی تھی، اور مجھے بھی بٹھلا دیا گیا تھا۔

شوق!

اس کے بعد ہم لوگ گھر میں پڑھنے لگے۔ زیادہ تر میں اپنی خالہ سے

پڑھتا تھا، جو بڑی خوش آوازی سے قرآن تلاوت کرتی تھیں، اور اچھی طرح لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ اُن کے خاندان کا حال، والد مرحوم کے حالات میں آچکا ہے، لیکن گاہ گاہ ہم لوگ باہر بھی جا کر پڑھتے تھے، اور اُس وقت کی صورتوں میں سب سے زیادہ میرے حافظے میں، حافظ بخاری کی صورت ہے، جو ایک بخاری تھے۔ خطاط اور حافظ تھے۔ خوش نویسی کی وجہ سے اُنھیں والد مرحوم نے رکھ لیا تھا، تاکہ اُن کی تصانیف کی تبئیض کیا کریں۔ یہ چائے کے بہت بڑے عادی تھے، اور گرم پانی کی کیتلی لانے کے لیے ہم لوگوں کی خوشامد کیا کرتے تھے۔ میں نے اُن کی قلمیں اِس قدر توڑی ہیں کہ ہمیشہ اُن کو نیا قلم بنانا پڑتا تھا۔؏

ایک اور شخص، بنگال کے مُطوّفین میں سے تھے، اور ہم لوگ اُن کو مولوی صاحب، کہہ کے پکارتے تھے۔ جب پارہ عمّ شروع ہوا، تو کبھی کبھی ہم اُن سے بھی سبق لیتے تھے۔

مکّہ چھوڑنے سے پہلے ہم لوگوں نے قرآن ختم کر لیا تھا، اور سورۂ یٰسین، سورۂ قاف وغیرہ زبانی حفظ بھی کر لی تھیں، اور حرم شریف میں قرائت کے لیے جانا شروع کیا تھا۔ اُس وقت حرم میں سب سے بڑے قاری، شیخ حسن تھے۔ میرے ماموں زاد بھائی، محمد سعید، محمد شفیع، اور محمد مکّی اُن سے قرائت سیکھا کرتے تھے۔ چنانچہ ہم دونوں بھی

؏ مولانا نے اسی طرح املا کرایا

صبح کے وقت اُن کے ساتھ جانے لگے۔ بھائی مرحوم نے اُس وقت حرم شریف میں، اجرومیہ بن مالک شروع کردیا تھا، اور اُس کے ابھی چند ہی سبق ہوئے تھے کہ اتنے میں ہندستان کا سفر پیش آگیا۔

تعلیم

کلکتہ پہنچ کے ہم لوگوں نے اپنی دو قریب السّن بہنوں کے ساتھ والد مرحوم سے پڑھنا شروع کیا۔ تعلیم کی صورت یہ تھی کہ اردو، جو اس وقت بالکل شروع نہ ہوئی تھی، اِس طرح شروع کی گئی کہ والد مرحوم، ہاتھ سے لکھ کر مُرکّب حُروف دے دیتے تھے، اور اُنھی کی مشق کی جاتی تھی۔ اُس وقت نہیں معلوم اردو کی پہلی دوسری کی جگہ کون کتابیں رائج تھیں، اور اگر تھیں، تو والد نے کیوں نہیں اختیار کیں؛ چنانچہ اِس حد تک کہ اردو کی ابتدائی کتابیں پڑھ سکیں، اِسی طریقے سے تعلیم حاصل کی، اور اِس کے بعد "خلاصۂ ہنداری" اور "مصدر فیوض" رسالے ہم کو پڑھائے گئے۔ خُلاصے میں نماز روزے کے مسائل ہیں اور مصدر فیوض فارسی قواعد کی کتاب ہے۔ عربی میں پہلے اجرومیہ کچھ دنوں تک پڑھی، لیکن پھر میزان و منشعب پڑھ کے نحو میر درقت میر پڑھائی گئی۔ اس کے بعد کافیہ شروع ہو گئی، فارسی میں مصدر فیوض کے بعد گلستاں اور بوستاں ایک ساتھ شروع کرائی گئیں۔ ساتھ ہی آمدنامے کے مصادر حفظ کرائے گئے۔ اِسی طریقے سے باقاعدہ

عاملِ منظوم بھی حفظ کرایا گیا۔ فقہ میں پہلے ہم کو کنز، کافیہ کے ساتھ شروع کرایا گیا، اور منطق میں شرح تہذیب۔ اِس سے پہلے ایساغوجی پڑھ چکے تھے۔

اِس زمانے میں مولوی محمد یعقوب، دلّی کے ایک اچھے مستعد شخص تھے، اور اب میں سوچتا ہوں، تو واقعی اُن کو درسیات خوب مُستحضر تھیں۔ والد مرحوم سے وہ بیعت کر چکے تھے، اور جب مشغولیت بڑھ گئی تو پھر عربی اور منطق کا سبق اُن کے متعلق کر دیا گیا تھا، اور فارسی اور فقہ خود پڑھاتے تھے۔ فارسی میں چند اور چھوٹے چھوٹے رسالے پڑھانے کے بعد ابوالفضل کا حصہ اوّل پورا پڑھایا گیا۔ فقہ میں کنزالدقائق کے بعد شرح وقایہ پڑھتے رہے، اور شرح وقایہ کے بعد ہدایہ شروع کی، لیکن پہلی کتاب ختم کرنے کے بعد پھر اُنھوں نے اخیرین شروع کرا دی، اور درمیانی حصّے کو کہا کہ مطالعہ کرو۔ ہدایہ ابھی نصف تک ہوئی تھی کہ مشکوٰۃ اور جلالین شروع ہو گئی۔

مولوی محمد یعقوب سے ہم لوگ قطبی اور شرح ملّا پڑھتے تھے، لیکن الحمد للہ کہ شرح ملّا ناتمام رہی اور مرفوعات کی بحث سے آگے وقت ضائع نہ ہوا! قطبی ختم کر کے میبذی شروع کی گئی۔ اِس اثنا میں والد نے ہدایۃ الحکمت کی شرح مولانا عبدالحق خیرآبادی دیکھی تھی، چنانچہ میبذی کے ابھی پہلے ہی قسم میں تھے کہ اُن کے حکم سے اُسے چھوڑ کے خیرآبادی کی شرح شروع کر دی۔ مختصر المعانی مولوی محمد یعقوب سے پڑھی اور

مطوّل، والد مرحوم سے تا اِنّا قلتُ تک نہیں بلکہ آخر تک۔

اِس کے بعد والد سخت بیمار ہوگیے، حتّٰی کہ زندگی، خطرے میں پڑ گئی۔ علالت کی عام وجہ سے جب تعلیم میں حرج ہونے لگا، تو اُن کو خیال ہوا کہ دوسرا کوئی انتظام کریں۔ اُس زمانے میں ایک بڑے مستعد آدمی، مولوی نذیر الحسن مرحوم امیٹھوی، جو مولوی عبدالحق خیرآبادی کے شاگردوں میں مخصوص شخص تھے، کلکتہ آئے تھے۔ وہ والد مرحوم کے پاس آنے لگے، اور جب اُنھوں نے اُن کی استعداد کو قابلِ اطمینان پایا، تو مطوّل، اور شمس بازغہ اور رشیدیہ کا سبق اُن کے متعلق کر دیا۔

میں نے اپنی عمر بھر میں ایسا لسّان اور خوش بیان آدمی نہیں دیکھا۔ اُن کی خوش بیانی کو کسی طریقے سے بھی بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اِس بارے میں ایک مافوقِ العادت وجود تھے، اور گویائی پر اِس درجہ اُنھیں قدرت تھی کہ کوئی موضوع ہو، کوئی کتاب ہو، وہ گھنٹوں اِس روانی اور ربط کے ساتھ تقریر کرتے تھے کہ سننے والا حیران رہ جاتا تھا۔ درسیات پر اُن کو ایسا عبور تھا کہ تمام متنوں کے پورے معنوں میں حافظ تھے۔ درسِ نظامیہ کی معقولات بالکل یاد تھیں، میر زاہد، امورِ عامہ تک اُن سے پڑھا، اور اُن کی تقریریں اب تک مجھے یاد ہیں۔ وہ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی پڑھاتے ہوئے نہ تو اٹکے اور نہ کسی اعتراض سے بند ہوئے۔

اُس زمانے میں میرے خیالات میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو چکی تھیں، جیسا کہ آگے بیان کروں گا۔ میں اُنھیں اعتراضات سے بہت پریشان

کرتا تھا۔ وہ چیختے تھے۔ کتاب پٹک دیتے تھے۔ اُٹھ کے ٹہلنے لگتے تھے، لیکن اُن کی زبان بند نہ ہوئی تھی۔ میں نے تفسیرِ بیضاوی کا بھی ابتدائی حصہ اُن سے پڑھا۔ چند سبق ملا جلال کے بھی لیے، اور تقریباً تین سال تک وہ کلکتے میں رہے۔

اپنے مذہبی خیالات میں وہ اگرچہ بہت جامد و مقلّد تھے اور طبیعت کا میلان، تفضیلیت کی طرف تھا، لیکن اب میں سوچتا ہوں، تو اُن میں ایک تعجب انگیز بات یہ تھی کہ درسِ نظامیہ کے نقائص کا اُن کو بہت اچھا احساس تھا۔ معقولات میں توغل کی وجہ سے وہ اس میں تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اور شاخوں میں اُن کو اچھا ذوق تھا۔ اب مجھے حیرت ہوتی ہے، اُس وقت میں اس کو محسوس نہ کرتا تھا، کہ وہ اُس وقت مطوّل و مختصر کے بہت ہی مخالف تھے اور بکثرت اعتراض کیا کرتے تھے۔ سب سے پہلے سکّاکی مفتاح العلوم اُنھی نے مجھے دکھلائی اور بلاغت کا مقالہ پڑھایا۔ جلالین پر بھی بکثرت اعتراضات کیا کرتے تھے۔

دو اور شخصوں سے بھی مجھے پڑھنے کا اتفاق ہوا: ایک مولوی محمد ابراہیم، جو مولانا ہدایت اللہ جونپوری کے مستعد شاگرد تھے، اور دوسرے مولوی محمد عمر۔ آخر الذکر بالکل پرانی وضع کا نمونہ تھے۔ وہ پورا درس بالکل قدیم کتابی اردو میں دیا کرتے تھے۔ اِس درجہ وہ اِس کے پابند تھے کہ گھنٹوں تقریر کرتے رہیں اور معلوم ہو کہ گویا غدر سے پہلے کا کوئی لفظی

اردو ترجمہ، یا شاہ رفیع الدین مرحوم کا ترجمۃ القرآن سن رہے ہیں! ان سے میں بیضاوی پڑھتا تھا۔

تھوڑے دنوں تک شمس العلماءؒ مولانا سعادت حسین مرحوم سے بھی ہم دونوں بھائیوں کو پڑھنے کا اتفاق ہوا، جو مدرسۂ عالیہ کے مدرّس دوم تھے۔ یہ بڑے نیک نفس اور منکسر المزاج شخص تھے، اور مدرسے کے تمام لوگوں میں اس اعتبار سے مغتنم تھے کہ حدیث اور صحاح ستّہ کو انھوں نے رائج الوقت طریق پر اچھی طرح حاصل کیا تھا۔ شرح نخبۃ الفکر میں نے انھی سے پڑھی تھی۔

تعلیم میں مشکلات

والد مرحوم کو ہماری تعلیم کے بارے میں بڑی مشکلات پیش آئیں۔ ایک طرف تو ان کو علمائے وقت سے عام طور پر مذہبی سوءِ اعتقاد کی بدگمانی تھی اور ڈرتے تھے کہ ہم لوگوں پر وہابیت کا کوئی اثر نہ پڑ جائے۔ دوسری طرف علمی حیثیت سے بھی طبیعت میں ایسی بلندی واقع ہوئی تھی کہ کوئی اُن کی نگاہ میں نہ جچتا تھا۔ خود طرح طرح کے مشاغل جاری کر رکھے تھے، اِس لیے پورا وقت نکالنا مشکل تھا، اور اسی لیے اس بارے میں برابر متفکر رہتے تھے۔ ہمیشہ نئے نئے آدمیوں سے امتحانی ملاقاتیں کیں اور اپنے دونوں سخت معیاروں کی وجہ سے، یعنی مذہبی و علمی، کوئی شخص اُن کی نظر میں نہ جچا۔ نتیجہ اِس کا یہ نکلا کہ اتنے اچھے موافق حالات

کے ساتھ، جو، ہم لوگوں کو اپنے خاندان میں حاصل تھے، یعنی ہر طرح کی مالی فراغت دبے فکری، جتنے عمدہ طور پر اور وسعت کے ساتھ وقت کے بہترین عالموں یا درس گاہوں سے تحصیل کر سکتے تھے، وہ نہ کر سکے۔ مجھے اُس زمانے میں ہمیشہ یہ خیال غمگین رکھا کرتا تھا۔ کوئی ہفتہ ایسا نہ جاتا تھا کہ سخت جرأت کر کے اِس بارے میں ہم سلسلہ جنبانی نہ کرتے ہوں، لیکن کبھی سموع نہ ہوئی۔ میں نے ایک مرتبہ جرأت کر کے یہاں تک اشارہ کر دیا کہ ہم مجبوراً آپ کے جد مرحوم کی نظیر کی پیروی کریں گے، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ نہ وہ کبھی اِس پر راضی ہوئے کہ ہم کو باہر بھیجیں اور نہ گھر پر ہماری آرزوؤں کے مطابق انتظام کیا۔

ہم اُس وقت کے بڑے بڑے عالموں کا نام سنا کرتے تھے اور حیرت کرتے تھے کہ ہم کیوں نہیں اُن سے پڑھ سکتے۔ ہم دونوں کا بڑا موضوع بحث آپس میں یہی رہتا تھا۔ بچپن کی بے وقوفیوں میں سے یہ بھی ایک بے وقوفی تھی کہ اس بارے میں طرح طرح کے خاکے بناتے تھے، اور سازشی رنگ میں اِس پر مشورے بھی کرتے تھے، لیکن بچپن سے والد کا رعب اِس درجہ دلوں پر طاری تھا کہ خود مختارانہ فعل کی طاقت ہی سلب ہو گئی تھی۔

بہرحال صرف اس خیال سے تسکین ہوتی تھی کہ ہر سال واپسی حجاز کا چرچا بلکہ تیاریاں رہا کرتی تھیں، اور وہ کہتے تھے کہ یہ تو محض بدقسمتی ہے کہ میں یہاں رہ گیا ہوں، ورنہ تم لوگوں کی تعلیم تو عرب و شام میں ہوتی

تربیت

بچپن میں والد کی تربیت اس درجہ شدید اور سخت تھی کہ بہت کم لوگوں کو اُس کا تصور بھی ہو سکے گا۔ وہ سمجھتے تھے کہ باہر کی ذرا سی بھی آب و ہوا ہمیں گندہ کر دے گی۔ اُنھوں نے ابتدا ہی سے یہ اسلوب رکھا تھا کہ ہماری پوری دنیا، کھیل کود کی، سیر و تفریح کی، تعلیم کی، جو کچھ تھی صرف اپنا مکان یا اُن کا حلقۂ تربیت۔ بجز اُن کی معیت یا اجازت کے، جو بہت کم وقوع آتی تھی، چوکھٹ کے باہر قدم نہ رکھ سکتے تھے۔ صرف جمعے کے دن اُن کے ہمراہ جامع مسجد میں جاتے تھے، اور جب وہ منبر پر جاتے، تو حافظ صاحب ہمیں لے کر مسجد کے بالائی ہال میں چلے جاتے۔ وہ خود تو روزنِ سقف میں بیٹھ کر وعظ سنتے اور ہم وہاں کھیلتے۔ کبھی کبھی اُنھیں اونگھتا یا سوتا پا کے سیڑھی سے اُتر کر صحن مسجد میں بھی آ جاتے تھے۔ یہ ہماری انتہائی آزادی، اور بچپن کا گویا سدرۃ المنتہٰی تھا!

سال میں صرف ایک دو مرتبہ اس کا موقع ملتا تھا کہ ہم حافظ ولی اللہ کے ساتھ شہر جا سکیں۔ اِس کے علاوہ گھر میں بھی کوئی بچپن کے کھیل کود کا سامان نہ تھا۔ نہ وہ معمولی آلات و وسائل تھے، جن سے لڑکے عام طور پر کھیلا کرتے ہیں۔ ہندستانی کھیل کود کے اقسام اور اُن کے طریقے بڑے ہو کر ہم نے بطور معلومات کے معلوم کیے، ورنہ بچپن

میں اُن سے بالکل نا آشنا تھے۔

ماں سے خالی گھر!

والد مرحوم کی ہیبت، اُن کی شفقت پر غالب تھی۔ مجموعی طور پر اُن کی زندگی چونکہ بزرگی، عظمت، اور عوام پر اثر سے مرکب تھی، اور گھر ماں سے خالی تھا، اِس لیے قدرتی طور پر ہم لوگوں کو گھر میں بھی اُن کا وہی اثر غالب نظر آتا تھا، اور قلب اِس قدر مرعوب ہو گیا تھا کہ اُن کی آواز سے ہم سب لوگ کانپا کرتے تھے۔

اُن کو مجلسی آداب کا بہت خیال تھا۔ اِس بارے میں وہ اپنا بچپن جس طرح گزار چکے تھے، پچاس ساٹھ برس بعد اپنی اولاد کو بھی اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ کھانے پینے، چلنے پھرنے، لباس، نشست و برخاست، اِن ساری باتوں کے اِس عمر میں بھی آداب و قواعد تھے، اور ہم مجبور تھے کہ اُن سے سرِمو بھی انحراف نہ کریں۔ بستر پر جانے، صبح کو اُٹھنے، نماز کے اوقات، دستر خوان پر بروقت حاضری، اِن ساری باتوں میں اُنھوں نے جو ڈھنگ قرار دے دیا تھا، ہم اُسی سانچے میں ڈھل گیے تھے۔ یہ اُس وقت کی بات ہے، جب ہم دونوں بھائیوں کی عمر دس برس سے زیادہ نہ تھی، لیکن ہم اِس زندگی کے عادی ہو گیے تھے۔ طبعی طور پر کھیل کود کے جذبات فنا تو نہیں ہو سکتے، مگر حد درجہ تشدد، معیت و ہم صحبتی کے فقدان، اور صرف ایک والد ہی کے نمونے کی

موجودگی سے تمام اِس طرح جذبات افسردہ ضرور ہوگیے تھے، اور اُن کی جگہ ایک قبل از وقت سنجیدگی پیدا ہوگئی تھی۔

ناشتے کے پیسے کتابوں پر!

اِس کا اثر قدرتی طور پر جسم و صحت کے لیے تو یقیناً بہتر نہ ہوا، لیکن اخلاقی وذہنی طور پر ایک غیر معمولی نتیجہ حاصل ہوگیا، اور اِس چیز نے خاص طور پر تعلیم سے بھی زیادہ فائدہ پہنچایا۔ یہ بات کہ دس برس کی عمر میں کھیل کود کی جگہ ایک لکھنے پڑھنے والے نوجوان کی سنجیدگی پیدا ہوجائے، اور کسی حالت میں ممکن نہ تھی۔ دس برس کی عمر میں مجھے کتابوں کا اِتنا شوق ہوگیا تھا کہ ناشتے کے جو پیسے ملتے تھے، اُن کو جمع کرتا تھا اور اُن سے کتابیں خریدتا تھا۔ اِس اثنا میں، جیسا کہ آگے آئے گا، مجھے اردو کتابوں کے مطالعے کا شوق ہوا۔ یہ بھی گویا ایک سخت تعلیمی "بد چلنی" تھی، جس کو ہم صرف ایک جرم کی طرح محض مخفی طور پر ہی کر سکتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ شوق بھی کھیل کود کا شوق نہ تھا!

اُس وقت حالت یہ تھی کہ صبح کو اٹھ کر والد مرحوم سے سبق لیتے تھے، اِس کے بعد ہی باہر کے سبق کا وقت آجاتا تھا۔ دوپہر کو مطالعے اور یاد کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ سہ پہر کو پھر والد مرحوم بلاتے تھے اور باہر جو کچھ پڑھ چکے ہیں، اُسے سنتے تھے، یا بغیر کتاب کے ویسے ہی معلومات کی باتیں سناتے، یا اور کوئی مفید تذکرہ چھیڑ دیتے۔

مغرب کے بعد پھر ایک سبق والد مرحوم کے پاس ہوتا۔ اب جو وقت رہ گیا، وہ صرف سونے ہی کا ہے

اپنے شوق کے مطالعے کے لیے صرف اِسی میں بچت نکل سکتی تھی، چنانچہ میں اپنے بستر کے نیچے کتابیں رکھتا، اور موم بتی جلا کے مطالعہ کرنے لگتا۔ اگر دن کو اور مطالعہ کرتا رہا، تو درسی کتابوں کا شب کو مطالعہ کرتا۔ اکثر ایک ایک دو دو بجے تک مشغولیت رہتی۔ اس کی وجہ سے اُسی وقت سے میری صحت میں فتور آنے لگا تھا۔ یہ ٹھیک دس سے لے کر بارہ برس کی عمر کا واقعہ ہے۔

والد اِس کے بہت مخالف تھے، تاہم درسی کتابوں کی تحصیل کی بھی جتنی مقدار تھی، اُس میں حفظِ صحت اور تفریح کا کہاں وقت نکل سکتا تھا۔ اصل یہ ہے کہ طبیعت کو ابتدا ہی میں جب اس طریق پر اُبھرنے کا موقعہ نہ ملا، تو اُس کے تمام جذبات مُرجھا گئے، اور پھر اس طرف ایسے لگے کہ تمام جذبات کا مصرف، مطالعہ و درس ہی ہو گیا۔ والد مرحوم کو کچھ کچھ پتہ چلا کہ میں درسی کتابوں کے علاوہ اور کتابیں بھی دیکھا کرتا ہوں، تو وہ بہت سختی سے مانع ہوئے اور اس کی نگرانی کرنے لگے۔

شاعری کا چسکا

اِسی زمانے میں مجھے شاعری کا بھی شوق ہوا، اور پہلے اردو

اور پھر فارسی میں طبع آزمائی کرنے لگا، لیکن یہ اُس وقت کی بات ہے، جب متوسط کتابیں ختم ہو چکی تھیں۔

والد مرحوم کو طب سے بھی ذوق تھا۔ اُنھوں نے اوائل عمر میں بہت عمدہ طور پر طب پر توجہ کی تھی، اور خلق اللہ سے علائق رکھنے کی وجہ سے ہمیشہ کچھ نہ کچھ اِس کا عملی سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ وہ اپنے خاص علاقہ رکھنے والے لوگوں کو علاج میں مشورہ دے دیا کرتے تھے۔ محض تکمیل کے خیال سے اُنھوں نے ہم لوگوں کو طب بھی پڑھانا شروع کی۔ سدیدی تک خود اُن سے پڑھی، اور اِس کے بعد حکیم سید باقر حسین سے، جو اطرافِ اودھ کے ایک اچھے مستعد طبیب تھے، اور مطب سے زیادہ علمی ذوق رکھتے تھے، ساتھ ہی نہایت غالی شیعہ تھے۔ وہ ایک نزع کی بنا پر جو اُن میں اور حکیم محمد سجاد موہانی مرحوم میں، جو کلکتے کے نامی طبیب تھے، قانون کی ایک عبارت کے متعلق ہو گئی تھی، وہ والد مرحوم کے پاس آئے۔ کیونکہ فریقین نے باہم فیصلے کی یہ صورت ٹھہرائی تھی کہ والد مرحوم کے فیصلے کو ہم تسلیم کر لیں گے۔ اِسی سلسلے میں والد مرحوم پر اُن کی طبی معلومات کا اچھا اثر پڑا اور اُنھوں نے ہم لوگوں سے کہا کہ باقاعدہ اُن سے درس لیا کرو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک درس کا اور اضافہ ہو گیا، حالانکہ دِن کے بارہ گھنٹوں میں وقت کا اضافہ کیونکر ہو سکتا تھا؟ یہاں پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ والد مرحوم

نے باوجود اِس علم کے کہ وہ نہایت غالی شیعہ ہیں، ہمیں اُن سے پڑھنے کی تو اجازت دے دی، لیکن وہ کبھی کسی ایسے شخص کی ہوا بھی نہ لگنے دیتے تھے، جس کی نسبت اُنھیں "وہابیت" کا ذرا سا بھی گمان ہو، لیکن یہ سلسلہ صرف سات آٹھ مہینے تک رہا۔ اِس کے بعد وہ وطن چلے گیے، اور پھر میں نے بھی صاف صاف کہہ دیا کہ اِس طب میں طبیعت نہیں لگتی، لیکن بھائی مرحوم نے اپنے ذاتی شوق سے قانون کے تینوں ضروری مباحث کی تکمیل کرلی تھی۔

بہنوں کی تعلیم

ایک بات والد مرحوم کی زندگی میں یہ عجیب تھی کہ باوجودیکہ اُنھیں آج کل کے خیالات سے کوئی علاقہ نہ تھا، اور اگر کچھ تھا، تو مخالفانہ، لیکن وہ اپنے قدیم خیالات ہی کی بنا پر یہ طرز عمل رکھتے تھے کہ اُنھوں نے تعلیم کے اعتبار سے اپنے لڑکوں اور لڑکیوں میں عملاً کوئی تفریق نہیں کی تھی۔ اُنھوں نے ہماری بہنوں کو بھی اُتنا ہی اور ویسے ہی تعلیم کا اہل سمجھا، جیسا کہ ہم کو، اور یکساں ہمّت اُن پر بھی مبذول کی۔ بڑی بہن، جن کی پیدائش، قسطنطنیہ کی تھی۔ وہ ہم لوگوں سے عمر میں بہت بڑی تھیں، لیکن اُن سے دو چھوٹی بہنیں، جن کی عمروں اور ہماری عمروں میں دو دو سال کا تفاوت تھا، وہ اُس وقت تک برابر ہماری ہم درس رہیں، جب تک ہم

والد مرحوم سے پڑھتے رہے۔ فارسی میں چونکہ آخر تک کی تعلیم والد مرحوم ہی سے پائی، بجز چند اجزا کے، اِس لیے اُن کی بھی اُتنی ہی تعلیم ہوئی، جتنی کہ ہماری۔ عربی میں البتہ صرف و نحو اور ادب کا اُتنا حصّہ جتنا کہ ابتدا میں والد مرحوم سے پڑھا تھا، یعنی مقامات تک، اس میں بھی وہ ہماری ہم درس تھیں۔ اِس کے بعد ہم لوگ جب باہر پڑھنے لگے تو پھر اور مزید تعلیم بالالتزام جاری نہیں رہی، تاہم کچھ دنوں تک جب ہم لوگ والد مرحوم سے مُطوّل پڑھ رہے تھے، تو وہ پھر شریک کر لی گئی تھیں، لیکن پھر چونکہ مولوی نذیر الحسن آ گیے تھے، اِس لیے مُطوّل کا سلسلہ بند ہو گیا، اور وہ تنہا شرح عقائد نسفی پڑھتی تھیں۔

ہم لوگ چونکہ اس زمانے میں تعلیم میں مصروف تھے اور والد کی مشغولیت بہت بڑھ گئی تھی، ساتھ ہی بینائی میں ضعف بھی آ گیا تھا، اِس لیے اُن کا جس قدر لکھنے پڑھنے کا کام تھا، وہ ہماری منجھلی بہن عہ ہی کے سپرد ہو گیا تھا، چنانچہ تمام تصنیف و تالیف کے مسوّدے لکھنا، اُن کو صاف کرنا خط و کتابت کرنا اور تمام باتیں اپنی بتادی' تک وہی کرتی رہیں۔ چونکہ ہم سب میں حسنِ خط، اور والد مرحوم کے خط سے اشبہ ہونے کے اعتبار سے اُنھی کا خط سب سے بہتر تھا، اِس لیے جو لوگ والد سے خط و کتابت کے عادی تھے، وہ اس تبدیلی کے بعد بھی آخر تک محسوس

عہ محترمہ آرزو بیگم صاحبہ، جو خدا کے فضل سے بقیدِ حیات ہیں۔

نہ کرسکے کہ والد مرحوم کے خطوط کسی دوسرے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔
چنانچہ منجھلی بہن کو چونکہ ہم لڑکوں کے ساتھ پڑھنے کے بعد بھی سال ڈیڑھ سال تک مزید درس کا موقعہ ملا، اس لیے انھوں نے حدیث وفقہ کی کتابیں بھی بہت حد تک ختم کرلی تھیں۔ اُن سے چھوٹی بہن* چونکہ اس کے بعد بہت بیمار ہوگئی تھیں اور عرصہ تک رہیں، اس لیے وہ اس حصۂ تعلیم میں شریک نہ ہوسکیں۔

والد کا طریق درس

والد مرحوم کا پڑھانے میں بھی ایک ایسا انداز تھا، جو عام طور پر رائج نہیں ہے۔ عام طریقہ، جو برسوں سے چلا آتا ہے، یہ ہے کہ متن کے حل وتشریح پر اساتذہ قناعت کرلیتے ہیں، اور پھر اگر ان کے خیالات کو جنبش ہوتی ہے، تو صرف بعض زبان دراز طالب علموں کے اعتراضات کرنے سے، اور اس پر بھی صاحب نظر اساتذہ کچھ کچھ بیان کرتے ہیں اور بعض رہ جاتے ہیں، والد مرحوم کا یہ حال نہ تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ سوال کے منتظر نہ رہتے تھے، اور بہتر سے بہتر اور وسیع سے وسیع تقریر، جو اس بارے میں اُن کی زبان پر جاری ہوجاتی تھی، اُسے جاری رکھتے تھے، حتٰی کہ مطالب ومقاصد کتاب کے متعلق کوئی ضروری سوال

---

* مرحومہ آبرو بیگم صاحبہ

باقی ہی نہیں رہتا تھا، اور اگر کچھ سوال کرنا ہوتا تھا، تو پھر اس کے بعد کیا جا سکتا تھا۔

وہ بالکل اس کی کوشش نہیں کرتے تھے کہ کسی خاص دائرۂ بیان میں محدود رہیں، یا شرح و حواشی سے آگے نہ بڑھیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ شرحیں اور حواشی، شاگردوں کی اعانت کے لیے ہیں نہ کہ خود اساتذہ کے لیے۔ ان کو تو تم آپ پھر پڑھ ہی لوگے۔ میں اُن باتوں پر زور دوں گا، جو تمہیں ان میں نہیں مل سکتیں۔

عام طور پر حکم یہ تھا کہ کتاب زیرِ درس کو پوری طرح حل کر کے اور اُن کے حسبِ ہدایت شرح و حواشی پڑھ کے آنا چاہیے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ وہ امتحان لینے لگتے کہ ہم نے شرحیں اور حواشی دیکھے ہیں یا نہیں، اور نصف سے زیادہ مقصودِ درس اس میں حاصل ہو جاتا، پھر اس کے بعد وہ اپنی تقریر شروع کرتے۔ مثلاً شرح وقایہ ہم نے اس طرح پڑھی کہ گویا نہیں پڑھی۔ شرح وقایہ کے دو بہترین حاشیے اور تقریباً تین چار شرحیں اُنھوں نے ہمیں دیں، اور ہدایت یہ تھی کہ جو سبق درپیش ہو، اُس کو خود اس طرح حل کریں کہ گویا کل پڑھنے کی جگہ پڑھانے کا معاملہ درپیش ہے۔ جب درس کا وقت آتا تو پہلے وہ کتاب خود لیتے اور اس طرح پوچھتے گویا ہم پڑھا رہے ہیں۔ پھر جو کوتاہیاں ہوتیں، اُن کو واضح کرتے اور مزید بیان بعد کو شروع ہوتا۔

علم پر پہلا انعام!

اس طریقے سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ درس کے ساتھ ساتھ مطالعہ اور حلِ عبارت کا ملکہ اس طرح حاصل ہوگیا۔ جو برسوں میں بھی بعد کو مشکل ہوتا۔ یہی وہ چیز ہے جس کے لیے متون و شروح کا طریقہ، متأخرین نے اختیار کیا، حالانکہ اس کے لیے بہترین طریقہ یہی ہے کہ درس کے علاوہ تنہائی میں مطالعہ کی بھی مشق کرائی جائے۔ اکثر ایسا ہوا کہ پورا سبق اسی طریقے سے صاف ہوگیا، اور جہانتک تعلق، حلِ عبارت و مسائل کا تھا، کسی مزید بیان کی ضرورت پیش نہ آئی۔ متنِ وقایہ کی عبارت جس قدر پیچیدہ اور حد سے زیادہ مختصر اور ضمائر پر مبنی ہے، وہ معلوم ہے، لیکن پہلے کتاب، مطالعہ کرنے کے بعد ہی ہم تقریباً پوری طرح حل کر کے درس میں بیٹھا کرتے تھے۔ کتاب النکاح میں جو ٹکڑا، محرمات کا ہے، وہ ترکیب عبارت کے اعتبار سے بہت مشکل سمجھا جاتا ہے، جیسا کہ شارحین نے تصریح کی ہے، لیکن جب میں نے پورا ٹکڑا قبل از درس حل کر کے عرض کر دیا، تو والد مرحوم بہت خوش ہوتے تھے، اور مجھے یاد ہے کہ جاڑے کا موسم تھا اور عمدہ کشمیری شال انھوں نے مجھے بطور انعام کے دی تھی۔

سب سے بڑی برکت!

ایک بڑا فائدہ اس سے اس زمانے میں ہمیں یہ ہوا کہ نہایت ہی

بھرا ذوق، مطالعہ کا شروع ہو گیا اور طبیعت اس میں اس طرح ذوق لینے لگی کہ طالب علمی کے زمانے میں بمشکل ایسا ہو سکتا ہے۔ یہی سب سے بڑی برکت ہے، جو والد مرحوم سے پڑھنے میں مجھے حاصل ہوئی، اور میرا یقین ہے کہ میرے تعلیمی ایام کا حاصل و خلاصہ صرف یہی ہے۔ کتب بینی اور ذاتی خوض و نظر سے مطالعہ اور اُس میں استعداد، یہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں والد کے سخت طریقِ تعلیم سے ہی حاصل ہو سکی تھی۔

یہ بات، حسن میں داخل ہو یا قبح میں، مگر یہی تھی کہ اُن کے درس کی تقریر بہت دُور دُور تک پھیل جاتی تھی۔ ہر طرح کے مباحث و مسائل تھوڑے سے تعلق و ربط سے بھی آجاتے تھے۔ "بدقسمت وہابیوں" کا رد بھی بارہا شروع ہو جاتا تھا۔ اپنی زندگی کے حالات اور بزرگوں کے مباحث، بہت سے گزشتہ عہد کے قیمتی تاریخی واقعات، علی الخصوص غدر سے پیشتر کے ملکی حالات بھی ہم کو اثنائے درس ہی میں اُن سے سُننے میں آئے۔

والد کا حافظہ

اُن کا حافظہ بھی عجائباتِ روزگار میں سے تھا۔ یہ بات تو اُن کو یاد نہیں رہتی تھی کہ صبح کے کھانے میں کونسی ترکاری گوشت کے ساتھ پکی تھی، لیکن یہ بات اُن کے ذہن میں بالکل نقش ہوتی تھی کہ پچاس برس پہلے اُنھوں نے کون کتاب دیکھی یا پڑھی تھی، وہ کتاب کس تقطیع

گی ہے، اُس کی جلد کس رنگ کی ہے، عبارت، صفحے کے دہنی جانب ہے یا بائیں جانب! پڑھاتے وقت کبھی اُنھوں نے مطالعہ نہیں کیا، اِلّا یہ کہ اثنائے درس میں کوئی خاص چیز نکل آئی اور اُنھوں نے ہم سے کہہ دیا کہ عینی اُٹھا لاؤ، یا فتح القدیر اُٹھا لو، یا فلاں کتاب دے آؤ اور کہا کہ فلاں مقام نکالو، اور اِس طرح وہ بات مزید روشنی میں آ گئی۔

اپنی ذہانت کا احساس

بچپن ہی میں میں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ ذہن مجھے غیر معمولی کام دے رہا ہے۔ چنانچہ مجھے یاد نہیں ہے کہ تعلیم کے زمانے میں، ابتدا سے لے کر آخر تک، کبھی بھی میں نے سبق کے رٹنے میں، یا اُس کو بار بار دہرانے میں عام طالب علمانہ طریقہ اختیار کیا ہو۔ عموماً یا تو سبق لیتے وقت کی یادداشت کفایت کرتی تھی، اور یا آیندہ سبق کو اساتذہ کی ہدایت کے مطابق تیار کرنے میں جو کچھ بھی ذہن کام کر لیتا تھا، اُسی پر میں قناعت کر لیتا تھا، لیکن ایک مرتبہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی گزشتہ سبق کے امتحان یا سوال میں کسی طرح کی لغزش ثابت ہوئی ہو۔ ایک مرتبہ مجھے یاد ہے کہ بڑے معرکے کی بحث، جعلِ بسیط، جو ہمارے معقولیوں کے لیے ایک بڑی ہی مغز پاش بحث ہے، اور جس پر ذہن اور علم کی شارحین اور مدرسین بڑی بڑی مجادلانہ قوتیں خرچ کرتے ہیں، مولوی نذیر الحسن مرحوم نے بھی اپنی عادت کے مطابق کئی گھنٹے مغز پاشی

کی، دوسرے دن اُنھوں نے امتحاناً سوال کرنا چاہا، تو میں نے اُنھیں روک دیا، اور اِس بارے میں مبحث کا خلاصہ، دونوں مذہب، اُن کے دلائل، اور علامہ ادانی کی ترجیح اور اُس پر اپنے اعتراضات سنا دیے۔ اعتراضات کا وہ کوئی جواب نہ دے سکے، اور باقی حصے کو سُن کے مبہوت رہ گیے!

تدریس کا آغاز

اُس دن سے وہ کہا کرتے تھے کہ تمھیں اب پڑھانا چاہیئے۔ پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں، چنانچہ اُنھوں نے اصرار کرکے والد مرحوم کو مجبور کیا کہ وہ ہمیں پڑھانے کی اجازت دیدیں، جس کی اجازت دینے میں انھیں تامل تھا، اور کہتے تھے کہ اِس میں وقت ضایع ہوگا، چنانچہ مغرب کے بعد گھر پر ہم نے درس دینا شروع کر دیا۔ کچھ طلبہ، مدرسۂ عالیہ کے اور کچھ طلبہ اُس مدرسے کے، جو حافظ رمضان مرحوم نے مولوی نذیر الحسن کے لیے قائم کیا تھا، باقاعدہ آنے لگے۔

میں نے صرف و نحو میں ہدایۃ النحو سے لے کر شرح ملا تک، منطق میں شرح تہذیب، میبذی، قطبی، بعض حواشی، اور فقہ میں ہدایہ، اور حدیث میں شرح نخبۃ الفکر اور مشکوٰۃ، اور مختصر المعانی کا درس دیا۔ معقولات میں متوسط کتابوں اور مختصر المعانی کا تقریباً تین مرتبہ، اور اور کتابوں کا صرف ایک ہی مرتبہ دَور ہوا۔

کج نظری سے بے میلی

اُس زمانے کی نسبت جب غور کرتا ہوں، تو طبیعت کا بڑا ہی عجیب شوق وولولہ یاد آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی کامیابی انھی کتابوں اور علوم کی تکمیل ہے۔ جب تک طبیعت میں وہ تغیرات شروع نہیں ہوئے تھے، جو کسی دوسرے وقت بیان کروں گا، اُس وقت تک۔۔۔ اِن چیزوں میں طبیعت کو پورا استغراق تھا، البتہ ابتدا ہی سے طبیعت کو کج نظری اور بے عنوانی سے اس طرح بے میلی تھی کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اوائلِ تعلیم میں بھی کسی کتاب کی یا تقریر کی بے عنوانی پر طبیعت مطمئن نہ ہوئی۔ ابتدا میں کوشش کرتے کہ بات صاف ہو جائے اور جب جواب نہ ملتا، تو مزید سوال چھوڑ دیتے۔ مگر طبیعت میں خلش باقی رہتی۔ میرے اعتراضات کا کبھی تشفی بخش جواب، اساتذہ سے نہیں ملا۔ جو چیزیں والد مرحوم سے پڑھیں، اُن میں ایک خاص حد تک استفسار کرنے کے بعد بوجہ اُن کے رعب و ہیبت کے مزید اظہار شک کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ وہ سختی سے ڈانٹ بھی دیتے تھے، اور چپ ہو جانا پڑتا تھا۔ لیکن دوسرے اساتذہ کے ساتھ یہ حال نہ تھا۔ میری تقریر انھیں مبہوت کر دیتی تھی!

گویائی کا جوش

بچپن ہی سے میں اپنے اندر گویائی کا ایک سخت جوش پاتا تھا حتیٰ

کہ جب کوئی مخاطب نہ ملتا تو جو آدمی مل جاتا، تو اُسی کے آگے لمبی لمبی تقریریں شروع کر دیتا۔ گھر میں مُریدوں اور معتقدوں کی کمی نہ تھی، جن میں اہلِ علم کم، عوام زیادہ تھے، لیکن دونوں پیرزادہ سمجھ کر ہماری ہر بات پر اعتماد و صدقنا کہتے تھے، اور مذہبی حُسنِ اعتقاد کے کانوں سے سنتے تھے۔ میرے لیے اُن کا سامعہ گویائی کی پہلی مشق تھا۔ مغرب کے بعد پچاس ساٹھ آدمی بالالتزام باہر کے دیوان خانے میں بیٹھا کرتے تھے، اور جب کبھی مجھے باہر بیٹھنے کا موقعہ ملتا، تو وہ قدرتی طور پر کوئی نہ کوئی سوال کرتے اور پھر میری گویائی کو نمود کا موقعہ ملتا۔ میں دو دو گھنٹے تک تقریر کرتا، اور اس میں بڑی لذت محسوس کرتا!

اُس وقت میری عمر، دس گیارہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ عام طور پر لوگوں کو اس پر استغراب ہوتا اور ہمارے معتقدین اس کو اس خاندان کی ایک خارق العادت کرامت قرار دیتے، چنانچہ عام طور پر کلکتے میں شہرت تھی اور اس کو منجملہ والد مرحوم کے خوارق کے قرار دیا جاتا تھا کہ دس برس کی عمر میں اُن کے لڑکے وعظ کرتے ہیں! وعظ سے مقصود وہ بکواس تھی، جو میں شب کو پچاس ساٹھ آدمیوں کے مجمع میں کیا کرتا تھا!

اِس گویائی کا نشانہ، اساتذہ بھی رہے اور اُن پر میری گویائی کا رعب قائم رہا۔ مولوی نذیر الحسن مرحوم نے تو یہ التزام کر لیا تھا کہ مجھے پڑھاتے وقت اور کسی طالب علم کو ساتھ نہ لاتے کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ ان کا عجز و حیرت اُن کے دوسرے طالب علموں پر ظاہر نہ ہو، البتہ یہ ضرور تھا کہ غیر معمولی طور پر اِتنی کم سنی میں میرا اِن کتابوں کو پڑھنا اور اُن پر تقریر کرنا، اور اعتراضات

سے لاجواب کر دیتا، اُن کے دل پر شاق نہیں گزرتا تھا، بلکہ ایک خاص دلچسپی پیدا کر دیتا تھا۔

عُمر کی مشکل!

یہ عجیب بات ہے کہ مِن جملہ اُن باتوں کے جنہوں نے مجھے گزشتہ سالوں میں نہایت عاجز کر دیا تھا، ایک چیز یہ مسئلہ بھی تھا کہ میری عمر کتنی ہے۔ اُس وقت کے اساتذہ، اور واقف کاروں سے لے کر اور بعد کی وسیع واقفیت و ملاقاتوں اور مجامع کی شرکت تک ہمیشہ لوگوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ اِس پر شک کیا کہ میری عمر اُتنی ہی ہے جتنی میں بیان کرتا ہوں۔

عام طور پر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ بعض لوگوں کا ہیکل ایسا ہوتا ہے کہ اُن کی عمر زیادہ ہوتی ہے، مگر دیکھنے میں معلوم نہیں ہوتی، میں بھی اُنھی لوگوں میں ہوں۔ جس زمانے کا میں حال بیان کر رہا ہوں، اُس زمانے میں میرے اساتذہ نے والد مرحوم تک سے جرأت کر کے پوچھ لیا۔ اُنھوں نے یہ بھی کہدیا کہ اِس کا نام، "فیروز بخت"، تاریخی ہے، لیکن مولوی نذیر الحسن، مولوی محمد ابراہیم وغیرہ نے کبھی تسلیم نہیں کیا، وہ ہمیشہ ہنستے اور کہتے کہ تمہاری عمر، کم سے کم اٹھارہ اُنتیس برس کی ہے، لیکن تم بونے ہو۔ دکھائی نہیں دیتے!

اِس کے بعد یہ مصیبت برابر قائم رہی، حتیٰ کہ میرے لیے ایک خلش بھی ہو گئی تھی اور اِس خیال سے میں بڑی اذیت محسوس کرتا تھا۔ پھر یہ ہوا

کہ عمر کے سوال کا جواب دینا ہی بند کر دیا۔

۱۹۰۱ء میں ندوۃ العلماء کا کلکتے میں جلسہ ہوا اور بہت سے علما جمع ہوئے۔ میں اُس وقت آخری کتابیں پڑھ رہا تھا اور ندوے کے معاملات اُس کے جھگڑوں مباحثوں میں پوری طرح دلچسپی لیتا تھا۔ میں اُس زمانے میں مجامع عامہ میں تقریر کرنا شروع کر چکا تھا۔ مقامی مشاعروں میں اور ملک کے مشہور گلدستوں میں میرا کلام مقبول ہو چکا تھا، اور اردو مضامین نگاری بھی کرنے لگا تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے رسالے بھی لکھے تھے۔ ایک ضخیم کتاب بھی لکھنی شروع کر دی تھی۔ ندوہ اور اُسکے مخالفین کے جھگڑوں اور ندوہ کی حمایت میں متعدد تحریریں لکھی اور شایع کی تھیں۔

مولانا عبدالحق حقّانی

اُس وقت میری عمر ۱۴، ۱۵ برس سے زیادہ نہ تھی، لیکن بڑی مصیبت یہ تھی کہ کوئی شخص اِس بیان کو تسلیم نہیں کرتا تھا، گو وہ اپنی قرار دادہ عمر کے بعد بھی اظہار استغراب سے باز نہیں رہ سکتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مجمع میں مولوی نذیر الحسن بھی ساتھ تھے، اور جب اُن سے مرحوم عبدالحق حقانی نے میری عمر پوچھی اور انھوں نے اپنی عادت کے مطابق ہنس کر کہا کہ یہ تو ایک بہت ہی مابہ النزاع مسئلہ ہے، تو مجھے بڑا غصہ آیا، اور گو وہ میرے استاد تھے، لیکن میں نے اِس سختی سے اُس وقت گفتگو کی کہ یہ سب لوگ دم بخود ہو کر رہ گئے۔ اُنھیں میری صورت دیکھکر ایسی رواں اور اونچے الفاظ

اور ترکیبوں کی تقریر کی امید نہ تھی۔

اسی زمانے میں شاہ سلیمان صاحب (مرحوم) سے ملاقات ہوا کرتی تھی اور وہ کہتے تھے کہ تمہاری عمر ۵۲ برس کی ہے۔ مولوی ظہیر الحسن مرحوم، جن سے میں نے شاعری میں اصلاح لینی شروع کی تھی، عرصے کی خط و کتابت اور معائنۂ کلام کے بعد جب کلکتہ آئے اور اسٹیشن پر میں اُن سے ملا، تو مکان تک راستے بھر وہ بالکل گم رہے، اور بار بار اس طرح پوچھتے رہے۔ گویا اُن کو ابھی اس میں شک ہے کہ جو کلام میں اُن کو بھیجتا ہوں، وہ میرا نہیں کسی اور کا کہا ہوا ہے۔ لیکن جب وہ دو چار دن رہے اور ہر طرح کی گفتگو اور مباحث میرے سنے، اور اسی زمانے میں ایک مختصر مشاعرہ بھی ترتیب پایا، جس میں خود اُنھوں نے دوپہر کے وقت مصرع طرح مجھے دیا اور مغرب تک میں نے اکتالیس شعر لکھ کر اُنھیں دے دیے، تب اُن کی بدگمانی تو دور ہوئی، مگر استعجاب باقی رہا۔

مولانا شبلی نعمانی

مولانا شبلی نعمانی سے میں ۱۹۰۴ء میں سب سے پہلے بمبئی میں ملا جب میں نے اپنا نام ظاہر کیا، تو اس کے بعد آدھ گھنٹے تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، اور چلتے وقت اُنھوں نے مجھ سے کہا، تو ابو الکلام آپ کے والد ہیں! میں نے کہا کہ نہیں، میں خود ہوں۔ ۱۹۰۴ء میں جب یہ وقت پیش آتی تھی، تو ۹۹ء سے لے کر ۱۹۰۱ء تک اس بارے میں میری پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے!

بندشیں ڈھیلی ہوئیں

جو شدید بندشیں ہمارے بچپن میں تھیں، وہ اِس زمانے میں آہستہ آہستہ کم ہونے لگیں۔ اب یہ ہوا تھا کہ اونچی کتابیں پڑھنے لگے تھے اور اس قدر کم سن بھی نہیں رہے تھے۔ کہیں دور جانے کی تو اجازت نہ تھی، لیکن پانچ وقت مسجد میں، جو گھر سے قریب تھی، جانے لگے تھے، اور پھر عصر و مغرب کے وقت بھی کہیں باہر جا سکتے تھے۔ اتنی زیادہ پوچھ گچھ باقی نہ رہی تھی، یہ بات بھی نہ تھی کہ پہلے کی طرح بمجرد ہماری غیر حاضری کے والد غضبناک ہو جائیں۔ پہلے پہل یا تو مسجد میں عصر و مغرب کے وقت زیادہ دیر تک ٹھیر جاتا اور وہاں کچھ لوگ آجاتے اور اُن سے صحبتیں رہتیں۔ شاعری کے ذوق کے زمانے میں اِن میں شاعر بھی ہوتے تھے۔ ایک بہت معمّر اور کہنہ مشق شاعر عظیم آباد پٹنہ کے محمد شاہ شہرت مرحوم تھے۔ اِن کی عمر اٹھانوے برس کی تھی اور بہت پُرگو شاعر تھے۔ وہ بھی مغرب سے لے کر عشاء تک مسجد میں بیٹھتے اور کبھی کبھی میں بھی بیٹھ جاتا۔ وہیں گاہ گاہ شاہ سلیمان صاحب (پھلواروی) بھی آیا کرتے تھے، اور وہیں اُن سے بھی میں ملتا تھا، اور کوئی نیا عالم شہر میں آیا ہو، تو وہ جامع مسجد میں ضروری آتا تھا اور والد مرحوم سے ملنے کے خیال سے مجھ سے ضرور ملتا تھا۔ ایسے لوگوں سے بھی بات چیت ہوتی تھی۔

مولانا محمد حسین آزاد

مسجد کے نیچے اُس زمانے میں مولوی ضیاء الرحمان نامی ایک مولوی

نے کتابوں کی دکان کھولی تھی، اور مجھے کتابوں کا شوق ہو چکا تھا۔ میرا ایک بڑا اڈا اُن کی دکان بھی تھی۔ وہ عربی فارسی اردو کی ایسی کتابیں بھی منگواتے تھے، جو معمولی دکانوں میں نہیں آتی تھیں۔ میں وہاں جاکر ہر طرح کی کتابیں مطالعہ کرتا اور جو لے سکتا، خرید لیتا، اردو کی نئی کتابوں کے مطالعے کا بھی شوق نیا نیا ہوا تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ کی کتابیں وہیں میں نے دیکھیں اور خریدیں۔ وہاں اور بھی اچھے آدمی آجایا کرتے تھے، اور طرح طرح کی باتیں رہتی تھیں۔

تقریباً اسی زمانے میں ندوۃ العلما کا کلکتے میں جلسہ ہوا۔ جلسے سے بہت پہلے دونوں فریق اپنی اپنی تیاریوں کے لیے کلکتہ آگئے۔ ایک طرف ندوے کا کیمپ تھا، اور وہ جامع مسجد کی عمارت میں تھا دوسری طرف مولوی احمد رضا خاں مرحوم کا کیمپ تھا اور اُنھوں نے حاجی اعظم، ایک سورتی تاجر کے مُسخر ہو جانے کی وجہ سے مسجد کے سامنے ایک مکان پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ دونوں کی حریفانہ کوششیں جاری تھیں اور دونوں ایک دوسرے کو شکست دینا چاہتے تھے، اور ایک دوسرے کے رَدّ و تفسیق میں سرگرم تھے۔ اُس طرف سے تو تکفیر بھی ہو جاتی تھی، لیکن ندوے کی طرف سے اِتنی جرأت نہ ہوتی تھی۔ رسالے چھاپے جاتے تھے۔ اشتہارات نکلتے تھے۔ جمعہ کے دن مقابلے کے وعظ ہوتے تھے، اور وعظ کی مجلسوں میں ایک دوسرے پر سب و شتم بھی ہوتی تھی، اور عین مجلس میں ہنگامہ و فساد برپا کرنے کیلئے بھی سازشیں ہوتی تھیں۔

سرسیّد کی کتابوں کا مطالعہ

اُس زمانے میں مولوی محمد شاہ مرحوم رامپوری بھی کلکتے آئے تھے

اور ندوہ والوں نے اُن سے اپنی جماعت میں ایک دو وعظ بھی کرائے تھے۔ ہمارے مولوی نذیرالحسن، جو دونوں میں نہ تھے، مگر دونوں سے لڑتے بھی رہتے تھے، وہ مولوی محمد شاہ سے اُلجھ پڑے اور اِسی سِلسلے میں اُن کے ہمراہ مجھے بھی اُن کی قیام گاہ پر جانے کا اتفاق ہوا۔ اِس زمانے میں اگرچہ سر سیّد کی تصانیف کے مطالعے کی وجہ سے میرے دماغ میں ایک نیا طوفان اُٹھ چکا تھا، اور علما کی جانب سے طبیعت میں سخت بدظنی اور انکار پیدا ہو چکا تھا، لیکن مجھ پر مولوی محمد شاہ کا بہت ہی اچھا اثر پڑا۔ اُن کی بزرگانہ صورت، بڑا ہی نرم اور متین لہجہ اور پُر محبت تخاطب اور صاف صاف اور سیدھی سیدھی باتیں بہت اچھی معلوم ہوئیں۔ میں نے دیکھا کہ اُس وقت وہ پڑھا رہے تھے۔ چند فارغ التحصیل طلبائے کلکتہ اُن سے ترمذی پڑھ رہے تھے، اور وہ کسی حدیث کے سلسلے میں سورۂ وَالعَصر کی تفسیر بیان کر رہے تھے، اور اس سِلسلے میں یہ کہہ رہے تھے کہ جو اساس عقائد ہیں، اُن کے تحفظ کے بعد کسی کی تکفیر نہیں کی جا سکتی۔

مجھے اُن کی سیدھی سادھی باتیں اور بے لاگ طریق بیان، اور مولوی نذیرالحسن کی تھکا دینے والی لسّانیوں کے مقابلے میں بڑی ہی دھیمی اور نرم باتیں اِتنی اچھی معلوم ہوئیں کہ میں چپکے سے دوسرے دن گیا اور کہا کہ جتنے دن تک آپ کا قیام ہو مجھے ایک گھنٹہ دیدیجیے۔ میں آپ سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ مجھ کو بالکل ایک کم سن لڑکا دیکھ کر اُنھیں بہت تامل ہوا، لیکن کچھ تو والد مرحوم کا نام سُن کر اور کچھ تھوڑی دیر کی گفتگو سے اندازہ

کر کے پوری خوشی ظاہر کی اور مجھ سے کہا کہ ترمذی شریف ہی میں شریک ہو جاؤ، چنانچہ میں تقریباً دو مہینے تک پڑھتا رہا۔ اُن کا درس بہت سادہ اور محدود تھا، مگر اُن کی طبیعت کا اثر پڑا اور میں نے بڑی خوشی سے ترمذی کے وہ سبق اُن سے لیے۔ زیادہ زور اُن کا بھی خلافیاتِ حنفیہ کی تائید میں تھا۔

مذہبی بے اطمینانی

اُس زمانے میں مجھے لکھنے اور ترجمہ کرنے کا بہت شوق ہو گیا تھا، کیونکہ طبیعت میں مذہبی بے اطمینانی پیدا ہو چکی تھی، اِس لیے طلب و جستجو میں طبیعت سرگرم رہتی تھی۔ اِسی زمانے میں میں نے امام غزالی کی تصانیف دیکھیں۔ سب سے پہلے تو سرسیّد کے اس ریویو سے، جو اُنھوں نے امام صاحب کے دس رسالوں پر لکھا ہے، مجھے امام صاحب کی تصانیف کا شوق ہوا تھا۔ رسالہ " اَلمُنْقِذ مِنَ الضَّلَال " سے مجھے بڑی دلچسپی ہوئی، اس لیے کہ وہ بھی تمام تر امام صاحب کے شکوک و تجسس کی سرگزشت ہے اِس میں اُنھوں نے اپنی تصنیف، تہافتہ الفلاسفہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اِس تہافتہ الفلاسفہ کی تلاش ہوئی، اور بمبئی سے اُس کا مجموعہ، جس میں ابن رشد کا رد اور خواجہ زادہ کا محاکمہ بھی ہے، منگوایا اور اُس کا ترجمہ شروع کر دیا۔ یہ ترجمہ نصف کے قریب میرے پاس موجود ہے۔ جب اِس کے مطالب بے سود نظر آئے، تو ترجمے سے دستبردار ہو گیا۔

"روشن خیال" علما

ندوۃ العلماء کے اجتماع سے مجھے روشن خیال علما کی جو حالت منکشف ہوئی، کیونکہ منتبین ندوہ کی طرف میرا ایسا ہی حسن ظن تھا، اس سے طبیعت کو اور زیادہ مایوسی اور طبقۂ علما کی طرف سے سخت وحشت پیدا ہوگئی۔ مخالفین ندوہ وہاں جو کچھ کہہ رہے تھے اور کر رہے تھے، ان کی نسبت تو خیال تھا کہ یہ روشن خیال نہیں ہیں، لیکن جو لوگ ندوے کے لیے سرگرم تھے، ان کی بھی عجیب حالت نظر آتی تھی۔ چونکہ پانچ چھ مہینے تک اِن سرگرمیوں کو بالکل قریب سے دیکھتا رہا، اس لیے اندرونی حالت بالکل میرے سامنے تھی۔

میں نے دیکھا کہ بالکل چالاک دنیاداروں کی سی کارروائیاں کی جارہی ہیں، اور وہ تمام وسائل بے دریغ عمل میں لائے جاتے ہیں، جو اپنی کامیابی کے لیے ایک شاطر سے شاطر اور عیار سے عیار جماعت کر سکتی ہے۔ لوگوں کو شامل کرنے کے لیے ہر طرح کی عیاریاں کی جاتی تھیں، اور عوام پر اثر قائم کرنے کے لیے مصنوعی حالتیں اختیار کی جاتی تھیں۔ میرے سامنے ایک واعظ نے ندوے کے ایک سرگرم ایجنٹ سے مشورہ کیا کہ مجلس وعظ میں کیونکر اُن کو اظہار جوش و خروش کرنا چاہیے اور کیونکر آخر میں نالہ و بکا شروع کر دینا چاہیے، چنانچہ تجویز پختہ ہوگئی۔ اس کے بعد واعظ نے جوں ہی مثنوی کی ایک حکایت شروع کی، دوسرے صاحب نے معاً کھڑے ہو کر حال بازوں کی طرح حرکتیں شروع کر دیں۔ اِس سے مجلس میں بڑی رقت طاری ہوگئی اور اس قدر

آج ڈنکا ہوا کہ اس پر وعظ ختم کر دیا گیا! اسی طرح کی بیسیوں باتیں روز میں دیکھتا تھا اور میرے دل میں روز بروز اس طبقے کی طرف سے وحشت بڑھتی جاتی تھی۔

مباحثے کا شوق

اسی زمانے میں بحث و مباحثہ کا مجھے بہت شوق ہو گیا تھا۔ کوئی صحبت بھی میری کسی شخص سے ایسی نہ ہوتی تھی کہ بغیر بحث کے ختم ہو جائے۔ منطقی مباحث سب از بر تھے۔ مناظرے کا اسلوب اچھی طرح ذہن نشین تھا، اس لیے عموماً مخاطب کی شکست ہی ظہور میں آتی تھی، اور اس میں مجھے بڑی لذت ملتی تھی۔ طلبہ اور نئے مولویوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہو سکتا۔ مکان پر اور زیادہ تر مسجد میں عصر سے لے کر مغرب تک، اور بعض اوقات عشاء تک مدرسے کی زیریں منزل کے برآمدے میں بیٹھا کرتا تھا، اور لوگوں کا ہجوم جمع رہتا تھا۔ بعض لوگوں سے مباحثے میں التزام اور باقاعدگی ہو جاتی اور چار چار پانچ پانچ دن تک سلسلہ جاری رہتا۔ ایک بہت مستعد اور بہت لسان شخص، مولوی محمد حسین فاروقی تھے، جو بعد کو کچھ دنوں تک مدرسے میں مدرس بھی ہو گیے۔ ایک مرتبہ ان سے دو ہفتے تک مسلسل بحث جاری رہی، اور آخر انھیں ہار ماننا پڑی۔

اس بات سے اور میری کم سنی سے لوگوں میں بہت استعجاب پیدا ہوتا، اور اس میں میں بہت فخر اور مسرت محسوس کرتا۔ رفتہ رفتہ یہ ہو گیا کہ لوگ اس بات کے عادی ہو گیے، اور اب شہر کی صحبتوں میں یہ بات نہ رہی کہ وہ میری کم سنی کی وجہ سے گفتگو میں احتراز کریں۔ اب یہ ہوا کہ ہر شخص اچھی طرح جاننے لگا۔ اور بعض اوقات خود لوگ

آکر بحث کرنے لگے۔

ندوے کے اجلاس میں باہر سے جو علما آئے تھے، جلسے کے اوقات کے بعد بھی ان کا اجتماع، مسجد میں، یا حاجی بخش الٰہی کے مکان میں، رہا کرتا تھا۔ میں وہاں برابر جایا کرتا اور جب ان لوگوں کا یہ خیال دور ہو گیا کہ میں ایک محض ناقابل التفات کمسن لڑکا ہوں، تو مجھے اپنی قوتِ بیانیہ اور بحث وجدال کے لئے خوب موقعہ ہاتھ آگیا۔

مولانا حقانی سے بحث

اس زمانے میں کئی بحثیں ہوئیں، جن پر تمام لوگوں کو سخت استعجاب ہوا۔ ایک دن شام کو اکثر علما مجتمع تھے اور مولوی عبدالحق حقانی مرحوم، جو جلسۂ ندوہ کے صدر بھی تھے، اپنی ایک تصنیف کے متعلق مولوی احمد علی نامی ایک شخص سے گفتگو کر رہے تھے۔ یہ متھرا کے رہنے والے تھے، اور اچھے شائقِ علم تھے۔ ہر سال نیل کے نیلام کے لیے کلکتہ آتے اور مجھ سے ان کی بحثیں رہتی تھیں۔ مولوی عبدالحق مرحوم کی ایک کتاب، عقائد اسلام ہے جس کا نام اس وقت ذہن میں نہیں ہے۔ اس میں، جیسا کہ وہ اس وقت کہہ رہے تھے، نئے شکوک و اعتراضات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ معراج کے متعلق گفتگو تھی اور وہ سائل کے جواب میں اس کتاب کے اس حصے کو سنا رہے تھے، اور در پردہ ترغیب دے رہے تھے کہ وہ اس کی ایک کاپی خرید بھی لے۔ ساتھ ہی انھوں نے سید احمد خاں کو بھی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ میں نے فوراً بیچ میں دخل دیا۔ پہلے تو وہ ملتفت نہ ہوئے، لیکن جب میں نے پکار کر گفتگو شروع کر دی، تو وہ بھی چونکتے ہوئے اور مجھکو جواب دینا شروع کیا۔ انھوں نے

اپنے ذہن میں فلسفی طور پر، اُنھی کے الفاظ ہیں، معراجِ جسمانی کو ثابت کیا تھا۔ میں نے پہلے اس کا پوری طرح رد کر دیا اور امکان وقوع کے فرق پر بحث کی اور اثباتِ امکان کو اثباتِ وقوع کے لیے بالکل بے نتیجہ بتایا۔ اس کے بعد اس کی تغلیط کی کہ معراج روحانی کا اعتقاد، نیچریت ہے اور مذہب عائشہ و معاویہ پر زور دیا۔

اس تقریر نے لوگوں پر جو اثر ڈالا، اس کو میں اپنی زبان سے پوری طرح کہہ نہیں سکتا۔ تقریر سے زیادہ میری عمر کی صداقت پر لوگوں کو تعجب تھا۔ مرحوم مولوی عبداللہ ٹونکی اٹھ کر پاس آکے بیٹھ گیے اور کہنے لگے کہ ہاں ہاں، کہو کہو، اچھی طرح کہو! شاید اُن کو اپنے حریف کی شکست پر مسرت محسوس ہو رہی تھی۔ آخر مولوی عبدالحق کوئی جواب نہ دے سکے، اور لگے سوالات کرنے کہ تم نے یہ باتیں کہاں سے سیکھیں؟ مولوی عبداللہ ٹونکی اور ایک فتح پور کے شخص تھے، جن کا نام یاد نہیں رہا، انھوں نے کہا کہ مولانا، جواب دیجیے۔ ان سوالات سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ مولوی عبدالحق نے کہا، تم ہی ان سے مباحثہ کر لو!

مولانا عبداللہ ٹونکی

ایک دوسری گفتگو، جس کے بعد سے مرحوم مولانا عبداللہ ٹونکی سے میری ملاقات شروع ہوئی، اور وہ ہمیشہ مجھ پر شفقت کرتے رہے، مسجد میں ہوئی تھی۔ مولوی غلام محمد فاضل ہوشیار پوری کلکتے کے ایک شخص مولوی ابو ظفر کو ساتھ لائے اور کہا کہ مولانا، ایک ہفتے سے مجھ میں اور ان میں بحث ہو رہی ہے اور یہ مانتے نہیں۔ اب آپ تشفی کر دیجیے۔ مولوی عبداللہ نے پوچھا، کیا معاملہ ہے؟

معلوم ہوا کہ تقدیر اور اشاعرہ کے مذہبِ کسب پر اُن کے اعتراضات ہیں اور جواب کے طالب۔ مولوی عبداللہ نے جواب میں ایک تقریر کر کے انھیں ٹالنا چاہا۔ وہ کچھ مرعوب سے ہو گیے اور ہاں ہاں کرنے لگے۔ میں دور بیٹھا تھا۔ میں نے کہا کہ مولانا، اور بھی کسی شخص کو رفعِ اشتباہ کی اجازت ہے؟ اُنھوں نے کہا، ہاں ہاں، کہو۔ میں نے اُن کی پوری تقریر کا مواد گنوا کے پھر ایک ایک کر کے اس کا رد کر ڈالا۔ مولوی عبداللہ ایسے ہکّے بکّے رہ گیے کہ پانچ منٹ تک صرف مسکراتے رہے۔ اور کوئی جواب نہ دے سکے۔ اب لوگوں میں اشارے شروع ہوئے، اور ان کی خاموشی پر چہ میگوئیاں .... ہونے لگیں۔ حکیم عبدالرحیم مرحوم دہلوی، کہ وہ بھی لسانی اور بحث میں ایک بلائے بے درماں تھے، بول اٹھے کہ مولانا، حق یہ ہے کہ ہم سب اُس وقت تک اُنھی کے ساتھ ہیں، جب تک کہ آپ جواب نہ دیں۔ اُن کو کچھ تو اس کا خیال کہ ایک لڑکے سے بطرزِ بحث گفتگو کریں، اور کچھ جواب کا دجوب، غرضکہ عجب کشمکش میں تھے۔ آخر انھوں نے وہی محقق دوانی کی تقریر شروع کی۔ میں بیسیوں مرتبہ اُس کی دھجیاں اڑا چکا تھا۔ میں نے قطعِ کلام کی معافی مانگ کر کہا کہ جو کچھ آپ فرمائینگے، غالباً اُس کا خلاصہ یہ ہے؟ کہنے لگے، اگر پڑھ چکے ہو، تو گفتگو سے حاصل؟ میں نے کہا اُس سے تشفی نہیں ہوئی۔ تو کہا، آپ محقق دوانی سے بھی بڑھ گیے ہیں؟ اس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا تھا!

لیکن حکیم عبدالرحیم نے انھیں پھر مجبور کیا کہ یہ تو کوئی جواب نہیں ہے، اور مجھ سے کہا کہ تم تقریر جاری رکھو۔ میں نے دوانی کی تقریر پر اعتراضات پیش

کیے اور کہا کہ ایک ایک کر کے جواب عنایت کیجیے لیکن تین اعتراضات میں سے پہلے ہی اعتراض میں اُن کے جوابات ایسے بے تعلق و بے ربط ہونے لگے کہ تمام لوگوں نے ان کی دقتیں محسوس کرلیں۔ مغرب کا وقت آگیا اور گفتگو ختم ہوگئی۔ اُس وقت تک وہ مجھ سے واقف نہ تھے۔ مغرب کے بعد مجھے ڈھونڈ کر نکالا اور جب اُنھوں نے سنا کہ میری کتابیں ابھی ختم نہیں ہوئی ہیں، اور پڑھ رہا ہوں تو ان کو اور زیادہ تعجب ہوا۔ بار بار یہ کہتے تھے کہ یہ تمہاری صرف بحث تھی، مگر تمہارا اعتقاد ایسا نہیں ہے۔ اِس کے بعد آخر تک وہ بہت ہی خاص طور پر مجھ سے ملتے رہے۔

اُنھی سے ایک دن شرح عقائد تفتازانی کی ایک عبارت پر گفتگو ہوئی، اور اُنھوں نے (مولانا ٹونکی نے) قابل تعریف طریقہ پر فوراً یہ کہہ دیا کہ میری توجیہ ٹھیک ہے۔ صورت یہ تھی کہ کسی مدرسے کے دو طالب علموں میں نزاع تھی۔ وہ کتاب لے کر مسجد میں آئے۔ اتفاق سے یہاں یہ مجمع موجود پایا تو اپنی نزاع پیش کی۔ غالباً جلدی میں اُنھوں نے صرف سُن کر جو جواب دیا، وہ صحیح نہ تھا۔ اِس پر میں نے کتاب کھول کے جب عبارت پیش کی، تو انھوں نے خود تسلیم کرلیا۔ اُن کی یہ بات حقیقۃً قابل تعریف ہے۔

عربی، فارسی، اردو

اسی زمانے میں مجھے فارسی زبان کی مزید تکمیل کا بہت شوق ہوا۔ عربی زبان ہم لوگوں کے لیے بچپن میں گویا گھر کی زبان تھی۔ میری بہنیں تو ٹھیک اردو بول بھی نہیں

سکتی تھیں۔ بڑی اور منجھلی بہن تو اکثر عربی ہی میں بات چیت کرتی تھیں۔ بچپن کا ابتدائی زمانہ، مکہ معظمہ میں ایسا گذرا کہ گھر میں اردو میں بات چیت تو ہوتی تھی، لیکن والدہ مرحومہ کو اس درجہ اردو زبان اور اردو بول چال ناپسند تھی کہ والد سے بھی وہ کبھی کوئی بات اردو میں نہ سنتی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی اردو وہ سمجھنے لگی تھیں، لیکن بول بالکل نہیں سکتی تھیں، لیکن والد مرحوم ہم لوگوں سے اردو میں باتیں کرتے اور سکھاتے دو تین شخص باہر بھی ہندستانی ایسے تھے کہ جو ہمیں گھیٹے رہتے تھے۔ گھر میں جن لوگوں سے پڑھنا شروع کیا، وہ بھی ہندستانی تھے، اور اس لیے اردو بھی ہم بولنے اور سمجھنے لگے تھے اگرچہ وہ صحیح نہ ہوتی تھی۔ عرصے تک بہت سے اردو کے غلط الفاظ اور غلط مخارج، جو مکے میں عرب بولتے ہیں، میری زبان پر رہے اور میں نے ان کو بتدریج کوشش کرکے دور کیا۔ والدہ مرحومہ سے بھی زیادہ اُن کی بہن، جو اوائل ہی میں بیوہ ہو چکی تھیں اور والد کی شادی کے بعد اپنی چھوٹی بہن ہی کے ہمراہ رہتی تھیں، ہندستانیوں کو بہت ناپسند کرتی تھیں، اور اس کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ جب والد مرحوم کو دیکھتیں کہ ہم سے ہندستانی میں باتیں کرتے ہیں اور ہمکو سکھاتے ہیں، تو بہت ہی بگڑتیں اور کہتیں کہ تم ہمارے لڑکوں کو خراب کردوگے! ایک مرتبہ انھوں نے ایک غریب بنگالی مولوی کو، جو ہمارے یہاں رہتا تھا اور ہم لوگوں کی بڑی خدمت کرتا تھا، محض اس جرم پر نکال دیا کہ ایک دن اس نے ہم سے قرآن پڑھنے کو کہا، اور ہم سورہ بقرہ لے کر اس کے پاس بیٹھ گئے۔ جب اُس کی ہندستانی قرأت کی آواز اندر گئی، تو انھوں نے فوراً تالی بجائی، جو بلانے کی علامت تھی، اور جب ہم اندر گیے تو بہت بگڑیں اور اس غریب کو بہت ہی سخت سست کہا۔ آخر والد مرحوم نے دو دن کے بعد جبر

اُسے مکان میں بلا لیا۔

اِن اسباب سے ہم لوگ بچپن ہی سے حجاز کی غلط اور محرف عربی بولنے کے عادی ہو گیے تھے۔ اِس کا اثر یہاں تک رہا کہ جب عربی پڑھنے لگے اور تراکیب سے واقفیت ہو گئی، جب بھی گفتگو میں بے اختیار وہ الفاظ منہ سے نکل جاتے تھے، تاہم اِس سے بلا شبہ عربی کی تحصیل میں ہمیں مدد ملی، اور وہ عدمِ مناسبت پیش نہ آئی، جو غیر مانوس زبان کے پڑھنے میں رکاوٹ ڈالا کرتی ہے، بلکہ ہمیں یہی معلوم ہوا کہ گویا ہم اپنی مادری زبان پڑھ رہے ہیں۔

لیکن فارسی کا یہ حال نہ تھا۔ والد مرحوم کو چونکہ فارسی ادب کا اعلیٰ ذوق تھا، اِس لیے وہ بہت ہی اِس کی ضرورت محسوس کرتے تھے، اور انھوں نے جو اہتمام عربی کی تعلیم پر کیا تھا، اُس سے کم فارسی کی تعلیم پر نہیں کیا، تاہم یہ فارسی وہی ہندستان کے گذشتہ دور کے تعلیمی طریقے پر مبنی تھی، جو ایک طرف تو فارسی علم ادب کے صرف ایک بگڑے ہوئے اسلوب سے آشنا کرتی ہے، دوسری طرف عربی کی طرح تحریر و تقریر کی قدرت پیدا نہیں کر سکتی۔

فارسی کا ذوق

اُسی زمانے میں میں نے یہ محسوس کیا کہ مجھے یہ نقص دور کرنا چاہیے۔ والد مرحوم کی وجہ سے فارسی کا شوق طبیعت میں جاگزیں تھا، چنانچہ ایک طرف تو بکثرت فارسی کا مطالعہ شروع کیا، خاص طور پر لُغت و ادب کا۔ دوسری طرف کوشش کر کے فصیح ایرانیوں سے میل جول اور صحبت کی صورتیں نکالیں۔ اُس زمانے میں ایک

بوڑھا کتب فروش، مدرسہ عالیہ کے سامنے دوکان رکھتا تھا۔ اُس کو مٹیا برج اور ٹالی گنج کے کتب خانوں کی بہت سی نادر اور قلمی کتابیں بھی مل گئی تھیں۔ میں ہر جمعہ کو اُس کے یہاں جاتا اور کتابوں کے انباروں کو ایک ایک کرکے دیکھتا، اور فارسی کی نایاب کتابیں چُنتا۔ تاریخ، تذکرہ اور لغت کی خاص طور پر جستجو تھی۔ اِسی زمانے میں غالب مرحوم کی قاطع برہان اور اُس کے جوابات، اور اُس کا جواب الجواب اِسی دوکان سے لیا۔ اِس سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ فارسی کے تمام قلمی تذکرے اور غیر مطبوعہ لُغت کی کتابیں، مثلاً مؤید الفضلاء وغیرہ وہاں سے دستیاب ہوئیں، اور میں اُن کے مطالعے میں غرق رہا کرتا تھا۔ ساتھ ہی فارسی میں تحریر و تقریر کی بھی بطور خود مشق شروع کر دی۔

فارسی کا باکمال اُستاد

اِس زمانے میں مرزا محمد حسین طہرانی ایک بہت قابل، اور حکیمانہ مشرب کے سیاح، عراق سے ہندستان آئے اور کلکتے میں اُن سے ملاقات ہوئی۔ وہ آغا محمد سنجر کے ساتھ کلکتے آئے تھے۔ عربی کے بہت اچھے ادیب تھے اور فارسی تحریر میں تو میں نے اُن سے بہتر لکھنے والا شخص کوئی نہیں دیکھا۔ اُن سے مجھ کو بہت فائدہ ہوا تھا۔

پہلا فائدہ تو یہ تھا کہ گفتگو اُن سے فارسی میں ہوتی تھی اور وہ برابر غلط محاورات اور ہندی ترکیبوں پر ٹوکتے رہتے تھے۔ اِس طرح فارسی بول چال اور محاورات کے وہ صدہا بھید، جو کتابوں سے کسی طرح حاصل ہی نہیں ہو سکتے تھے، اُن سے

حاصل ہوئے۔ ساتھ ہی اُن کو میں اپنی فارسی تحریریں دکھلاتا اور اصلاح لیتا تھا۔ شاعری میں بھی اُن سے اصلاح لیتا تھا۔ طریقہ یہ تھا کہ میں کسی اردو کتاب کو لے لیتا اور اس کا فارسی ترجمہ کرنے لگتا، چنانچہ تذکرۂ آبحیات کا اول حصہ دَورِ دوم تک فارسی میں ترجمہ کر کے اُن کو دکھلایا اور اصلاح لی۔

فارسی لُغت

اسی زمانے میں ایک فارسی لغت لکھنا شروع کیا۔ ہندستان میں فارسی لُغت نویسی کی کچھ عجیب حالت رہی ہے۔ ادبیات کے کسی حصے میں اس قدر تمسخر انگیز اغلاط اور گمراہیاں نظر نہیں آئیں گی، جس قدر ہندستان کے فارسی لغتوں میں، مثلاً محاورات میں مرزا غالب کی قاطع برہان اور ہدایت قلی کی فرہنگ ناصری اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ چونکہ ان چیزوں سے اُس وقت شوق ہو گیا تھا خیال ہوا کہ ایسے تمام لغات، اور محاورات اور جملات کو ایک فرہنگ میں جمع کیا جائے چنانچہ ایک معقول حصہ ایسے الفاظ و محاورات کا جمع کر لیا۔ اس کے لیے بہت دیئے مطالعہ کرنا پڑا تھا اس سے بھی بہت فائدہ ہوا۔

شیخ الرئیس

اس کے علاوہ اسی زمانے میں اور بھی جو ایرانی مل جاتا، میں اس سے فوراً ملاقات پیدا کر لیتا جب پہلی مرتبہ بمبئی گیا، تو وہاں اس کا زیادہ بہتر موقعہ ملا، وہاں شرفائے ایران کی ایک اچھی جماعت ہمیشہ رہتی ہے۔ اتفاق سے اس زمانے میں

شیخ الرئیس نامی، ایران کے عہد حاضر کے ایک استاد علوم، آغا خاں کے یہاں مہمان ہوئے۔ "شیخ الرئیس" اُن کو مظفر شاہ نے خطاب دیا تھا۔ فارسی، عربی اور قدیم معقولات میں وہ بے نظیر تھے۔ شرح حکمۃ الاشراق کے پڑھنے کا انھوں نے مجھے مشورہ دیا، اور میں نے انھی سے شروع کی۔ عربی میں اتنی فصیح و بلیغ تقریر برجستہ کرتے تھے کہ میں نے عربوں کی زبانی بھی ایسی نہیں سنی۔ نہج البلاغہ کی انھوں نے ایک شرح لکھی ہے، جو ایران میں چھپ گئی ہے۔ اُن سے تقریباً سال بھر تک روزانہ صحبت اور مجھے عربی، فارسی، معقولات، معلومات عامہ، اور بہت سی باتوں میں اُن سے فائدہ ہوا اور بلاشبہ اُن کے مجھ پر حقوق ہیں۔ اُن کی بعض نظموں اور مقالات کا مجموعہ، ملک الکتاب نے بمبئی میں بھی چھاپ دیا ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد جب ۱۹۰۷ء میں آخری انقلاب ہوا تو وہ مجلس (ایرانی پارلیمنٹ) کے رکن بھی منتخب ہوئے تھے۔ اس کے بعد شیخ فضل اللہ نوری مجتہد طہران، جس نے محمد علی شاہ سے مل کر اصلاح طلبوں کی تکفیر کا فتویٰ دیا تھا، اس کے جواب میں وجوبِ شوریٰ اور قیامِ مجلس اور ارتداد محمد علی پر سب سے پہلے انھی نے فتویٰ لکھا۔

رسالہ "نیرنگ عالم"

۱۹۰۰ء کے اواخر میں مجھے شاعری کا شوق ہوا۔ پھر یہ خبط یہاں تک بڑھا کہ خیال ہوا ایک گلدستہ بھی نکالنا چاہیے، چنانچہ "نیرنگ عالم" کے نام سے جاری کیا، لیکن صرف آٹھ مہینے تک جاری رہا۔ یعنی صرف آٹھ نمبر نکلے۔

شیخ الرئیس کا تبحر، قدیم علوم حکمیہ میں بہت وسیع تھا۔ گوہر مراد، اسفار اربعہ اور عبدالرزاق لاہجی کے مصنفات و شرح پر بھی انھی سے مجھے بعض نہایت مفید درس حاصل ہوئے۔ گوہر مراد کے وہ بڑے معرف تھے اور اُس کو تمام دیگر کتب متاخرین پر ترجیح دیتے تھے، لیکن مسئلہ بدار پر میرے اعتراضات کا کبھی جواب نہیں دیا، جو گوہر مراد کا سب سے زیادہ معرکۃ الآرا باب ہے۔ انھی نے مجھے امام رازی کی محصّل الافکار اور محقق کے رد اور اُس کے محاکمات کے مباحث سے آگاہ کیا، اور اپنا ذاتی نسخہ مطبوعہ ایران بھی مع اُس کے ایک حاشیے اور قول فیصل کے میں نے اُن سے تقریباً بطور درس کے پڑھا۔

مولانا شبلی کی حیرت

اس کے چند ماہ بعد جب مولانا شبلی مرحوم سے بمبئی میں پہلی ملاقات ہوئی اور میں نے محصّل کا ذکر کیا، تو اُن کو بہت ہی استعجاب ہوا۔ اُس وقت تک مولانا کی نظر سے وہ نہیں گذری تھی اور اس کے انطباع کی اُنھیں خبر نہ تھی، لیکن اُس حسن ظن کی وجہ سے جو امام صاحب سے تھا، مثل حکمت مشرقیہ شیخ کے اُس کا بھی اُن کو نہایت اشتیاق تھا پہلے تو انھوں نے عرصے تک اُسے تسلیم ہی نہیں کیا کہ جس چیز کا میں ذکر کر رہا ہوں، وہ اُن ہی کی مطلوبہ محصّل ہے لیکن جب میں نے اس کے مباحث پر بطور تقریر کے بہت سے مطالب بیان کئے اور پھر دوسرے دن انھیں مطبوعہ نسخہ بھی دیدیا، تو میری نسبت انھیں بہت اچھا خیال پیدا ہوا، اور استعجاب کے ساتھ خوشی بھی ہوئی، اگرچہ اُن کے توقعات،

محصّل سے پورے نہ ہوئے۔

اسی طرح حکمۃ مشرقیہ بھی شیخ الرئیس کے پاس میں نے دیکھی تھی۔ انھوں نے ایک بہت ہی بسیط اور عالمانہ شرح بھی لکھی ہے۔ شیخ نے اشارات میں بہت ہی پراسرار لب ولہجہ میں لکھا ہے کہ یہاں جو کچھ میں شرح وبحث کر رہا ہوں، یہ تو صرف معلم اول کی ترجمانی ہے، لیکن جو لوگ میرے خاص علوم دیکھنا چاہتے ہیں، وہ حکمۃ مشرقیہ دیکھیں۔ اشارات کے اس اشارے نے لوگوں کو حکمۃ مشرقیہ کا بہت شائق بنا دیا، لیکن عام طور پر اس کا نسخہ نہ صرف ہندستان بلکہ بلاد اسلامیہ میں بھی نایاب تھا، لیکن میں نے شیخ الرئیس کے پاس مع اس کی شرح کے دیکھا اور اس کی مشکلات ان سے حل کیں، لیکن فی الحقیقت اس میں کوئی نئی اور بلند بات نہ پائی۔ اب عرصے کے بعد مصر میں محب الدین خطیب نے اسے چھاپ دیا ہے۔

ایسی ہی مایوسی اُن لوگوں کو بھی ہوتی ہے، جو شرح حکمۃ الاشراق کے دیباچے میں قسم ثانی کے متعلق شیخ الاشراق کا یہ دعوی پڑھتے ہیں کہ وہ خاص اُن کے معارف اور علوم کا بیان ہے، لیکن وہاں تک پہنچنے کے بعد کتاب بند کر دینی پڑتی ہے۔ شرح حکمۃ الاشراق پر بھی شیخ کے بہت مفصل حواشی ہیں۔

امام غزالی کی مقاصد الفلاسفہ، جو چاروں قدیم فنوں پر عربی میں سب سے زیادہ صاف اور بہتر کتاب ہے، اور جس کی تلاش میں جرمنی کے مستشرقین تھے، مگر بجز چند اوراق کے مل نہ سکی، اور جو اب مصر میں ناتمام چھپ گئی ہے، وہ بھی پہلے پہل میں نے اُن ہی کے پاس دیکھی۔ امام شہرستانی کی نہایت العقول،

جو نہایت ہی نایاب ہے، وہ بھی میں نے اُن ہی کے پاس دیکھی۔ اُس وقت تک نہج البلاغہ کی کوئی شرح شائع نہیں ہوئی تھی یہی وجہ ہے کہ شیخ محمد عبدہ نے اس پر مختصر حلِ لغات لکھا، لیکن میں نے اُن کے پاس ابن ابی الحدید کی ضخیم وجامع شرح دیکھی، جو اس کے بعد مصر میں چھپ گئی۔ ایک اور کتاب، جو بہت ہی نایاب ہے، اُن کے پاس تھی، جس میں امام رازی نے مسئلۂ قدر پر بحث کی ہے، اور اس بارے میں اشاعرہ کے طریق سے ہٹ کر ایک بڑی محققانہ تقریر میں امام الحرمین کا انتصار کرتے ہوئے کسب سے بالکل اختلاف کیا ہے، اور بعض نہایت قیمتی مباحث، آیاتِ قرآنیہ متنازعہ فیہ کے متعلق لکھے ہیں۔ افسوس ہے کہ بعد کو نہ تو اس کا نام مجھے معلوم ہو سکا اور نہ وہ کتاب مل سکی۔

نجوم اور کیمیا وغیرہ

شیخ الرئیس کو فنونِ غریبہ کا بھی بہت شوق تھا۔ کبھی اُنھوں نے اپنا اعتقاد تو مجھ پر ظاہر نہیں کیا، لیکن وہ نجوم، رمل، جفر، اور حروفیات، اور کیمیائے قدیم میں کافی دخل رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ایران کے اکثر مہوسوں کی طرح مجھے برسوں تک کیمیا سازی کا خبط رہ چکا ہے۔ اس ذوق کی وجہ سے انھیں علم معلون اور ترکیب عناصر کے بارے میں، نیز مختلف تحوّل وانقلابِ عناصر کے عملیات میں بہت دخل بہم ہو گیا تھا۔

والد مرحوم کو بھی کسی زمانے میں ان فنون سے واقفیت بہم پہنچانے کا موقعہ ملا تھا۔ نجوم میں پوری دستگاہ رکھتے تھے، اور ان کی کتابوں میں بکثرت قلمی

کتابیں اِس فن کی تھیں۔ رمل و جفر میں بھی پوری واقفیت تھی۔ لیکن میں نے اُن کو کبھی ان پر عمل کرتے ہوئے نہیں پایا، البتہ بطور تفنّن کے اُن کی قدر و قیمت محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے ہم لوگوں کو بھی اُن کی تعلیم دی، اور ان کے اعمال و نتائج کے استخراج کی باقاعدہ مشق کرائی۔ شیخ الرئیس کو جب میں نے اِن چیزوں سے بھی واقف پایا، تو اپنی واقفیت کی مزید تکمیل کے لیے اِن میں بھی استفادہ کرتا رہا۔ چنانچہ اِس کی وجہ سے ان فنون کی تمام مصطلحات اور مخفی اعمال سے واقفیت ہو گئی، جس کے بغیر بسا اوقات قدیم لٹریچر کی بہت سی تلمیحوں اور اشارات کے سمجھنے سے آدمی قاصر رہ جاتا ہے۔

شیخ الرئیس کی نسبت میرا خیال ہے کہ وہ بھی ہرگز اِن کے اعمال و نتائج پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ علوم حکمیہ کے توغّل کی وجہ سے اُن میں اس طرح کے اعتقادت کی بالکل گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ اُن کے مذہبی معتقدات بالکل حکما کے سے تھے اور گو نئی تاویلوں کی انھیں زیادہ خبر نہ تھی، لیکن عقائد مذہب پر اُن کی تقریریں بعینہ ویسی ہی ہوتی تھیں، تمام مذہبی خوارق اور معنویات کی وہ تاویلیں کرتے تھے۔ ملائکہ اور شیاطین کے وجودِ خارجی کے بالکل قائل نہ تھے، اور اس کا تمسخر اڑاتے تھے۔ گوہر مراد کی تقریریں اس بارے میں بڑی آب تاب سے بیان کرتے تھے۔ شیعیت کا تعصب بھی ان میں بہت کم رہ گیا تھا اور علومِ حکمیہ سے ذوق کی وجہ سے ایک طرح کی صوفیانہ طبیعت پیدا ہو گئی تھی۔ بحیثیت مجموعی اُس زمانے میں میرے دماغ پر اُن کا جو اثر پڑا تھا، اس میں کافی طور پر عزت و احترام تھا۔

مرزا فرصت شیرازی

ایک اور مفید صحبت جو میری تعلیمی زندگی میں بے اثر نہیں کہی جا سکتی، انھی ایام میں میسر آئی۔ ایران کے فاضل اور نئے علوم والسنہ سے آشنا اور نئے طریق تحقیق و نظر کا ذوق رکھنے والے، مرزا فرصت شیرازی بمبئی وارد ہوئے۔ انھوں نے اگرچہ ایران کی نئی درسگاہوں میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی، لیکن ایک جرمنی مشن کے ساتھ آثار قدیمۂ ایران کی تحقیقات کرنے کی وجہ سے انھوں نے جرمن، فرانسیسی تھوڑی سی انگریزی زبانوں کے علاوہ نئے علوم اور خیالات میں بھی اچھی طرح واقفیت بہم پہنچائی تھی۔۔

ایران کے آثار قدیمہ، علی الخصوص پرسی پولس (تخت جمشید) کی تحقیق و تنقید کے لیے ایک جرمن مشن تقریباً بارہ سال تک ایران میں مقیم رہا۔ اس نے بطور ایک شہری سکریٹری کے انھیں ملازم رکھ لیا تھا۔ چونکہ یہ نہایت ذہین اور شائقِ علوم طبیعت رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے فوراً یوربین زبانیں بھی سیکھ لیں ساتھ ہی نقشہ کشی اور مصوری میں بھی مخصوص کمال حاصل کر لیا۔ مشن جب واپس گیا، تو انھوں نے جس قدر معلومات فراہم کی تھیں، وہ ایک نہایت ہی مفید تاریخ کی شکل میں مرتب کیں اور اس کا نام، "آثار العجم" رکھا۔

یہی مشن سب سے پہلے اُن میخ نما حروف کی تحقیقات میں کامیاب ہوا جو آثار قدیمۂ ایران پر کندہ ہیں، اور جن کو قابل اطمینان طریقہ پر حل کرنے میں فرانس و جرمنی کے تمام ماہرین فن کی کوششیں رائگاں گئی تھیں۔ دراصل وہ مشن

ان ہی کی سعی سے اس میں کامیاب ہوا۔ سب سے پہلے یہ ایک ایسے کتبے کے اتخراج میں کامیاب ہوئے، جس میں بعض معلوم تاریخی وقائع مصوّر تھے اور اس کی وجہ سے چند اسما کا علم یقینی طور پر حاصل تھا۔ یہ فرض کرکے کہ مرقع کے نیچے کی عبارت میں یہ اسماء ضرور ہیں، اُنھیں پڑھنے کی کوشش کی، اور اس میں پوری کامیابی ہوئی۔ پھر آہستہ آہستہ تمام کتبوں کا مطالعہ شروع کیا، اور بہت جلد مکمل حروف تہجی مرتب ہو گیے۔ اس کے بعد تقریباً نوّے کتبے جن میں سے بعض بعض بہت طویل عبارات پر مشتمل ہیں، حل ہو گیے۔

اُن کی اس تحقیقات کی وجہ سے اس مشن نے برلن کی مرکزی سرکاری سوسائٹی سے اُن کی سفارش کی اور اُنھیں ایک بڑی رقم بطور علمی اعانت کے دی گئی۔ اُنھوں نے ایک مستقل کتاب حروف میخی کے حروف تہجی اور ضروری قواعد اور چند کتبوں پر لکھی۔ یہ حروف اُس وقت تک کے تمام معلومہ خطوط میں، آثار مصر کے ہیرو غلیفی کے بعد سب سے قدیم باقاعدہ خط کے حروف ہیں۔

اسی زمانے میں یہ بمبئی آئے۔ دراصل ان کا ارادہ یورپ کے سفر کا تھا، لیکن بمبئی پہنچ کر بیمار ہو گیے اور مجبوراً سال بھر تک قیام کرنا پڑا۔ اس کے بعد انھیں خیال ہوا کہ اپنی تصانیف یہیں چھپوالیں، چنانچہ آثار العجم اور خط میخی اور بعض اور رسالے، بھائیوں کے ایک پریس نے بمبئی میں چھاپ دیے۔

اس کے بعد وہ فرانس چلے گیے اور دو سال تک یورپ کی سیاحت کر کے واپس ہوئے تھے کہ مجھے ان سے ملنے کا موقعہ حاصل ہوا۔ ان کی صحبت کے بھی بلاشبہ مجھ پر حقوق ہیں۔ فارسی ادبیات اور نیز بعض علوم میں ان سے مجھے نہایت قیمتی

فوائد حاصل ہوئے۔

دساتیر کی اسٹڈی

جرمن مشن کی وجہ سے اُن کو جو ذوق، قدیم السنہ کا پیدا ہو گیا تھا، اسے انھوں نے پھر بطورِ خود بہت ترقی دی۔ سفرِ یورپ سے ایک مقصود یہ بھی تھا، اور دوسری مرتبہ قیام بمبئی اس لیے تھا کہ صوبہ بمبئی پرانے پارسیوں کا مرکز ہے، اور قدیم پہلوی اور دری اور اسفارِ زردشت کی تحقیقات کریں۔ انھوں نے اس بارے میں بھی نہایت قیمتی واقفیت بہم پہنچائی تھی۔ میں نے دساتیر اُن سے سبقاً پڑھی اور قدیم ایرانی زبان اور علوم اور آداب و رسوم اور مصطلحات کے بارے میں اُن سے وہ وہ نکتہ حاصل ہوئے، جو لغت و ادب کے لیے نہایت قیمتی ہیں۔ فارسی اور سنسکرت کے تعلق کے نظریے کے وہ بھی بہت حامی تھے، اور اس بارے میں جو نئے نظریے مقبول ہوئے ہیں، اُن کا بڑے شدّ ومدّ سے رَد کرتے تھے۔ اس بارے میں انھوں نے بہت مواد جمع کیا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ جس قدر دونوں زبانوں کے توافق و تطابق کا مواد، یورپ میں فراہم ہو چکا ہے، اُس سے یہ بدرجہا زیادہ تھا۔

اس چیز نے اُن کو سنسکرت پر بھی مائل کیا، اور باوجود اس قدر قدیم زبان کی تحصیل کے موانع و مشکلات کے وہ پوری سرگرمی کے ساتھ اس کی تحصیل میں مشغول ہو گئے۔ وہ خود تھانہ میں رہتے تھے اور بمبئی محض سنسکرت کے پڑھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ سال بھر میں انھوں نے اتنی واقفیت حاصل کر لی تھی کہ اُن کو اپنے مطالعے میں کسی استاد کی مدد کی ضرورت نہ رہی تھی۔

افسوس ہے کہ اِس کے بعد میں عراق چلا گیا، اور جب واپس آیا، تو معلوم ہوا کہ وہ ایران چلے گئے ہیں۔ میرے پاس ان کی دی ہوئی بہت قیمتی قیمتی اور یادگار اشیا رہیں، مثلاً ان کے قلمی نقشے، اور تصاویر، اور تختِ جمشید کا ایک مکمل خاکہ، جو اصولِ ہندسہ کے مطابق اُنھوں نے تیار کیا تھا۔ قدیم فارسی کتب کے متعلق ان سے مجھے نہایت قیمتی اطلاعات ملیں، اور طہران جانے کے بعد بھی برابر خط و کتابت جاری رہی، اور اُن کے توسط سے، مجھے وہاں کی بکثرت کتابیں میسّر آئیں۔

تُرکی زبان کی تحصیل

تقریباً اِسی زمانے میں مجھے تُرکی زبان کے سیکھنے کا موقعہ ملا، اگرچہ افسوس ہے۔ اُس کی تکمیل نہ ہو سکی۔ ایک بہت قابل تُرک، طاہر بکؔ[ع] حسنِ اتفاق سے کلکتہ پہنچے یہ ایک بہت ہی قابل زبان داں سیّاح شخص تھے۔ ابتدا میں یمنؔ و شام کے مختلف سرکاری عہدوں پر بھی رہ چکے تھے، اور اِس کے بعد کچھ دنوں تک "ترجمان حقیقت قسطنطنیہ" کے ایڈیٹر بھی رہے تھے۔ فرنچ بہت عمدہ جانتے تھے فارسی اور عربی بے تکلف بولتے تھے۔ نہیں معلوم کیا مصائب پیش آئے، کیونکہ باوجود سخت سعی کے کبھی انھوں نے ظاہر نہیں کیا، کہ وہ ایک سخت بدحالی میں کلکتہ پہنچے۔ ایک دن میں مسجد سے نکل رہا تھا۔ میں نے ایک شخص کو دیکھا، جو ٹخنوں تک کا کُرتا اور چھوٹا سا کوٹ پہنے اور سر پر چھوٹا سا عربی عمامہ لپیٹے ہوئے، شامی یا عراقی عربوں کی طرح سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے۔ مجھے بے اختیار توجہ ہو گئی۔ میں نے عرب سمجھ کر عربی میں پوچھا، تو جواب سے مجھے شک ہوا کہ عربی لب و لہجہ نہ تھا۔ میں انھیں اپنے ساتھ لے آیا اور جب

ع "بک" کا تلفظ "بے" ہوتا ہے۔

کچھ دیر باتیں ہوئیں، تو اقرار کیا کہ میں ترک ہوں۔ معلوم ہوا کہ اس بے چارے نے یہ سُنا تھا کہ ہندستان میں عربوں کی زیادہ قدر ہوتی ہے۔ پریشانی کی وجہ سے چونکہ طالب اعانت تھا، اس لیے اپنے تئیں ایک ایسی مشتبہ حالت میں چھوڑ دیا تھا۔ دو چار دن ہی میں اس کی واقفیت، اُس کی قابلیت، وسیع واقفیت ظاہر ہوگئی اور میں نے والد مرحوم سے اجازت لے کر اپنے یہاں اُس کے قیام کا بندوبست کر دیا۔ سات آٹھ مہینے تک یہ وہیں رہا اور اس کے بعد قسطنطنیہ چلا گیا۔

اِن کی صحبت سے بھی مجھے بہت سے تعلیمی فوائد ہوئے۔ عربی کی بھی بہت اچھی استعداد تھی۔ تحریر بہت اچھی تھی۔ معلوماتِ عامہ خاص طور پر تھیں۔ میں نے اور بھائی مرحوم نے اور چند اور لوگوں نے بھی اِن سے ترکی شروع کر دی۔ بھائی مرحوم زیادہ مستعدی سے پڑھتے رہے، لیکن میں جاری نہ رکھ سکا۔

اُن کے خیالات بالکل فلسفیانہ تھے، اور مجھے حیرت ہوتی تھی کہ تمام مذہبی مباحث میں بجنسہ وہی خیالات وہ رکھتا تھا، اور اُن کے اثبات کے لیے بعینہ وہی دلائل استعمال کرتا تھا، جو نئے خیال کے اصلاح پسند، ہندستان میں ظاہر کر چکے ہیں۔ یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ ایک ہی حالات میں ایک ہی طرح کے خیالات کا پیدا ہونا، ایک قدر مشترک ہے، جو تمام ملکوں اور قوموں میں یکساں طور پر ظہور میں آتا ہے۔

اس زمانے میں چونکہ میں خود بھی سرسید مرحوم کے رنگ میں رنگ چکا تھا، اس لیے مجھے بہت دلچسپی ہوگئی اور بہت اُن کی قدر کرنے لگا۔ ترکوں کے حالات، ترکی لٹریچر، ترکی شاعری، اُس کے قدیم وجدید مختلف دور، مشاہیر ادبائے ترک، نئی پولیٹیکل جماعتیں اور بہت سی مفید باتیں اس زمانے میں اِنھی سے معلوم ہوئیں اور آگے چل کر

بہت کام آئیں۔ نامق کمال بک، یوسف ادیب، احمد جودت کا کلام بڑے ذوق و شوق اور ترنم کے ساتھ سنایا کرتا تھا، اور مجھ کو بڑی کیفیت آتی تھی۔ اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی، اور ترکی گانے کی لَے بھی بُری نہیں ہے۔ خود اپنے بھی ترکی اشعار سناتا اور ان کا ترجمہ کرتا۔ افسوس ہے کہ صرف ایک خط اُس کا قسطنطنیہ سے ملا۔ اور پھر کچھ حالات معلوم نہ ہوئے۔

شاعری

یہ عجیب بات ہے کہ درسیات کے باہر جس چیز سے میں سب سے پہلے آشنا ہوا، وہ شاعری تھی۔ مجھے یہ ٹھیک یاد نہیں پڑتا کہ پہلے پہل کیونکر میں اس چیز سے واقف ہوا، لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ زیادہ شوق اس کا مولوی عبدالواحد خاں سہسرامی، ایک شخص کی وجہ سے ہوا۔ جو مولوی محمد فاروق چریا کوٹی کے ایک مستند شاگرد تھے اور اردو فارسی کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ وہ ایک غریب گھر کے آدمی تھے۔ اُن کی بہن ہم لوگوں کے یہاں گھر کے اوپر کے کام کے لیے ملازم تھی اس تعلق سے اُن کی بھی آمد و رفت شروع ہوئی۔ اس وقت میری عمر دس گیارہ برس سے زیادہ نہ تھی دوپہر کے وقت یہ آیا کرتے اور بہن سے ملتے۔ اس میں ہم لوگوں سے بھی بات چیت ہونے لگی، اور پھر ہمارے باہر کے درس کے اوقات میں بھی آنے لگے۔ اس زمانے میں کلکتے میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا تھا۔ اس کا انتظام، پٹنہ کے بادشاہ میاں نامی ایک رئیس نے کیا تھا اس کے لیے کلکتے سے باہر کے بھی مشہور اشخاص مثلاً جلالؔ مرحوم بلائے گئے تھے تین طرحیں دی گئی تھیں، جن میں ایک یہ تھی:۔

مطلب کی بات صاف کہوں، کیا مجال ہے

تین دن تک مسلسل مشاعرہ جاری رہا تھا۔ مولوی عبد الواحد نے غزلیں لکھیں تھیں۔ اور مشاعرے میں پڑھی تھیں۔ انھوں نے اس کا حال ہم لوگوں کو سنایا اور اپنی غزلیں بھی سنائیں۔ یہ پہلی منظّم دلچسپی ہے، جو میرے حافظے میں شاعری کی نسبت پائی جاتی ہے۔ مجھ پر اس کا بہت بڑا اثر پڑا، اور اب اُن سے اس بارے میں صحبتیں رہنے لگیں اردو شعرا، کا وہ ذکر کرتے، اُن کے مقابلے اور معرکے اور لطائف سناتے۔ خاص خاص اشعار کے متعلق جو واقعات مشہور ہیں، اُن کا ذکر کرتے اور میری دلچسپی روز بروز بڑھنے لگی۔

چنانچہ میں نے بعض اساتذہ کے دواوین خریدے، مثلاً سوؔدا اور میرؔ وغیرہ اور فرصت کے اوقات میں اُن کا مطالعہ کرنے لگا۔ ساتھ ہی خود بھی لکھنے کا شوق ہوا۔ اور روز بروز طبیعت میں اس کا شوق اور کاوش بڑھتی گئی، چنانچہ مختلف زمینوں میں بہت سے اشعار کہے، مگر چونکہ خود اعتمادی پیدا نہیں ہوئی تھی، اس لیے مولوی عبد الواحد خاں کو بھی کبھی نہیں سنائے۔

اسی شوق کی وجہ سے میں نے پہلے پہل تذکرہ آبِ حیات خریدا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس کا دیباچہ اور مقدمہ اور اردو زبان و شاعری کی ابتدا کا تاریخی بیان اچھی طرح میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ابتدا میں مجھے اس طریقے سے بڑی وحشت ہوئی کہ صرف "آزاد" لکھ کر ایک بیان شروع ہو گیا۔ میں نے وہ حصہ چھوڑ دیا، اور جہاں سے شعراء کے حالات شروع ہوئے ہیں، مطالعہ شروع کر دیا، اور مجھے اتنی دلچسپی ہوئی کہ ان تمام شعراء کے کلیات و دواوین خرید کر اور تذکرہ کے اقتباسات کو اصلی موارد میں تلاش کر کے نکالا۔ حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالب بھی اسی زمانے میں

منگوائی گئیں۔

اس زمانے میں بمبئی سے ایک نیا گلدستہ "ارمغان فرخ" نکلتا تھا اور کلکتے میں بعض لوگ اُس کی طرحوں پر ماہوار مشاعرہ بھی منعقد کیا کرتے تھے۔ سب سے پہلی غزل جو میں نے لکھ کر دوسروں کو سنائی، وہ اسی کی ایک طرح پر تھی۔ اس میں طرح ہوئی تھی:-

پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

اور کلکتے کے مشاعرے میں بھی یہی طرح قرار پائی تھی۔ عبدالواحد نے اپنے چند اشعار اس میں سنائے اور مجھ کو اس درجہ شوق ہوا کہ بڑی کوشش و جانکاہی سے تقریباً تیس شعر لکھ کر اُن میں سے سترہ شعر منتخب کیے تاہم طبیعت مطمئن نہ تھی، اور کسی کو سناتے ہوئے ہچکچاتی تھی۔ بار بار حک و اصلاح کے بعد جب اپنے خیال میں اچھی طرح تیار ہو گیا تو میں نے عبدالواحد خاں کو مطلع سنایا۔ وہ سنتے ہی چیخ اٹھے اور اس قدر تعریف کی کہ میں جامے میں نہ سمایا اور طبیعت کو ایک عجیب قسم کی فرحت حاصل ہوئی، ایک ایسا نشہ چڑھ گیا کہ معلوم ہوتا تھا گویا ایک غیر معمولی فتح مندی حاصل ہوئی ہے۔ جب اور اشعار سنائے تو ہر شعر پر کھڑے ہو ہو کر انھوں نے تحسین کی، اور بھائی مرحوم، جو اس وقت تک اس میدان میں نہیں آئے تھے، میری اس کامیابی کو دیکھ کر بچپنے کے رقیبانہ رشک میں مبتلا ہو گئے۔ اس سے مجھے اپنی کامیابی پر اور مسرت ہوئی، اور عبدالواحد خاں کے بار بار جرأت دلانے سے میں تیار ہو گیا کہ غزل اشاعت کے لیے بھیجوں۔

تخلص "آزاد"

اُس وقت تک کوئی تخلص نہیں رکھا تھا۔ انھی نے "آزاد" تخلص تجویز کیا۔

بچپنے کے خیالات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ من جملہ اور وجوہ انتخاب کے میرے لیے سب سے زیادہ قوی تر وجہ یہ ہوئی تھی کہ گلدستوں میں غزلیں حروف تہجی کی ترتیب سے درج ہوتی ہیں، اور الف والے تخلص کو یہ فوقیت حاصل ہوتی ہے کہ سب سے پہلی جگہ ملتی ہے۔ یہ گویا ایک بڑی ضروری بات معلوم ہوئی تھی کہ گلدستہ کے ابتدائی اوراق میں کلام جگہ پائے۔ اس غزل کے دو تین شعر یاد ہیں۔ مطلع یہ تھا:۔

نشتر بدل ہے آہ کسی سخت جان کی نکلی صدا تو فصد کھلے گی زبان کی

گنبد ہے گرباد تہ ہے شامیانہ گرد شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی

آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

اس کے دوسرے ہی دن مشاعرہ تھا۔ خود تو جانے کی جرات نہ ہوئی، لیکن انھی کو غزل دے دی اور انھوں نے مشاعرے میں پڑھی۔ وہاں کی تعریف، خصوصاً مصرع طرح کی تضمین کی ترجیح پر مشاعرے کا اتفاق جب صبح کو مجھے سنایا گیا، تو میں بالکل مخمور ہو گیا تھا۔ بھائی مرحوم کو اسی دن کے بعد سے شوق ہوا اور چند دنوں کے بعد وہ بھی پورے شاعر بن گیے۔

اب یہ ہوا کہ کوئی گلدستہ ایسا باقی نہیں رہا تھا جو میں نہ منگواتا ہوں اور اس میں غزل نہ بھیجتا ہوں۔ اس دن کی خوشی مجھے اب تک یاد ہے جب "ارمغان فرخ" چھپ کر آیا اور پہلی مرتبہ میں نے اپنی غزل اس میں چھپی ہوئی دیکھی۔ انتظار کی وہ اذیت بھی یاد ہے، جو ایک مہینے تک اس کے انتظار میں برداشت کرنی پڑی تھی۔

اس زمانے میں لکھنؤ سے دو گلدستے علاوہ "پیام یار" کے نکلتے تھے۔ ایک مولوی لئیق حسن خورشید مرحوم کا "انتخاب" دوسرا منشی نوبت رائے نظر کا خدنگ نظر"

انتخاب بوجہ خورشید مرحوم کی ثقاہت اور شہرت کے زیادہ مقبول تھا۔ ہم نے ان دونوں میں بالالتزام غزلیں بھیجنے کا شرف حاصل کیا!

شاعری میں شاگردی

اب رات دن طبیعت پر غالب ذوق اسی کا رہنے لگا تھا۔ اُس وقت تک شعر گوئی کی حالت یہ تھی کہ نہایت فکر و کاوش سے خود کہتا اور خود ہی کاٹ چھانٹ کرتا رہتا۔ باقاعدہ کسی سے اصلاح نہیں لی تھی۔ مولوی عبدالواحد خاں سے بہت مدد ملتی رہتی تھی، کیونکہ گو وہ خود کچھ بہتر نہیں کہتے تھے، لیکن واقفیت اچھی تھی۔ اب خیال ہوا کہ کسی مشہور استاد کی شاگردی بھی کرنی چاہیے۔ چنانچہ پہلے منشی امیر احمد مرحوم کو دو غزلیں بھیجیں اور انھوں نے اصلاح کر کے فوراً واپس بھیج دیں، لیکن میری طبیعت کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئی۔

اس زمانے میں ایسا ہوا کہ شاعری کے متعلق کتابوں کی جستجو میں رسالہ "اصلاح" اور ازاحۃ الاغلاط لکھنؤ سے منگوایا۔ یہ دونوں رسالے مولوی ظفر احسن شوق نیموی کے تھے، اور فوائد متعلقہ شعر گوئی اور مبحثِ متروکات و تصحیح الفاظ میں بہت مفید ہیں۔ ان رسالوں سے ان کی دیگر تصانیف کا حال معلوم ہوا، اور پھر پٹنہ سے براہِ راست انھیں لکھ کر تمام کتابیں منگوائیں۔ اُن میں سرمۂ تحقیق اور یادگارِ وطن بھی تھی۔ سرمۂ تحقیق، جلال مرحوم کے رد میں ہے اور اُن کے اردو لغتوں پر اعتراضات کیے ہیں۔ یادگارِ وطن، میں اپنے وہ معرکے بیان کیے ہیں، جو جگنو اور جگنی اور بعض دیگر الفاظ و محاورات کے بارے میں اُن کے جلال مرحوم سے ہوئے تھے۔

اُس وقت جیسی طبیعت اور معاملات تھے، اُس کے لحاظ سے اِن حالات کا بہت زیادہ اثر پڑا اور اُن کی شاعرانہ واقفیت دل پر نقش ہوگئی، علی الخصوص یہ کہ شعر گوئی کے ساتھ قواعد، اصول اور زبان کے مباحث پر اُن کو ایسا اچھا عبور ہے کہ ایک پوربی دیہاتی ہو کر جلال مرحوم جیسے صاحبِ دعویٰ کو شکستِ فاش دے دی!

نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے اُن سے خط و کتابت کی اور اصلاح لینا شروع کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بہت جی لگا کر اصلاح دیتے تھے اور بعض اوقات غزل کیساتھ ایک ایک صفحے کے فوائد بھی، جن کا کچھ تعلق اشعار زیرِ اصلاح سے ہوتا تھا، لکھتے تھے، لیکن میں نے اُنھیں اپنے خاندانی حالات بالکل نہیں لکھے تھے۔ وہ انھیں اس وقت معلوم ہوئے، جب وہ والد مرحوم سے ملنے کے لیے آنے لگے۔ بھائی مرحوم نے داغ مرحوم سے اصلاح لینا شروع کر دیا تھا۔ مجھے اس وقت یہ خیال ہوا تھا کہ اصلاح میں شہرت سے زیادہ اس بات کو دیکھنا چاہیے کہ معلومات اور فن کے اعتبار سے کون شخص زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔

بچپن کی اخبار نویسی

طبیعت کا شوق اس قدر بڑھا کہ ایک گلدستہ نکلنے کا خبط ہوا، گویا اس وقت یہ خیال ہوا تھا کہ شاعری کی تکمیل کے لیے اِس منزل کا طے کرنا بھی ضروری ہے گلدستہ بلا رُپیہ کے نکل نہیں سکتا تھا مگر اُس وقت کے حالات بھی عجیب تھے۔ ہمارا حساب یہ تھا کہ جس قدر بھی رُپیہ کی ضرورت ہے، صرف پہلے نمبر کے لیے ہے، اور جہاں ایک نمبر نکل گیا تو تمام دنیا اس طرح اُس کے انتظار میں ہے کہ فوراً ہزاروں آدمی اُس

کے خریدار ہو جائیں گے، پھر رُپے کی کیا کمی رہے گی!

چنانچہ ہم نے اس وقت کے بچپنے اور طالب علمی کی بے سروسامانی میں پچاس رُپے کا انتظام کیا۔ لیتھو کا ایک پریس "ھادی پریس" کے نام سے ہریسن روڈ کلکتہ میں تھا۔ والد مرحوم کی بعض چیزیں وہاں چھپا کرتی تھیں۔ ہم نے نہیں طباعت کا انتظام کیا اور فوراً اعلان چھاپ کر شائع کر دیا۔ اعلان کا مضمون، عبدالواحد نے لکھا تھا۔ اُس کا نام "نیرنگ عالم" تجویز کیا گیا۔

اس تصور سے کس قدر طبیعت کو مسرت حاصل ہوتی تھی کہ عنقریب ایک ایسی چیز نکلے گی، جس کی لوح پر میرا نام بحیثیت مہتمم و ایڈیٹر کے درج ہوگا۔ پہلے نمبر کے لیے طرح "ملنے کے لیے" اور "مچلنے کے لیے" قرار دی تھی، چنانچہ غزلیات کا کافی ذخیرہ فراہم ہو گیا۔ جلال مرحوم، شوق، خورشید جاوید، اختر، احسان شاہجہاں پوری وغیرہ سے خاص طور پر غزلیں منگوائی تھیں اور انھوں نے بھیج دی تھیں، چنانچہ پہلا نمبر چھپ کر شائع ہوا اور اب اپنی توقع کے مطابق ہم اس انتظار میں ہوئے کہ کم از کم ایک ہزار خریدار، دوسرے نمبر کی اشاعت سے پہلے فراہم ہو جائیں گے، لیکن اس کا نتیجہ ظاہر تھا۔ بمشکل ڈیڑھ سو درخواستیں آئیں اور اُن میں سے بھی تھوڑے ہی آدمیوں نے پیشگی قیمت بھیجی، تاہم ہم نے ہمت نہ ہاری اور چند مہینوں تک اُسے جاری رکھا!

اسی زمانے میں فارسی شاعری کی طرف بھی طبیعت کو توجہ ہوئی اور "نل دمن" کے وزن پر ایک مثنوی لکھنا شروع کی۔

مشاعرے میں پہلی شرکت

سب سے پہلی مرتبہ مشاعرے میں غزل پڑھنے کا جو مجھے اتفاق ہوا، وہ ابتدائے شعر گوئی سے چھ سات مہینے بعد کا واقعہ ہے۔ پہلے کبھی اس کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور نہ کبھی کسی مشاعرے میں شرکت کی تھی۔ مشاعرے شب کو ہوا کرتے ہیں، اور ہمارے گھر کی پابندیاں ایسی تھیں کہ شب کو نکل ہی کب سکتے تھے؟ اول تو ویسے بھی اشعار سنانے کی اگر مشق نہ ہو، تو سنانا دشوار ہوتا ہے اور پھر مشاعرے میں پڑھنے کا ایک خاص اسلوب ہے، اور نا آشنا آدمی اُس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، لیکن میں پہلی ہی دفعہ مشاعرے میں شریک ہوا، اور اسی مرتبہ غزل پڑھی اور لوگوں نے استقبال کیا۔ گویا مدتوں سے مشاعروں میں کوئی ممتاز جگہ رکھتے آئے ہیں!

اس زمانے میں کلکتے میں علاوہ عام نو مشق لوگوں کے شمسؔ مرحوم بحیثیت استاد کے سمجھے جاتے تھے۔ وہ نساخؔ مرحوم کے لڑکے تھے اور نواب عبداللطیف کے بھتیجے۔ داغؔ مرحوم کے شاگرد تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بنگال میں اُن سے بہتر اردو پر قدرت رکھنے والا کوئی شاعر نہیں ہوا۔ وہ ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور بڑی تعریف کرتے تھے۔ اسی زمانے میں رضا علی وحشتؔ بھی نئے نئے شعر کہنے لگے تھے اور شمسؔ مرحوم سے اصلاح لیتے تھے۔

دو تین مجلسوں کے بعد ہی سے ہم دونوں بھائی مشاعروں میں اس حد تک ممتاز ہو گئے گویا ہمارا شمار اساتذہ میں تھا، اور یہ بات مان لی گئی تھی کہ ہمارے آگے سب سے آخر میں شمع آنی چاہیے۔ کئی مجلسیں ایسی بھی ہوئیں کہ جن میں باہر

کے اچھے اچھے شعراء نے بھی شرکت کی۔ ایک مشاعرہ، نواب سعید احمد خاں طالبؔ مرحوم کی موجودگی کی وجہ سے ہوا تھا، اور "نظر آئی" اور "ادھر آئی" طرح ہوئی تھی۔ میں نے اس میں مسلسل غزل سنایا تھا۔ چند مشاعروں میں تو ایسی خاص کامیابی ہوئی تھی کہ لوگوں نے بالاتفاق ہماری غزلوں کو حاصل مشاعرہ قرار دیا تھا، یا کسی خاص شعر پر مجلس کی مجلس لوٹ گئی تھی۔

اُس زمانے کی مدہوشیاں بھی عجیب تھیں۔ یہ چیزیں ایک بہت بڑی کامیابی معلوم ہوتی تھیں، حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ وہ مشاعرے ہی کیا تھے اور اُن میں جو لوگ شریک ہوتے تھے، اُن کی تحسین و تقبیح کیا مفید ہو سکتی تھی؟ بیچارے سب کے سب یہیں کلکتے کے نو مشق لوگ ہوتے تھے، بجز شمسؔ مرحوم کے اور کوئی شخص کلکتے میں کوئی وقیع حیثیت شاعری میں نہیں رکھتا تھا، ہاں البتہ کہنہ مشق لوگوں میں شہرتؔ مرحوم ایک خاص شخص تھے، لیکن جو کچھ بھی ان میں تھی کہنہ مشقی اور پُر گوئی تھی، ورنہ نہ تو کوئی خاص رنگ تھا اور نہ شاعری کا صحیح ذوق البتہ مبتدیوں میں رضا علی وحشتؔ اُس وقت بھی بہت اچھا کہنے لگے تھے، اور کچھ شک نہیں کہ روز بروز اُن کا ذوق ترقی کر رہا تھا۔

ایک اور مشاعرہ، جو طالبؔ مرحوم ہی کی تحریک سے اُن کے بعض دوستوں نے کیا تھا اور یہ طرح تھی "اِدھر دیکھ رہے ہیں، اُدھر دیکھ رہے ہیں" وہ کلکتے کے عام مشاعروں کے اعتبار سے ایک خاص مجلس تھی۔ طالبؔ مرحوم کے علاوہ پٹنہ اور لکھنؤ کے بھی بعض شعراء موجود تھے۔ شوقؔ نیموی بھی ڈھاکے جاتے ہوئے کلکتہ آ گئے تھے اور شریک ہوئے تھے۔ اس میں خاص طور پر طالبؔ مرحوم نے میرے

مطلع کی اس قدر تعریفیں کیں کہ میرا دماغ، آسمان پر چڑھ گیا، حالانکہ وہ مطلع، اب میں سوچتا ہوں، تو نہایت معمولی تھا ؂

سب لوگ جدھر وہ ہیں اُدھر دیکھ رہے ہیں
ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں ؏

اس مشاعرے کی غزلیں اُنھوں نے دلّی میں ایک گلدستے کی شکل میں شائع کر دی تھیں۔

اِسی زمانے میں والد مرحوم بمبئی گیے، تو وہاں بھی شاعری کا مشغلہ جاری رہا۔

اُردو کی تعلیم

اُردو کی تعلیم کا میرے عجب حال ہے۔ میں بالکل نہیں بتلا سکتا کہ کس ترتیب سے ہوئی۔ اردو مکہ معظمہ ہی سے شروع ہو گئی تھی، لیکن حروف تہجی کی مشق کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوا۔ کلکتہ پہنچ کے سفر اور والدہ کی علالت اور پھر والیسی کی وجہ

؏ جناب مالک رام صاحب کا بیان ہے کہ اُنھوں نے مولانا سے اِس شعر کے بارے میں استفسار کیا، تو مولانا نے فرمایا کہ اُن کا نہیں ہے، لیکن جناب علی محمد صاحب طارق نے بتایا کہ اُن کے پوچھنے پر مولانا نے قطعیت سے جواب نہیں دیا، بہر حال مولانا نے مجھے جو کچھ لکھایا تھا، وہی پیش کر رہا ہوں۔

سے ایسا انتشار رہا کہ ہم لوگوں کی تعلیم پر کوئی توجہ نہ ہوئی۔ اردو گھر میں اپنی بڑی
بہن اور باہر حافظ صاحب سے پڑھتے تھے، لیکن عرصے تک مجھے یاد ہے کہ میں نے
کچھ نہ سیکھا۔ لکھنے کی بالکل مشق نہیں ہوئی، البتہ قرآن پڑھنے کی وجہ سے اردو
بھی اٹک اٹک کر پڑھنے لگا تھا۔

جب والد مرحوم نے زیادہ توجہ کی، تو فارسی اور عربی شروع ہو گئی اور اردو
کا معاملہ بالکل رہ گیا، لیکن اس کے بعد ہی مجھے یاد پڑتا ہے کہ مجھ کو خود بخود اردو
مضمون پڑھنے کا شوق ہوا۔ کچھ قصے مجھ سے بڑی بہن کے پاس تھے، اور ایک مجموعہ
پرانی قسم کے مثنوی کا تھا، جس میں ابراہیم بن ادھم وغیرہ کے قصے درج تھے۔ وہ پڑھتی
تھیں اور میں سنتا تھا۔ اس سے زیادہ شوق ہوا اور پھر میں اُن کے پاس زیادہ بیٹھنے
لگا اور اردو پڑھنے لگا۔ اس کے بعد بطور خود پڑھنا شروع کیا اور لکھنے بھی لگا۔ اس
طرح آہستہ آہستہ استعداد حاصل ہوتی گئی۔ شروع میں سنہ لکھنے کی مشق کی
تھی، کیونکہ مجھے اس کا ایک خاص قسم کا املا بہت اچھا معلوم ہوتا تھا، چنانچہ
میں ہر جگہ سنہ لکھتا پھرتا تھا۔ والد مرحوم کی بہت سی کتابوں اور دوسرے کاغذوں
پر اسی زمانے کا میرے ہاتھ کا سنہ لکھا ہوا ہے اور وہ ۱۳۱۲ سنہ ھ ہے۔ اس سے معلوم
ہوتا ہے کہ یہ بات اسی زمانے کی ہے۔

اس کے بعد کچھ عرصے تک فارسی اور عربی کے درس کا اتنا بار رہا کہ اس
سے مہلت ہی نہ مل سکی۔ سب سے پہلے جو اردو علم ادب سے میری شناسائی ہوئی
وہ فسانۂ عجائب، باغ و بہار، اور قصہ حاتم طائی وغیرہ پرانے قصص ہیں۔ ہمارے
یہاں جو لوگ اُس وقت ہر وقت موجود رہتے تھے، اُن میں ایک شخص، والد کا مرید

محمد امین تھا۔ اس کو قصوں کا بہت شوق تھا، اور وہ کبھی کبھی مجھے زبانی قصے سنایا کرتا تھا۔ جب اُس کا ذخیرہ ختم ہو گیا اور میری فرمائش بڑھتی گئی، تو پھر وہ چند قصے خرید کر اپنے ساتھ لانے لگا۔ اس طرح مجھے اُن کے دیکھنے کا موقعہ ملا اور جب اس میں دلچسپی معلوم ہوئی تو مزید مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ اس پر اُس نے الف لیلہ اردو اور چند اور ایسے ہی پرانے قصے لا کر دیئے۔

ناول

اسی زمانے میں، دلّی کے ایک شخص، محمد اکرام اللہ آنے لگے۔ انھوں نے قصوں کا شائق دیکھ کر ناولوں کا ذکر کیا، اور ایک کتاب، جس کی لوح نہ تھی، اُن کے پاس میں نے دیکھی۔ اسے لے کر پڑھنے لگا، تو کچھ اس طرح کے مطالب نظر آئے جن کا کچھ ربط اور مطلب سمجھ میں نہ آیا۔ یہ دراصل اُس کی تمہید تھی۔ چند صفحوں کے بعد جلی قلم سے اشخاص کے نام اور مقولے، بصورت سوال وجواب نظر آئے جن سے میں بالکل ناآشنا تھا۔ ابتدا میں میری سمجھ میں یہ بات بالکل نہ آئی کہ اگر یہ قصے کی کتاب ہے تو باغ و بہار کی طرح ... ابتدا سے قصّے کا ذکر کیوں نہیں ہے، اور یہ یکایک باہم سوال و جواب کیا ہے؟ لیکن پھر جب اُس کے بعد کا کچھ حصہ پڑھا تو دلچسپی ہونے لگی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ ایک نئی چیز پاکر مجھے بڑی ہی خوشی ہوئی تھی۔ میں اُسے "ناوَل" یا "ناوُل" کہا کرتا تھا۔ یہ دراصل مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول، ملک العزیز ورجینا تھا۔

انھی سے مجھ کو اور بھی بہت سے ناول ملے اور اب اس صنف سے بھی میں

اچھی طرح آشنا ہو گیا۔ ان ناولوں کے ساتھ کتابوں کے اشتہارات بھی ہوتے تھے ان سے اور ناولوں کا پتہ چلتا تھا۔ اب میں نے خود بھی منگوانا شروع کیا۔ سب سے پہلے حافظ عبدالستار کتب فروش چوک کو ایک خط لکھکر ۲ روپے کے ناول منگائے تھے اور انتخاب کرنے میں بڑی کوشش کی تھی کہ اس رقم میں زیادہ سے زیادہ تعداد حاصل ہو جائے۔ ایک ناول کے لوح پر نثار حسین کے قومی پریس کا اشتہار تھا۔ اس میں ایک کتاب "المامون" بھی تھی۔ میں نے اسے بھی ناول سمجھا اور منگوا لی، لیکن جب اسے دیکھا تو بڑی مایوسی ہوئی کہ وہ تو کوئی دوسری چیز ہے۔ اردو کی ادبی تصنیفات میں یہ پہلی کتاب ہے، جو میں نے دیکھی۔ اس کے کچھ دنوں بعد جب شاعری کا شوق ہوا، تو اس سلسلے میں آب حیات دیکھی۔ پھر حیات سعدی، اور یادگار غالب، نظر سے گذری۔

اس اثنا میں اس قدر تعلیم بھی بڑھ چکی تھی کہ اب ان کتابوں کو ناول کے دھوکے میں نہیں منگواتا تھا، بلکہ واقعی ان کا موضوع سمجھ کر۔ رعد کی جنتری ہر سال والد مرحوم لیا کرتے تھے۔ اس جنتری میں البرامکہ کا اشتہار دیکھا اور اسے بھی منگوایا۔ اب اچھی طرح ان کتابوں کے مطالعے کا شوق ہو چکا تھا۔ یہ ۱۹۰۶ء کی بات ہے۔

شوقِ مطالعہ

جس قدر بھی روپیہ میسر آسکتا، وہ میں نئی نئی کتابوں پر خرچ کرتا اور ہندستان کے تمام کتب فروشوں کے یہاں سے شوق میں فہرستیں منگا کر اور ان میں جن کتابوں کا نام اچھا معلوم ہوا، ان پر نشان دیکر ایک بڑی فہرست مطلوبات کی تیار کر لی تھی۔ مولوی ضیاء الرحمن امام مسجد کولوٹولہ نے کتابوں کی دوکان کی تھی۔ وہاں بھی جانے لگا، اور وہ

میری مطلوبات اپنے طور پر منگا لیتے تھے اور مجھے یہ آسانی رہتی تھی کہ ادھار بھی لے آتا تھا۔

اب مولانا حالی، محمد حسین آزاد، مولانا شبلی، عبدالحلیم شرر، مولوی نذیر احمد وغیرہ نئے مصنفوں کی اکثر کتابیں میری نظر سے گزر گئیں اور نئے اردو علم ادب کا پورا فہم و شوق حاصل ہو گیا۔

اخبار سے سابقہ

اخبارات کے بارے میں میری سب سے پہلی واقفیت یوں حافظے میں باقی ہے کہ جنگ چترال کا زمانہ ہے۔ ہمارے مکان کے نیچے کی منزل میں والد کے ایک مرید، غلام رسول نے اپنے خرم کی آفس کھولی تھی۔ وہ "اخبار عام" لاہور منگوایا کرتے تھے، جو اردو کا ایک بہت ہی پرانے فیشن کا اخبار ہے۔ روزانہ تھا۔ اُن کے یہاں ہر ہفتے کا مجموعہ آیا کرتا تھا۔ اُس کے پہلے صفحے میں "اخبار کی بہار" کے عنوان سے چھوٹی چھوٹی خبریں مختصر مزاحیہ اظہار رائے کے ساتھ چھپا کرتی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سب سے پہلے اخبار کی ہستی سے میں "اخبار عام" ہی میں آشنا ہوا اور پہلے صفحے کی وہ چھوٹی چھوٹی خبریں مجھ میں دلچسپی پیدا کرنے لگیں۔ یہ ۹۷ء یا ۹۸ء کی بات ہے۔

اس کے بعد اودھ اخبار لکھنؤ اور اینگلو بانکی پور نظر سے گذرا۔ اس وقت کلکتے سے بھی ایک اخبار "دارالسلطنت" کے نام سے نکلتا تھا۔ وہ بھی والد مرحوم کے یہاں آتا تھا مجھے یاد ہے کہ میں نے سرسید احمد مرحوم کی تصویر اور اُن کے انتقال

کی خبر، اپنچ میں پڑھی تھی۔ سر سید کا انتقال ۱۸۹۸ء میں ہوا ہے۔

اس زمانے میں رمضان اور عید کی رویتِ ہلال کے تعین کے بارے میں والد مرحوم کا علمائے کلکتہ سے اختلاف ہوا تھا، اور اس کی بڑی شورش شہر میں پھیل گئی تھی۔ والد مرحوم کے مریدین میں ایک شخص، حاجی مصلح الدین ہیں۔ وہ دارالسلطنت کے دفتر سے فارسی کا ایک اخبار "اختر" لائے جو قسطنطنیہ سے نکلتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس کی لوح پر لفظ "اختر" بالمقابل بصورتِ معاکس چھپا کرتا تھا۔ مجھے اس سے دلچسپی ہوئی، لیکن ٹائپ کی وجہ سے میں اسے اچھی طرح پڑھ نہ سکا۔

اسی زمانے میں والد مرحوم نے "المؤید" (قاہرہ۔ مصر) خریدنا شروع کیا، اور یہ پہلا عربی اخبار ہے، جو میں نے دیکھا۔ اس کے بعد اردو کا مطالعہ زیادہ وسیع ہوا، تو اب پیسہ اخبار، اودھ اخبار، اور بمبئی کا ایک اخبار، پنچ بہادر تھا، وہ میں دیکھنے لگا۔ پھر گلدستوں کو دیکھتے دیکھتے ماہوار رسائل کا شوق ہوا اور مرقع عالم ہردوئی، اور دلگداز لکھنؤ منگانے لگا۔ ان میں ناول بھی ہوتا تھا، اور مضامین کا بھی حصہ ہوتا تھا۔ ایک پرچہ اسی زمانے میں ندوہ اور دہابیوں کے رد میں نکلا تھا! "تحفۂ حنفیہ" اور مولوی احمد رضا خاں کے انتصار میں ان کے ایک معتقد، قاضی عبدالوحید مرحوم نے پٹنے سے نکالا تھا۔ مولوی نظیر الحسن ایرایانی فتح پوری اسی زمانے میں کلکتے آئے تھے، تاکہ علمائے ندوہ کی تکفیر پر علمائے کلکتہ سے دستخط لیں، اور نیز اس بارے میں مصنفات بریلوی کی اشاعت کریں۔ وہ والد مرحوم کے یہاں بھی آئے تھے۔ والد مرحوم نے دستخط تو نہیں کیا، لیکن ندوے سے وہ خوش بھی نہ تھے۔ یہ تحفۂ حنفیہ بھی لائے۔ پھر برابر آنے لگا۔ میں اسے بھی شوق سے پڑھتا تھا

یہ نئے مطالعہ کا زمانہ تقریباً دو سال کا زمانہ ہے، یعنی بالکل ناواقفیت سے لے کر اور سرگرم اور وسیع مطالعے تک تقریباً اتنی مدت صرف ہوئی

سرسیّد سے تأثّر

اردو کی نئی کتابوں کے سلسلے میں سرسید مرحوم کی بعض چھوٹی چیزیں بھی منگوائی تھیں، مثلاً مجموعۂ لکچرز، اور لکچر اسلام پر، اس سے اُن کی اور تصنیفات کا شوق ہوا اور اس طرح میری زندگی کے ایک بہت بڑے فکری تغیر کی بنیاد پڑی۔

سب سے پہلے میں نے فضل الدین تاجر کشمیری بازار لاہور سے مجموعہ مضامین تہذیب الاخلاق کی تین جلدیں منگوائیں۔ ان میں ایک جلد سرسیّد کے مضامین کی، ایک نواب محسن الملک کی، ایک مولوی چراغ علی کی، اور ایک مجموعہ ہے۔ اس کے بعد تفسیر القرآن کی پہلی جلد، جو پنجاب میں چھپی تھی، وہ منگوائی اور پھر براہ راست ڈیوٹی شاپ علی گڑھ سے سرسید کی کتابیں منگوانے لگا اور رفتہ رفتہ میں نے تمام تصنیفات منگوا لیں۔ سرسیّد کی تصنیفات کا شوق بتدریج اس طرح دل و دماغ پر چھا گیا کہ اب کوئی تصنیف اُن کی تصنیف کے سامنے آنکھوں میں نہیں جچتی تھی۔ شوق نے ارادت و عقیدت کی شکل اختیار کر لی، اور یہ ہوا کہ ایک عقیدت مند کی طرح، جو اپنے شیخ و مُرشد کی ملفوظات کے ایک ایک لفظ کو دل و جان دے کر خریدنا چاہے، اُن کی تصنیفات کا ہر ورق و صفحہ میں نے نہایت جد و جہد کر کے حاصل کیا۔

ٹائپ کی چھپائی سے ذوق

سرسید کی تصنیفات سے مجھے ٹائپ کے چھاپے سے ایک ذوق پیدا ہو گیا، اور چونکہ سرسیدؔ کی کتابیں پہلے ٹائپ میں چھپی ہیں، اور بعض بعض پھر لیتھو میں بھی نقل ہو گئیں اس لیے میری کوشش یہ رہی کہ ہر کتاب کا ٹائپ ہی کا ایڈیشن حاصل کروں۔ تفسیر اور مجموعہ تصنیفات احمدیہ کے علاوہ، جن میں تبیین الکلام اور خطبات احمدیہ ہیں۔ میں نے تہذیب الاخلاق کی تینوں اشاعتوں کی مکمل فائلیں بھی منگوائیں۔ پہلی اشاعت سات سال تک رہی ہے اُس کی بعض جلدیں، ڈیوٹی ٹائپ میں نہیں تھیں۔ میں نے کوشش کر کے اور فی جلد پچیس روپیہ قیمت دیکر اُسی کے توسط سے حاصل کیں۔ پھر خیال ہوا کہ ان کے بہت سے مضامین، علی گڑھ گزٹ اور سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار میں بھی، جو ان کے سفر یورپ کے بعد تک جاری رہا، نکلے ہوں گے، نہایت گراں قیمت دے کر اُن کی فائلیں بھی حاصل کیں اور سرسید کے انتقال تک علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کی جتنی فائلیں مل سکیں، وہ بھی منگوائیں۔ مقصود یہ ہے کہ سرسید کی تصنیفات سے شوق نہیں بلکہ عشق ہو گیا تھا اور طبیعت کو اس تصور سے بھی صدمہ ہوتا تھا کہ اُن کے قلم سے نکلا ہوا کوئی لفظ ہے اور میرے پاس نہیں ہے!

”حیلہ جوئی“!

اُس زمانے میں شوق و محویت کا یہ حال تھا کہ رات کو دو دو بجے تین تین بجے تک یہ کتابیں ہوتی تھیں اور میرے بستر کے سرہانے کی ٹمٹماتی ہوئی موم بتی۔ دن کو

درسیات کی مشغولیت کی وجہ سے نیز والد مرحوم کی نگرانی اور ہیبت و سطوت سے مطالعے کی مہلت نہیں ملتی تھی، اس لیے اُس کی کسر، رات ہی کو نکلتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اُس زمانے میں رمضان آگیا تھا۔ اس کے ایک سال پہلے میں نے پورے روزے پہلی مرتبہ رکھے تھے۔ یہ دوسرا رمضان تھا۔ عشاء کے بعد میں مطالعہ شروع کرتا اور دو ڈھائی بجے ختم کرتا جب سحری کھلانے کے لیے ماما بلانے آتی۔ ایک مرتبہ والد مرحوم، صحن سے جاتے ہوئے سامنے سے گزرے۔ ایک بجا ہوگا۔ اُن کی نظر میرے بستر پر پڑ گئی۔ دیکھا کہ میں دونوں کہنیاں تکیے پر رکھے کتاب دیکھ رہا ہوں۔ انھوں نے وہیں سے پکارا اور کہا، رات کے وقت کیا دیکھ رہے ہو؟ کون سی کتاب ہے؟ مجھے اپنی یہ چالاکی اور حیلہ جوئی اب تک یاد ہے کہ میرے سرہانے مختصر المعانی بھی تھی، میں نے فوراً کہہ دیا کہ مختصر المعانی!

رحمت اللہ رعد کی جنتری میں غالباً ۱۹۰۱ء کی جنتری میں حیاتِ جاوید کی طباعت کے قریب الاختتام ہونے کا ذکر چھپا تھا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ اس کتاب کی اشاعت کا کیسا سخت اور جانکاہ انتظار مجھ میں پیدا ہو گیا تھا۔ کم سے کم دو تین جوابی کارڈ ہر مہینے نامی پریس کانپور کو لکھتا تھا کہ کس قدر حصہ باقی ہے۔ اس سے پہلے الفاروق کے لیے میں نے اسی پریس کو چند خطوط لکھے تھے، اور مجھے بڑی ہنسی آئی جب برسوں کے بعد منشی رحمت اللہ مرحوم نے ان خطوط کی عبارت یاد دلائی!

"حیاتِ جاوید" کے لیے بے تابی

ڈپٹی نذیر احمد صاحب کو میں نے پیشتر سے خط لکھ دیا تھا کہ بمجرد اشاعت، میرے نام

وی پی بھیج دیں۔ پھر کھٹکا ہوا کہ کہیں تاجرانہ اصول پر احتیاطاً منظوری کی تجدید نہ کرنا چاہیں، اس طرح ایک ہفتے کی اور دیر ہو جائے گی۔ پھر انھیں ایک خط لکھا اور اس میں صراحت کر دی کہ بلا کسی اطلاع کے وی پی بھیج دیں، لیکن بایں ہمہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے منیجر کو بھی میرا شوق دیکھ کر ستم ظریفی سوجھی تھی۔ ایک دن ایک کارڈ ملا کہ حیات جاوید چھپ کر تینوں قسم کی آگئی ہے۔ آپ کی درخواست درج رجسٹر ہے۔ اگر مطلوب ہو، تو بھیج دی جائے!

میں اس غم و غصہ کو کیونکر بیان کروں، جو اس دن مجھ پر طاری ہوا۔ اگر کوئی ذریعہ بھی ایسا ہوتا کہ چھ دن کی تاخیر کی جگہ ایک دن کے اندر علی گڑھ سے کتاب مجھے پہنچا دی جاتی تو میں اپنے تئیں بیچ کر بھی اسے حاصل کرتا۔ اور تو کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی یہ سمجھ کر کہ کم از کم تین دن کی تخفیف ہو جائے، تار لکھوایا اور بھیج دیا۔ آخر چار دن کے بعد پارسل آیا۔ پیون تک کی صورت، اس کے کاندھے کا بوجھل تھیلا، اس کے ہاتھ میں لٹکے ہوئے پارسل، اس زمانے میں میری آنکھوں کے لیے دنیا کا سب سے زیادہ حسین منظر تھا جس کے انتظار میں کوئی روح بے چین رہ سکتی ہے، اور جس کے آمد پر کوئی آنکھ استقبال کر سکتی ہے!

میں اب بھی اس عالم کو یاد کرتا ہوں۔ کلکتے میں چٹھی رسانوں کا یونی فارم خاکی رنگ کا ہوتا ہے۔ سر پر بھی خاکی پگڑی ہوتی ہے۔ یہ مجھے خواب میں بھی نظر آتا اور اس کو شش میں کچھ عجب کشش میرے لیے پیدا ہو گئی تھی۔ عموماً پوسٹ صبح کو ملتا، جس میں پارسل کی روانگی کی اطلاع ہوتی تھی۔ پارسل یا تو اسی دن دوپہر کو آتا، یا دوسرے دن۔ معاملے کی یہ توسیع میرے لیے بڑی ہی باعث کشاکش ہو گئی تھی۔ جی چاہتا کہ آج ہی آئے۔ دوپہر کے وقت میں

اپنا مطالعہ وہ گھر نیچے کے کمرے میں یا باہر کے ایک تخت پر، جو بچھا رہتا تھا، بیٹھا کرتا، محض اس انتظار میں کہ پیون کے آنے پر بلا ایک لمحہ کی تاخیر کے میں اُس کا استقبال کر سکوں!

خوش قسمتی سے حیاتِ جاوید کے لیے دوسرے دن کا انتظار نہ کرنا پڑا۔ پارسل جب ہاتھ میں آیا، تو وہ وقفہ، جو اُس کی بندش کے کھولنے میں لگا، اور وہ لمحۂ مضطرب، جو اُس کی لوح کے دیکھنے کے وقت طاری ہوا، مجھے اب تک نہ صرف یاد ہے، بلکہ محسوس ہو رہا ہے۔ میں نے اُسے رپیہ بھی نہیں دیا اور پارسل لے کر اوپر بھاگا۔ حیاتِ جاوید ایک ہزار صفحے میں ختم ہوئی ہے۔ میں نے دو شب میں ختم کر ڈالی تھی۔ یہ بھی مجھے یاد ہے کہ اپنے اس معمول کے مطابق کہ کسی نئی کتاب کے حصول پر کم سے کم ایک وقت کا کھانا ضرور فراموش ہو جاتا تھا، اُس دن بھی میں نے شام کا کھانا نہیں کھایا۔ اِس خوف سے کہ اتنی دیر تک مطالعے سے محروم رہ جاؤں گا۔ حیاتِ جاوید تین قسم کی چھپی تھی۔ درجۂ اول مجلد بارہ رپیہ تھا۔ میرے پاس درجۂ دوم کا نسخہ تھا۔ کمال شوق میں درجۂ اول بھی منگایا۔ یہ ۱۹۰۱ء کی بات ہے۔

اس اثنا میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ کتب بینی کا شوق بہت وسیع ہو چکا تھا۔ استعداد بھی برابر بڑھتی گئی تھی۔ اب فارسی و عربی کتابوں کا مطالعہ بھی اُسی ذوق و شوق سے کرنے لگا تھا۔ عربی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تو گھر میں تھا، اور نئی کتابوں کے لیے والد مرحوم سے تحریک ضائع نہیں جا سکتی تھی۔ فارسی کے لیے اور زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی۔ اس زمانے میں کانپور میں مولوی نور الدین ایک شخص تھے، اور وہ بمبئی سے مصری کتابیں منگا کر فروخت کیا کرتے تھے۔ ان سے میں نے نئی نئی کتابیں بہت منگوائیں۔ بمبئی میں حاجی آقائے شیرازی اور ملک التجار کا پتہ، مولوی عبد الرزاق البرامکہ نے بتلایا کہ جن سے خط و کتابت ہو چلی تھی۔

اِن سے فہرستیں منگوائیں اور فارسی کی نئی نئی کتابیں مطبوعات ایران ہیں منگوانے لگا۔

علوم جدیدہ کا شوق

سرسید کی تصنیفات کے مطالعے نے علوم جدیدہ سے نہ صرف آشنا بلکہ شائق و گرویدہ بنادیا تھا۔ اب وہ دن تھا کہ عقائد و افکار میں ایک طوفان اٹھ چکا تھا۔ میری زندگی اب چل نہیں رہی تھی، بہہ رہی تھی۔ تمام قدیم چیزیں حقیر و ذلیل ہو چکی تھیں۔ علوم جدیدہ اور یہ ترکیب سرسید مرحوم ہی کی ہے، اور ہر وہ چیز، جو اُن کی طرف منسوب ہو، میرے قلب و ذہن کے لیے بمنزلہ معبود کے تھی۔ اب شوق ہوا کہ اردو، فارسی، عربی میں نئے علوم کی جتنی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں، انھیں جمع کیا جائے۔ مولوی حالی مرحوم کی کتاب جیالوجی، جو مصر کے ایک عربی ترجمے کا ترجمہ ہے، پیرزادہ محمد حسین کی منطق استقرائی، اور ٹنیسن لکچر کا ترجمہ، لارڈ بیکن کی سوانح عمری، سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے بعض تراجم مثلاً پولٹیکل اکانومی وغیرہ، اور پنجاب کی لٹریری سوسائٹی کی کتابیں قائم کردہ ڈاکٹر لائٹنر کہ مولوی حالی مرحوم بھی اُس کے ایک مترجم تھے، مولوی ذکاء اللہ کے بعض ترجمے مرزا پور اور لکھنؤ چرچ مشن کے ابتدائی عہد کے علمی تراجم، سرکاری یونیورسٹیوں کے تعلیمی اور انعامی سلسلے کی تمام کتابیں منگوائیں اور شوق سے دیکھیں، مگر اِن سے طبیعت کو سیری نہ ہوئی۔ اب مصر و شام کی کتابوں کا شوق ہوا۔ مولانا شبلی کو ایک خط لکھا اور ان سے دریافت کیا کہ علوم جدیدہ کے عربی تراجم کون کون ہیں اور کہاں کہاں ملیں گے؟ یہ پہلا خط ہے، جو میں نے مولانا کو لکھا۔ انھوں نے دو سطروں میں یہ جواب دیا کہ مصر و بیروت سے خط و کتابت کیجیے! خیر میں نے پہلے وہاں سے فہرستیں منگوائیں اور پھر کتابیں

منگواتا رہا۔

عربی رسائل و اخبار

اِسی زمانے کا واقعہ ہے کہ کلکتے سے مولوی احمد حسن مرحوم فتحپوری نے "احسن الاخبار" نکالا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اِس واقعے سے مجھے اپنی ابتدائی زندگی میں بہت فوائد پہنچے، ازاں جملہ یہ کہ اس کے مبادلے میں مصر و شام کے اخبارات و رسائل آنے لگے، اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں اِس دنیا سے آشنا ہوا۔ مصر و شام، طرابلس کے اخبارات کے علاوہ المنار، الہلال پہلے پہل یہیں دیکھے۔ ان کی وجہ سے نئی عربی کتابوں کے علم و انتخاب اور مطالعے میں بہت سہولتیں حاصل ہوئیں۔ ہر مہینے تقریباً بیس پچیس روپیہ کی کتابیں ضرور منگواتا تھا۔

علوم جدیدہ پر جو کتابیں عربی میں شائع ہوئی ہیں، ان میں سے اکثر اسی زمانے میں میں نے مطالعہ کیں۔ احسن الاخبار کے دفتر ہی میں ریویو کے لیے جرجی زیدان کی "مشاہیر الشرق" آئی تھی۔ اِس سے بڑی دلچسپی ہوئی۔ اس میں مصر و شام کے تمام گذشتہ بڑے بڑے مصنفوں اور عہد جدید کے مصلحوں کی تصویریں اور حالات۔ میں رفاعہ بک طہطاوی، علی باشا مبارک، محمود فلکی، ڈاکٹر فانڈیک، ناصیف یازجی وغیرہ مصنفین کا حال اِس سے معلوم ہوا، اور اُن کی تصنیفات بھی حاصل کیں۔

والد مرحوم کے پاس "المؤید" کے علاوہ دو اور عربی اخبار بھی آیا کرتے تھے۔ احمد فارس کا الجوائب اور طرابلس الشام کا طرابلس، جن کو ہم نے بچپنے میں کبھی نہیں دیکھا تھا اب اُن کے پرانے پرچے گھر میں ملے۔ اِس سے بہت مفید نئی قسم کی اطلاعات حاصل

ہوئیں۔ کتابوں میں "ارتفاعُ الغنوُع" بھی اِسی زمانے میں مل گئی تھی۔ اِس سے بھی اِس طریق کی جن جن کتابوں کا پتہ چلا، ڈھونڈ ڈھونڈ کر حاصل کیں۔

ایک مرحوم کا کتبخانہ

اِسی زمانے میں کلکتے میں ایک سن رسیدہ اور اچھے شائق علم شخص، حکیم عبدالرحیم دھلوی تھے۔ اِن کو اردو کتابوں کے مطالعے کا بڑا شوق رہا تھا۔ اِسی زمانے میں اِنھوں نے انتقال کیا اور اِن کی بیوی نے اِن کی کتابوں کے فروخت کا اعلان کیا، تو تقریباً دو ہزار کتابیں تھیں۔ مجھے اِن میں بہت سی ایسی کتابیں اردو فارسی کی ملیں، جو ہندستان کے اوائلِ عہد طباعت میں چھپی تھیں اور بالکل ناپید ہیں۔ خدا بخش تاجر کتب کا ذکر پہلے آ چکا ہے، اس کے یہاں سے بھی اِسی قسم کا بہت قیمتی ذخیرہ ملا اور میری معلومات میں اضافہ ہوا۔

رتن سنگھ زخمی کی حدائق النجوم، جو نصیرالدین حیدر کے زمانے میں لکھی گئی، اور امجد علی شاہ کے زمانے میں چھپی اور جو غالباً جدید علم ہیئت پر مشرقی زبانوں میں سب سے پہلی اور جامع و مبسوط کتاب ہے، اور باقاعدہ رصد خانے کے عملیات کے ساتھ لکھی گئی ہے جو مرزا محمد حسین مرشد آبادی اور مسٹر ہبلی ریزیڈنٹ لکھنؤ نے لکھنؤ میں قائم کیا تھا، وہیں ملی۔ اِسی طرح اوائلِ حکومت انگریزی کی وہ تمام مطبوعات، جو کلکتے یا مدراس ذخیرہ میں چھپی ہیں اور جن میں بعض بے نظیر کتابیں ہیں، مثلاً رسالۂ قلبیہ، مقاصدِ علوم، جامع بیان ریاضی، رسالہ در علم فزک (فزکس)، رہنمائے علوم وغیرہ۔

جدید علوم کے اولین داعی

مولوی کرامت علی ہنگوی، جو سرسید سے بھی پہلے اِس راہ کے داعی تھے اور بہت ذہین وطبّاع اور غیرمعمولی قابلیت کے شخص تھے، اُن کی تصنیفات بھی یہیں سے ملیں، مثلاً مقدّمہ در علومِ السِنہ و لغات اور مآخذِ علوم، جو نواب محسن الملک اور مولوی چراغ علی مرحوم کے اُن تمام مباحث کا ماخذ ہے، جن میں انھوں نے اسلامی علوم و تمدن کا ذکر کیا ہے، اور جو اس رنگ کی ہندستان میں پہلی کتاب ہے کہ جدید انکشافات ذکر کرکے اُسے عہد اسلامی کی تحقیقات سے منسوب کیا جائے۔

رسالہ قلبیہ، علم تشریح جدید اور مسئلۂ دوران خون پر اُس زمانے کی مشرقی تصنیف ہے، جبکہ یورپ میں نئی نئی یہ تحقیقات مکمل ہوئی تھی۔ مدراس میں مرزا محمد جان، انگریزوں کے میر منشی اور معلّم ہیں اور علمائے ہند کی واقفیت کے لیے چند انگریزی کتابوں سے ترجمہ کرکے عربی میں لکھتے ہیں۔ عربی عبارت اتنی پختہ اور صحیح مصطلحات پر مبنی ہے کہ اُس زمانے میں اِس طرح کے قدیم و جدید ذوق کا اجتماع حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔

رسالہ مقاصد العلوم، لارڈ پردہم کی کتاب کا ترجمہ ہے، اور اُس وقت کیا گیا ہے جبکہ لارڈ پردہم نے نئی نئی اپنی کتاب لندن میں چھاپی ہے۔ ترجمہ مرزا محمد حسین نے کیا ہے، جو میرے خیال میں نئے علوم کے اولین ہندستانی داعی ہیں، اور جن کا ذکر سیر المتاخرین نے بھی کیا ہے۔ نواب سعادت علی خاں نے انھیں لندن بھی بھیجا تھا۔ اُس وقت کوئی مسلمان اِس سفارت کے لیے نہیں ملتا تھا، جسے تحائف

کے ساتھ وہ اپنی نئی اسکیموں کی کامیابی کے لیے اور ڈائرکٹروں سے براہ راست، علی رغم گورنر تعلقات پیدا کرنے کے لیے بھیجنا چاہتا تھے۔ لیکن مرزا محمد حسین، کلکتے سے گیے اور کام کے لیے تیار ہو گیے، وہاں انھوں نے نئے علوم کا بھی مطالعہ کیا۔ لارڈ برد ہم کے لکچر سُنے۔ سٹی کالج میں یہ لکچر ہوئے تھے، جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے۔ لارڈ موصوف نے پال مال کلب میں انھیں مدعو بھی کیا، جو لندن کا سب سے بڑا علمی اور معزز کلب ہے اور بجز اکابر عصر کے اور کوئی اِس کا ممبر نہیں ہو سکتا۔ سر سید جیسا کہ انھوں نے سفرنامے میں لکھا ہے، بڑی کوشش کے بعد وہاں جا سکے تھے۔

کلکتے کے گذشتہ عہد کے ان علما میں جو انگریزی حکام سے تعلق رکھنے کی وجہ سے نئی باتوں سے آشنا تھے، ایک وسیع الاطلاع شخص، مولوی کبیر الدین تھے جنھوں نے اردو گائیڈ پریس قائم کیا تھا اور ایک مجلس، اشاعتِ کتب قدیمہ کے لئے بھی " نادی اشاعۃ العلوم "، کے نام سے قائم کی تھی۔ سوسائٹی کی بہت سی کتابیں انھی کی تصحیح کردہ ہیں۔ غدر سے پہلے جب ڈاکٹر اسپرنگر، لکھنؤ اور دلّی کے شاہی کتبخانوں کے مطالعے اور فہرست مرتب کرنے کے لیے گیے تو اُن کے مساعد یہی تھے۔ اس سلسلے میں اُنھیں ہندستان کے تمام بڑے بڑے کتب خانوں کے دیکھنے کا موقعہ ملا تھا۔ لکھنؤ کے کتب خانے کی بھی اُنھوں نے انڈیا آفس کے لیے فہرست تیار کی تھی۔ اسی زمانے میں اُن کا کتب خانہ اور پریس بھی فروخت ہوا، اور مجھے اُس میں بہت قدیم نایاب کتابیں مل گئیں۔ اِن میں بہت سی کتابیں نئے علوم کی بھی تھیں، جن کی عام طور لوگوں کو اطلاع نہیں ہے۔ طبعیات جدید میں دو ضخیم کتابیں، جو سرجان گلگرسٹ کی نگرانی میں ولیم ٹامسن، صاحب تاریخ چین نے بعض علما کی اعانت سے فارسی میں مرتب

کی تھی، اور جو فورٹ ولیم کے کالج کے پریس میں چھپی تھی، رسالہ در علم منجنیق، مولوی احمد علی گوپاموئی نے فارسی میں مرتب کیا اور فورٹ ولیم کالج پریس میں چھپا۔ اس میں انھوں نے علم میکانک کے نئے اصول بڑی شرح وبسط کے ساتھ اور نہایت عمدہ مصطلحات کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

ایک عجیب رسالہ، مولوی علی تھانوی، صاحب کشاف اصطلاحات الفنون کا بھی ملا۔ کتاب مذکور سب سے بہتر علمی یادگار ہے، جو قرون اخیرہ میں ہندستان نے پیدا کی، مگر یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی کہ مصنف مذکور، حکام فورٹ ولیم سے علائق رکھتے تھے، اور چونکہ علوم فلسفہ قدیم میں توغل رکھتے تھے، جیسا کہ کشاف سے ظاہر ہے، اس لیے نئے علوم کا حال سُنکر اُن میں تجسس پیدا ہوا، اور جس قدر مبادی و اصول تحقیق کر سکے، وہ اس رسالے میں جمع کیے۔ رسالے کی عربی عبارت بہت صاف اور رواں ہے، اور کشاف کی طرح الجھی ہوئی نہیں ہے۔

خاندانی اثر سے مالی فائدہ

غرضکہ اس طرح اِن کتابوں کا خاص طور پر شوق رہا اور برابر مطالعے میں اضافہ ہوتا گیا۔ اِس قدر کثرت کے ساتھ قیمتی کتابوں کے خریدنے کے لیے بہت روپیہ مطلوب ہوتا تھا۔ کتابوں کے لیے روپیہ دینے میں والد مرحوم بہت فیاض تھے، لیکن اُس کی بھی ایک حد تھی۔ میرے شوق کا یہ حال تھا کہ روز روز نئی نئی کتابوں کا حال معلوم ہوتا اور خریدنے کے لیے بے چین ہو جاتا، اس لیے روپیہ کی بھی جستجو رہتی تھی۔ ابتدا میں ایسا ہوا کہ والد مرحوم کے بعض خاص معتقدین، جو زیادہ آتے جاتے

رہتے اور ہمیشہ اس بات کے خواہشمند رہتے کہ ہم لوگوں کی خدمت کریں، اور والد مرحوم کی بے نیازیوں کی وجہ سے مواقع نہ ملتے تھے، اُن سے میں نے کام لینا شروع کیا اور یہ زندگی میں صرف ایک واقعہ ہے کہ اپنے خاندانی اثر سے میں نے کوئی مالی انتفاع کیا ہو بعد کو یہ بات بھی طبیعت کو کھٹکی، لیکن کتابوں کے شوق میں اس وقت ساری باتیں طبیعت کو گوارا تھیں۔

ان میں سے بعض اشخاص ایسے تھے کہ جوں ہی انھیں یہ معلوم ہوا، تو انھوں نے اس کو اپنے لیے ایک بڑی ہی خوشی اور سعادت کی بات سمجھ کر فوراً فرمائش کی تعمیل کی، اور کہہ دیا کہ جس قدر کتابیں مطلوب ہوں، منگوالی جائیں۔ قیمت وہ ادا کردیں گے۔ بعض اشخاص ایسے تھے کہ انھی کے پتے پر باہر سے پارسل میں منگوالیتے اور وہ قیمت ادا کردیتے۔ صدہا روپے ان لوگوں نے اس طرح ادا کیے۔ بعض اوقات ایک ایک پارسل سَو سَو روپیہ کا ہوتا تھا۔ بلاشبہ اِن لوگوں کا یہ احسان میرے لیے بہت قیمتی ہے، اور میں اُن کے حقوق کا معترف اور اُن کا شکر گذار ہوں۔ ان لوگوں میں بعض اشخاص نے پورے پورے کتب خانے، مجھے شائق دیکھ کر خرید لیے۔ کلکتے میں ایک پرانے اہل حدیث مولوی تھے، جن کا نام میں بھول گیا۔ کتب فروشی بھی کرتے تھے، مگر خود بھی کتابوں کے شائق تھے، نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی تمام کتابیں اُن کے پاس تھیں۔ نیز اور بہت سی علمی کتابیں، قلمی اور مطبوعہ نایاب تھیں۔ وہ چنار کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اپنی کتابیں فروخت کرنا چاہیں۔ شرط یہ تھی کہ پورا کتب خانہ فروخت کریں گے۔ اصلی قیمت کتابوں کی اگر شمار کی جاتی تو ہزار پندرہ سو سے کم نہ تھی۔ وہ پانچسو روپیہ طلب کرتے تھے۔ منشی محمد رضا نے جو

والد مرحوم کے مریدوں میں ہیں، خود چلکے تمام کتابیں خرید کیں۔ اور میرے حوالے کردیں بعد کو جب میں نے تحریر و ترجمہ شروع کیا، تو وہ بھی ایک حد تک اس شوق کے لیے معاون ہوا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس شوق میں یہی شوق محرک تھا، یعنی باجرت مضامین ورسائل لکھ کر خرید کتب میں اُن سے مدد لی جائے۔

بھائیوں میں رقابت!

بسا اوقات کھیل کود، لہو ولعب، یا زیادہ عمر ہوئی تو تمتعات دنیوی، یا اور مقاصد حیات، عزیزوں اور بھائیوں میں رشک و مقابلے کا باعث ہو جاتے ہیں، لیکن ہم ابتدا سے اِن تمام راہوں سے نابلد تھے۔ اُس وقت تمتعاتِ زندگی میں سے اگر کوئی چیز تھی، تو وہ صرف مطالعہ اور جمعِ کتب کا شوق تھا، چنانچہ یہ بات عجیب سمجھی جائے گی کہ ہم دونوں بھائیوں میں مقتضیاتِ عمر سے اگر رشک و مقابلے کا جذبہ پیدا ہوتا بھی تھا، تو اسی چیز میں۔ دونوں کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ کتابیں خریدیں اور زیادہ سے زیادہ مطالعہ کریں، اور اس کی کیفیت و کمیت میں ایک دوسرے سے بازی لے جائیں۔ اس زمانے میں خیالات بھی عجیب تھے۔ کتاب بہر حال مطالعے کے لیے ہے اور ایک نسخہ لاکھوں دماغوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہو سکتا ہے، لیکن ہمارے شوق نے رقابت کی صورت اختیار کرلی تھی۔ ایسا ہوتا کہ مثلاً بھائی مرحوم کوئی نیا ذخیرہ، کوئی نئی کتاب، مطالعے کی کوئی نئی شکل پیدا کرتے، اور اس پر مجھے رشک ہوتا اور میری سعی بھی ہوتی کہ نہ صرف اسے حاصل کروں بلکہ اُن سے بڑھ کر کوئی اور کامیابی پیدا کرلوں۔ یہی خیال اُن کا بھی تھا۔ اِس میں بعض اوقات تکرار

اور نزاع بھی ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی تکرار یہاں تک طول پکڑتی کہ والد کی مداخلت تک کی نوبت آجاتی۔ وہ اگرچہ بہت سمجھاتے کہ کتابوں کے لیے حسد و نزاع کس قدر فضول ہے، لیکن ہم لوگ اُس پر قانع نہ ہوتے!

مقصود یہ ہے کہ زندگی کے اِس حصے میں جو قویٰ اور اَھواء کے ابتدائی عہد ظہور ہونے کی وجہ سے دوسری چیزوں اور خواہشوں کا مرکز ہوتا ہے، ہمارے لیے صرف مطالعہ و کتب میں محصور تھا۔ تمام جذبات بالطبع انھیں میں صرف ہوتے تھے۔ آگے چل کر پھر یہ مقابلہ، شاعری اور تحریر و رسائل میں بھی ہونے لگا۔

عِلمی محسن

۱۹۰۱ء میں جب بمبئی آئے اور کچھ عرصے تک مستقل قیام رہا، تو یہاں شوق کتب کے لیے زیادہ بہتر مواقع میسر آئے یہاں کئی ایرانیوں کی کتابوں کی دکانیں تھیں اور مصری مطبوعات کے بھی کتب خانے ہیں۔ اِن کی وجہ سے مطالعے اور انتخاب کتب کا بہت اچھا موقعہ ملا۔ عام دکانوں میں زیادہ تر وہی کتابیں موجود رہتی ہیں، جن کی عام طور پر بکری ہوتی ہے۔ نئی کتابیں، علی الخصوص مصر و شام کی دورِ جدید کی تصنیفات بہت کم آتی ہیں لیکن اتفاق سے ایک صاحب ذوق شخص نے اسی زمانے میں کتابوں کی تجارت شروع کی تھی۔ اِن کا نام، عبداللہ جبتیکر تھا۔ عربی ادب کی خود بھی اچھی استعداد رکھتے تھے، اور عربی میں شعر کہنے کا بھی شوق تھا۔ انھوں نے شیخ امین خانجی نامی ایک قسطنطنیہ و مصر کے تاجر کے ساتھ ہندستان کی تجارت کے لیے شرکت بھی کرلی تھی۔ ان کے یہاں تمام علوم و فنون کا ذخیرہ موجود تھا، علی الخصوص نئی قسم کی تصنیفات کا۔ میرے تعلیمی عہد کے لیے

اس دوکان کا وجود بھی بہت مفید ہوا۔ ان سے واقفیت ہو گئی تھی۔ میں گھنٹوں ان کی دوکان میں رہتا اور ہر علم و فن کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا، اور پھر اپنی مالی حالت کے مطابق جتنی کتابیں خرید سکتا، خرید لیتا۔ صدہا روپیہ کی نئی کتابیں بھی میری فرمائش پر وہ منگوا لیتے اور جب مجھے روپیہ ملتا، میں قیمت ادا کر دیتا۔ میری تعلیمی زندگی پر اُن کا یہ احسان ہے۔ افسوس کہ اُن کا انتقال ہو چکا ہے۔

کتابت و انشا

والد مرحوم اگرچہ ہم کو درسِ نظامیہ سے بھی کچھ زیادہ پڑھانا چاہتے تھے اور طب و ریاضی اور نجوم و جفر تک انھوں نے ہمیں پڑھایا، لیکن زیادہ زور صرف معقولات اور فروعاتِ فقہ کے حفظ و استحضار پر دیتے تھے، ما بعد کو انھوں نے بعض مُتونِ تصوف مثل فُصوص و عوارف کے بھی درس پڑھائے، لیکن حدیث و تفسیر پر نصابِ درسیات سے زیادہ زور نہیں دیا تھا۔ عام موجودہ نصابِ درس سے زیادہ جو انھوں نے کیا، وہ یہ تھا کہ بیضاوی صرف چند پارے ہی نہیں پڑھائی، جیسا کہ عام قاعدہ ہے، بلکہ پوری پڑھوائی منطق پہ بہت زور دیتے تھے۔ کہتے تھے، جس نے منطق نہیں پڑھی ہو، وہ قابلِ خطاب ہی نہیں ہے۔

منطق کے ذوق کی وجہ سے ان کی طبیعت اور اُن کی بول چال بھی اس درجہ اسلوبِ منطق میں ڈھل گئی تھی کہ اپنی روزمرہ کی بول چال میں بھی اس کے عادی ہو گئے تھے، باستثنا عوام کے خطاب و صحبت کے۔ جب کبھی اُن کی تقریر ہوتی تھی، تو وہ بالکل منطقی قواعد و اقسامِ بیان و استدلال اور ترتیبِ مقدمات و مناط میں بالکل ڈھلی ہوتی

ہوتی تھی۔ ساتھ ہی تفتازانی وغیرہ کے اقسام معانی وبیان کے بھی اس درجہ خوگر ہو گیے تھے کہ ہر بات اسی تقسیم کے اعتبار سے بیان میں آتی تھی، یہاں تک کہ بعض اوقات گھر میں جب ہم لوگوں کو کوئی بات بطور نصیحت کے کہتے، یا کبھی ناراض ہو کر غیظ وغضب میں کوئی بات کہنے لگتے، تو اُس میں بھی وہ ترتیب قائم رہتی، اور اُن کا درس تو بالکل ہی اسی اعتبار سے ایک منظم ومرتب بیان ہوا کرتا تھا۔ اسی طرح فروعاتِ فقہ کا بھی استحضار بہت تھا، ایسا کہ اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ یہی بات وہ ہم لوگوں میں بھی چاہتے تھے۔ اسی سبب سے اور اقسام تعلیم پر اُنھوں نے کچھ زیادہ ہمت صرف نہ کی۔

ان اسباب سے اثنائے تعلیم میں بطریق درس کوئی مشق تحریر وکتابت یا ترجمہ کی کرائی جاتی، اس کا ہمیں کوئی موقعہ حاصل نہ تھا۔ والد مرحوم کے علاوہ اور جتنے اساتذہ سے تحصیل کا اتفاق ہوا، اُن میں سے کوئی بھی اس کوچے سے آشنا نہ تھا، تاہم میں ابھی کتب وسطیٰ کی تحصیل میں مشغول تھا کہ خود بخود بلا کسی تحریک کے دماغ نے ایک راہ تحریر وکتابت کی پیدا کرلی، اور اس کی صورت یوں ہوئی کہ ابتدا سے طبیعت سبق کے باربار دہرانے یا رٹنے پر مائل نہ تھی۔ ذہن وحفظ کی وجہ سے صرف درس اور قبل از درس ایک مطالعہ کفایت کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا خیال ہوا کہ سبق سے پہلے سبق کا مطالعہ کرکے اور حواشی وشروح دیکھ کر اُس کا بیان وحل لکھ لوں، اور قبل از درس والد مرحوم کو سناؤں اس زمانے میں خود والد کی ہدایت کی وجہ سے یہی ڈھنگ درس کا پڑچکا تھا، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ کتاب شرح وقایہ تھی اور جب میں نے وہ والد مرحوم کو سنایا تو بہت خوشنود ہوئے اور اس بارے میں مجھے بھائی مرحوم پر ترجیح دی۔

جس قدر میں سوچتا ہوں، یہ پہلی تحریک ہے، جو مجھے علمی عنوانوں پر کتابت کے

لیے ہوئی۔ اس کے بعد تقریباً جتنی کتابیں میں نے پڑھیں، سب پر ایسی ہی تحریرات لکھیں جن کو ایک طرح کی شرح یا اُن پر درس اور لکچر سمجھنا چاہیے۔ درس کے بعد جو نئے فوائد سننے میں آتے تھے، اُن کا بھی اِن پر اضافہ ہو جاتا تھا۔ مختصر، مطوّل، میبذی، شمس بازغہ میرزاہد، شرح وقایہ، ہدایہ، بیضاوی، بعض اجزاء تفسیر خازن، سدیدی، رشیدیہ ان پر صدہا صفحے میرے سیاہ کیے ہوئے موجود ہیں۔

تحریر کی پہلی مشق

یہ کتابت کی پہلی مشق تھی، اور اس میں شک نہیں کہ اِس طریقے سے ایسا عجیب وغریب فائدہ ہوا، جس کی قدر و قیمت اب معلوم ہوتی ہے۔ دقیق سے دقیق کتاب کو صرف صبح کے وقت، درس سے ایک دو گھنٹے پہلے ایک مرتبہ دیکھا اور اس کی تشریح و توضیح قلمبند کی، اس کے بعد اساتذہ سے درس لیا اور ہنگام درس بطور نوٹ کے اُسے مکمل کرتا رہا، پھر کتاب اُسی گوشے میں ڈال دی، جس گوشے میں ہمیشہ رہتی تھی، لیکن الحمد للہ کہ یہ بات تجربے میں آئی کہ اُن میں سے بڑا حصہ کتابوں کا متعدد دوروں میں شرح وبسط کے ساتھ پڑھایا اور کوئی نئی ضرورت تحقیق و مطالعے کی پیش نہیں آئی۔ اب تک وہ مباحث اس طرح آنکھوں کے سامنے ہیں، گویا ابھی لکھ کر اٹھا ہوں۔ درس کی صدا، مطالعے کی نگاہ، حافظے میں اتنی روشن نہیں ہے، جس قدر وہ نقوش جو لکھنے میں قلم سے نکلے۔ بعد کو جب حافظہ و استحضار کے علمی مباحث نظر سے گذرے، تو معلوم ہوا کہ یہ اس فن کے مسلمات سے ہے کہ ذہن پر ایک تحریر و کتابت کا جتنا قوی اثر پڑتا ہے، وہ سو مرتبہ بھی کسی چیز کے پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

کتابوں پر نوٹ

والد مرحوم ہمیشہ نصیحت کیا کرتے تھے کہ بلا نوٹ کرنے کے کبھی مطالعہ نہ کرو۔ اگر لکھنے کے لیے کوئی بیاض نہ ہو تو کتاب کے صفحے ہی پر لکھو۔ صفحے میں لکھنے کے لیے گنجائش نہ ہو تو صرف ایک نشان ہی دے دو، مگر کوئی نہ کوئی قلم کا عمل ضرور کرو۔ اس طرح کتاب کے تمام مباحث ہمیشہ کے لیے محفوظ رہیں گے۔ خود والد مرحوم کا مدت العمر یہی طریقہ رہا۔ اُن کے کاغذات میں صدہا بیاضیں محض مطالعے کے نوٹ ہیں۔ وہ اتنے مختصر ہیں کہ اب بدقت سمجھ میں آسکتے ہیں، تاہم نوٹ ہیں اور اُن کے تعجب انگیز استحضار و حفظ کا اصلی بھید انہی میں پنہاں ہے۔ اس کے بعد میری بھی یہ عادت ہوگئی کہ جب کبھی کسی چیز کو یاد رکھنا چاہا، تو ایک مرتبہ لکھ لیا۔ پھر وہ چیز محفوظ ہوگئی۔ ایک زمانے میں مجھے حفظ قرآن کا شوق ہوا تھا۔ حافظوں کی طرح رٹنا تو دشوار تھا۔ میں نے ایک ایک رکوع لکھنا شروع کیا اور اس طرح سورتیں کی سورتیں بلا بار بار تلاوت کے حفظ ہوگئیں۔ دو تین رکوع دن میں نقل کر لیتا اور عشا اور صبح کی نماز میں اسے دہرا لیتا۔ زمانوں کی تعلیم میں بھی یہ طریقہ ذہین طبائع کے لیے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہے۔

پہلا ترجمہ

بہرحال کتابت کی یہ پہلی مشق تھی۔ اس کے بعد درسیات کے دائرے سے باہر پہلی مرتبہ جو لکھنے کا اتفاق ہوا، وہ ایک مختصر رسالے کا ترجمہ ہے۔ والد مرحوم کے مریدوں اور مدرسہ عالیہ کے اساتذہ میں ایک شخص، مولوی حبیب الرحمٰن مرحوم تھے، جلال الدین

سیوطی کا ایک مختصر رسالہ، احکام جمعہ پر ہے، "نور اللمعہ فی خصائل الجمعہ"۔ انھیں اس رسالے کے ترجمے کی کوئی ضرورت پیش آئی۔ وہ شام کو رسالہ لے کر آئے اور میرے ماموں زاد بھائی، محمد سعید کی مدد سے ترجمہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ اسی زمانے میں مکہ معظمہ سے آئے تھے اردو بالکل نہیں جانتے تھے۔ اس لیے نہ وہ ان کی سمجھتے تھے اور نہ یہ اپنا سوال انھیں سمجھا سکتے تھے۔ میں نے ایک دن ان سے وہ رسالہ لیا اور انھیں اس کا ترجمہ لکھوا دیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور کہا، اگر اس کا پورا ترجمہ ہو جائے، تو بہت بہتر ہو، چنانچہ میں نے ترجمہ کر کے انھیں دے دیا، اور وہ ایک گنی بطور تحفہ کے میرے پاس لائے۔ میں نے ان سے کہا کہ روپیہ تو مجھے نہیں چاہیے، لیکن آپ مجھے آئین اکبری کا ایک نسخہ لا دیجیے۔ یہ آئین اکبری، سوسائٹی کی چھپی ہوئی اب تک میرے پاس ہے اور میری پہلی قلمی محنت کی یادگار ہے۔

"خصائص محمدیہ"

اس رسالے کے ترجمہ کی وجہ سے مجھے اس کام کی طرف توجہ ہو گئی اور اس میں ایک طرح کی نئی لذت محسوس ہونے لگی، لیکن اس وقت مطالعے کا ذوق اور نئی نئی کتابوں کا شوق اس درجہ ہجوم کیے ہوئے تھا کہ اسے چھوڑنا، طبیعت پر گراں گزرتا تھا، تاہم میں نے کئی چھوٹے چھوٹے رسالوں کا ترجمہ کیا۔ ایک قلمی رسالہ انھی جلال الدین سیوطی کا "انیس اللبیب فی خصائص الحبیب" ہے۔ یہ مختصر رسالہ ہے، جس کو پھر مطول و مشرح دو جلدوں میں لکھا، جو خصائص کبریٰ کے نام سے مشہور ہے اور دائرۃ المعارف حیدرآباد میں چھپ گیا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ، والد مرحوم کی کتابوں میں تھا۔ میں نے اس کا ترجمہ کیا اور

انھی مولوی حبیب الرحمان کو دیا۔ چنانچہ وہ اُنھوں نے خصائص محمدیہ کے نام سے چھاپ کر شائع کر دیا ہے۔

منہاجُ العابدین

اِسی زمانے میں مولوی عبدالواحد خاں مرحوم کی، جن کا ذکر پہلے کر چکا ہوں، آمد و رفت ہو چکی تھی۔ اِن کی وجہ سے بھی دو کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ایک منہاجُ العابدین امام غزالی اور ایک نفحاتُ الاُنس جامی۔ نفحات کے چند اجزاء کر کے چھوڑ دیے۔ وہ بہت بڑی کتاب ہے، لیکن منہاج العابدین پوری ہو گئی۔ منہاج کا ایک نہایت عمدہ قلمی نسخہ، والد مرحوم کے کتب خانے میں تھا۔ اُس وقت تک چھپا نہیں تھا، اور وہ اُن کتابوں میں رہتا تھا، جو اُن کے مطالعے کے لیے صندوقوں سے باہر رہتی تھیں۔ ایک دن وعظ میں اُنھوں نے امام غزالی اور اُن کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے منہاج کا ذکر کیا کہ معترضین کے جواب اور احیاء کے انتصار میں انھوں نے لکھی ہے۔ عبدالواحد خاں مرحوم نے اُس کے دیکھنے کا شوق ظاہر کیا۔ چونکہ وہ نسخہ باہر ہی تھا، اِس لیے مجھے بآسانی مل گیا اور اُنھیں دے دیا۔ اس واقعے کی وجہ سے اس کتاب پر خاص طور پر توجہ ہوئی اور پھر خیال ہوا کہ اس کا ترجمہ کر دیا جائے، چنانچہ وہ مکمل ہو کر شائع ہو گیا۔

لیکن ادبی قسم کی تحریرات کی اب تک کوئی راہ نہیں نکلی تھی۔ اس کی ابتدا بھی خود بخود ہوئی اور اس طرح ہوئی کہ نئی اردو تصنیفات، علی الخصوص سرسید مرحوم کی تصنیفات اور مجلدات تہذیب الاخلاق کے مطالعے کے اثنا میں طبیعت میں

خود بخود اس رنگ کی تحریر و تصنیف کا شوق پیدا ہو گیا۔

حسرت!

اس زمانے میں اخبارات و رسائل کا مطالعہ بھی شروع ہو چکا تھا، اس لیے اس سے اس شوق کو مزید تحریک ہوئی۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں پڑتا کہ کوئی معین تحریر اس قسم کی کب لکھی، لیکن ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۰ء میں شوقیہ کاغذ سیاہ کرتا رہتا تھا، مگر کسی تحریر کو بغرض اشاعت بھیجنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ میں آج کل جب کبھی اپنے اس زمانے کے شوق اور باقاعدہ تعلیم و ہدایت کے فقدان اور موجودہ زمانے کی ترقی یافتہ درس گاہوں کے طریق پر غور کرتا ہوں، تو حسرت ہوتی ہے کہ کاش ایسے وسائل مجھے اس وقت ملے ہوتے!

آج کل کے اسکولوں اور کالجوں کے پڑھے ہوئے لوگ اُس محرومی کا بالکل اندازہ نہیں کر سکتے، جو ہم لوگوں کو اپنے تعلیمی عہد میں پیش آئی۔ موجودہ زمانے میں مضمون نویسی بھی قواعد زبان کا ایک ضروری جزو بن گئی ہے۔ انگریزی میں تو بعض مصنفین گرامر نے اِس کے قواعد کو بھی صرف و نحو ہی کے سلسلے میں منضبط کیا ہے۔ جدید کتب قواعد ادب اور فنون بیان و انشا میں ایک مستقل موضوع درس ہے، اور اسکولوں میں بالکل اُسی طرح باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے، اور درس مشق کرائی جاتی ہے، جیسے اور فنون عالیہ کی۔ ایک انگریزی اسکول کا تعلیم یافتہ کتنا ہی محروم و ناقص ہو لیکن وہ قواعد و مبادیات کتابت سے ضرور واقف ہو گا، گو اپنی کند ذہنی اور عدم مناسبت کی وجہ سے اُس سے کام نہ لے سکے، لیکن ہمیں یہ بات کہاں نصیب تھی؟ قدیم عربی

درس گاہوں میں اس کا وہم و گمان بھی کسی کو نہیں ہوتا، اور ہم نے تو باقاعدہ مدارس میں بھی تعلیم نہیں پائی۔ نہ کوئی تعلیم تھی، نہ کوئی ہدایت، نہ کوئی مشورہ، نہ کوئی صحبت، نہ نکتہ چیں اور مصلح نگاہ۔ محض ذاتی شوق اور خود اپنے ذہن کا ذاتی مراقبہ۔

مضمون نویسی

اس زمانے میں اردو زبان بھی میری منجھی نہ تھی اور مادری اثر غالب تھا۔ کلکتے میں بجز والد کے اور کسی اہل زبان کی صحبت میسّر بھی نہ تھی، تاہم شاعری کے ذوق نے اس کمی کو بہت جلد دور کر دیا، مگر کتابت و انشا کے لیے بجز مطالعے کے اور کوئی شے راہ نما نہ تھی۔ بہر حال اپنے طور پر میں مضامین لکھنے لگا۔ اور آہستہ آہستہ مطالعے سے موضوع اور مطالب کے جمع و اقتباس کی بھی راہیں کھلنے لگیں۔

کچھ دنوں کے مطالعے کے بعد میں نے کئی چھوٹے چھوٹے مضمون لکھے۔ احیاء العلوم سے تعصب کی مضرتیں اخذ کر کے ایک مضمون لکھا تھا۔ ایک مضمون عوائد و رسوم پر لکھا تھا اور ایک فارسی رسالہ قسطنطنیہ کا چھپا ہوا، جو یورپ کے معلومات سے پُر نکلتا تھا، نظر سے گزرا تھا۔ اس میں قدیم اقوام کی عجیب عجیب رسمیں و عوائد جمع کی تھیں "رسالۂ عوائد ملل" اس کا نام تھا۔ زیادہ تر اس سے مطالب اخذ کیے تھے۔ اس قسم کی تحریریں دراصل ایک مشق کا کام دیتی تھیں۔ خود لکھتا تھا، اور پھر بار بار ایک نکتہ چیں نظر سے حک و اصلاح کرتا تھا۔

اس زمانے میں میرے قدیم اور رسمی افکار و عقائد میں اضطراب و شبہات

کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ تہذیب الاخلاق میں اور سرسید کے انتظار میں امام غزالی کے مباحث کلامیہ دیکھ کر امام صاحب کی تصنیفات کی جستجو طبیعت میں خاص طور پر پیدا ہوئی اور بڑی جستجو کے بعد اُن کے چند رسالے حاصل کیے۔ ایک مجموعہ ملا، جس میں الجام العوام اور مضنون صغیر و کبیر تھے۔ مضنون پر سرسید نے ریویو لکھا تھا اس سے شوق ہوا کہ پورے رسالے کا ترجمہ کر دوں۔ رسالے میں بکثرت علمی اور فلسفیانہ مصطلحات اور تراکیب تھیں، اور اس لیے کاوش و محنت کرنی پڑی تھی، لیکن ترجمہ پورا ہو گیا اور غالباً یہ پہلی تحریر تھی، جس پر طبیعت مطمئن ہوئی تھی۔

اسی زمانے میں ندوۃ العلماء کے جلسۂ کلکتہ کے مبادیات شروع ہوئے۔ اور ندوہ اور مخالفین ندوہ کے متوازی کیمپ قائم ہو گیے۔ ساتھ ہی رسائل و مضامین بھی شائع ہونے لگے۔ ندوے کے سفرا میں ایک شخص، مولوی نظام الدین جھجھری تھے وہ مخالفین کے تازہ رسائل و مضامین دکھلاتے تھے اور میں اُن کے جوابات لکھ کر دیدیا تھا، اور پھر ندوے کی استقبالی کمیٹی انھیں چھاپ کر شائع کر دیتی تھی۔ اس قسم کے دو تین چھوٹے چھوٹے رسالے شائع ہوئے اور غالباً مذہبی رسائل گزشتہ کے بعد نئی قسم کی چیزوں میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ اشاعت تک نوبت آئی۔

اسی زمانے میں امام صاحب کی تہافتہ الفلاسفہ کا ترجمہ شروع کیا اب شاعری سے زیادہ یہ نئی غذا روز بروز مرغوب تر ہوتی جاتی تھی، اور سب سے بڑا، بلند تر مقام، جو کسی انسان کے لیے ہو سکتا تھا، یہ نظر آتا تھا کہ مضامین لکھے جائیں اور وہ ہمارے نام سے شائع ہوں۔ اس کے بعد اس سے بلند تر مقام یہ تھا کہ کسی

اخبار یا رسالے کے ایڈیٹر ہوں!

پہلا اخبار "المصباح"

چند دنوں کے بعد کی بات ہے کہ محمد موسیٰ نامی ایک شخص نے نیا نیا پریس جاری کیا تھا۔ والد مرحوم کے بعض کاغذات وغیرہ لینے کے لیے وہ آمد و رفت رکھتا تھا اُس نے خیال کیا کہ تجارتی اغراض سے کوئی اخبار نکلے۔ یہ میرے خاص ذوق کی بات تھی۔ میں نے اور زیادہ ترغیب دی اور بالآخر وہ آمادہ ہو گیا" مصباح الشرق" مصر سے نکلتا تھا۔ میں نے اُس کا نام "المصباح" تجویز کیا۔ اور ہفتہ وار اخبار کی شکل میں جاری ہوا۔ یہ دراصل پہلا اخبار ہے کہ جو میں نے ایڈٹ کیا۔ یہ ٹھیک ۱۹۰۰ء کے اواخر کی بات ہے۔ پہلا نمبر، عید الفطر کے موقعہ پر نکلا تھا۔ میں نے لیڈنگ آرٹیکل "عید" کے عنوان سے لکھا، اور چند دنوں کے بعد یہ دیکھ کر نہایت خوش ہوا کہ کئی اردو اخباروں، مثل "پیسہ اخبار" نے اُسے اپنے کالموں میں نقل کیا اس وقت گویا یہ ہمارے لیے بڑی رفعت و منزلت کی بات تھی۔ اس میں ایک صفحہ علمی مضامین کے لیے بھی رکھا تھا۔ ایک صفحہ تاریخ اور سوانح عمری کے لیے تھا۔ امام غزالی، نیوٹن اور مسئلہ کشش ثقل وغیرہ اس طرح کے مضامین ان صفحات کے لیے لکھے تھے۔ پہلی مرتبہ واقعات و اخبار پر باسلوب جرائد بحث کرنے کا موقعہ پیش آیا اور بلا کسی دقت کے محسوس کیے میں نے ہر نمبر میں متعدد کالم اس قسم کے لکھے، لیکن یہ اخبار تین چار مہینے سے زیادہ نہ چل سکا اور بند ہو گیا۔

"مخزن"

اس زمانے میں شیخ عبدالقادر بی اے "مخزن" نکال چکے تھے، اور اُس نے اردو نظم و نثر کا ایک نیا شوق لوگوں میں پیدا کر دیا تھا۔ میں بھی مخزن منگواتا تھا اور یہ گویا اُس وقت کا اعلیٰ پائے کا اردو رسالہ تھا۔ چنانچہ کئی مضمون میں نے لکھ کر مخزن میں بھیجے اور اُن کی اشاعت سے بہت خوشی ہوئی۔ ایک مضمون، اخبار اور اس کے متعلقات اور اُس کے فوائد پر تھا، ایک مضمون، خاقانی شروانی کے حالات پر تھا، اور یہ اس ارادے کے سلسلے میں تھا، جو اُس وقت شعرائے ایران کے حالات میں آبِ حیات کی طرح ایک تذکرہ لکھنے کا ہوا تھا۔ غزلیں وغیرہ بھی اُس کے حصۂ نظم میں چھپتی رہتی تھیں۔ اب بھائی مرحوم کو بھی مضمون نویسی کا خوب شوق پیدا ہو گیا تھا اور وہ بھی مضمون نگاری کرنے لگے تھے، چنانچہ انھوں نے بھی مخزن میں مضامین بھیجے اور چھپے۔

ندوۃ العلماء کے سلسلے میں ایک قابل اور مستعد آدمی، مولوی احمد حسین مرحوم فتحپوری کلکتہ آئے تھے اور یہیں مقیم ہو گئے تھے۔ یہ تحفۂ احمدیہ کے مولانا محمد علی کی علیحدگی کے بعد عرصے تک ایڈیٹر رہے تھے، جو کانپور سے نکلتا تھا، اور بالآخر اُمہات المومنین احمد شاہ شائق مسیحی کے جواب کی اشاعت اور اسکے ڈیفیمیشن کیس کے دائر ہونے کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔

"احسن الاخبار"

کلکتے میں عبد الغفار ایک کتب فروش اور مصطفائی پریس کے مالک تھے،

انھوں نے انھیں آمادہ کیا کہ اُن کی شراکت میں ایک ہفتہ وار اخبار جاری کریں، چنانچہ "احسن الاخبار" کے نام سے اخبار جاری ہوا۔ مولوی احمد حسین مرحوم، عربی کے پورے مولوی اور انگریزی، انٹرینس تک پڑھے ہوئے تھے اور بہت روشن خیال تھے۔ اس اخبار کی اشاعت سے اُس وقت مجھے بہت فائدہ ہوا۔ ایک تو قریبی مصرفِ طبع آزمائی پیدا ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی مضامین نویسی کے لیے قوی تحریک و تشویق ہوئی۔ دوسرا اخبار کا ایک دفتر قائم ہو جانے کی وجہ سے مبادلے کے اخبارات و رسائلِ عالم کے دیکھنے کا بہت اچھا موقعہ ملا۔ انھوں نے نہایت وسیع مبادلہ کیا تھا۔ مصر، قسطنطنیہ، طرابلس، ٹیونس، الجزائر، امریکہ کے تمام عربی اخبارات و رسائل مبادلے میں منگواتے تھے۔

دنیائے اسلام سے دلچسپی

یہیں میں نے سب سے پہلے عربی اخبارات کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور عالم اسلامی کے مسائل سے پوری اور گہری دلچسپی ہو گئی، جو خاندانی علائق کی وجہ سے پہلے سے طبیعت میں منزوی تھی۔ یہ دلچسپی اس کے بعد برابر بڑھتی گئی اور اس قدر کثرت کے ساتھ میں وہاں کے حالات و مباحث کا مطالعہ کرتا رہا کہ شاید ہندستان میں اور کسی کو اتفاق ہوا ہو۔ اسی دفتر میں سب سے پہلے میں نے مصر کے علمی رسائل میں سے الہلال اور المقتطف دیکھا۔ نیز المنار مطالعے میں آیا۔ اس زمانے میں مرحوم عبد الرحمان کواکبی کی "سجل جمعیۃ ام القریٰ"، المنار میں چھپ رہی تھی، اور نیز مرحوم شیخ محمد عبدہ کا رد فرح انطون (ایڈیٹر) الجامعہ، جو بعد کو "الاسلام و

المنصور انیہ" کے نام سے بصورت کتاب شائع ہوا۔ المنار کیا باعتبار ادب و بلاغت کے اور کیا باعتبار مباحث کے میرے لیے بالکل ایک نئی چیز تھی۔ مذہبی مباحث میں تو زیادہ دل گرفتگی نہ ہوئی، اس لیے کہ دل و دماغ سرسید کے اسکول سے بحد غایت متاثر ہو چکے تھے، لیکن عربی کتابت و بلاغت کے ایسے صحیح و صادق نمونے کا اُس وقت طبیعت پر جو اثر پڑا وہ آگے چل کر عربی علم ادب کے ذوق میں نہایت کار آمد اور مفید ہوا، اور بلاشبہ اس بارے میں المنار کے مجھ پر حقوق ہیں۔

احسن الاخبار کا دفتر، مسجد کے سامنے تھا اور ہم اُس وقت اِمرتلا لین میں رہتے تھے، جو مسجد سے بالکل قریب واقع ہے، اس لیے ہر وقت کی آمد و رفت رہتی تھی، اور مولوی احمد حسین مرحوم زیادہ تر ہمارے ہی یہاں بیٹھا کرتے تھے۔ اس طرح احسن الاخبار کی وجہ سے مجھے ہر طرح کی مضامین نویسی کا موقع ملا۔ عربی اخبارات کے مضامین، خبروں وغیرہ کا انتخاب و ترجمہ، علمی و ادبی مضامین کی ہر نمبر کے لیے ترتیب، رسالوں اور کتابوں پر ریویو اور اکثر اوقات اخبار و حوادث پر بھی بحث و کتابت، یہ تمام اقسام قلم سے نکلے۔

مولوی احمد حسین مرحوم بہت خوبیوں کے آدمی تھے، مگر طبیعت میں کسی طرح کی کاوش و تقدم کا جذبہ نہ تھا۔ بس ایک ڈھنگ اخباری مضامین کے لکھنے کا آ گیا تھا اور سیدھے سادھے طریقے پر وہی لکھتے رہتے تھے۔ تخیل اور تنوع مطالب یا انشاء پردازی، یہ باتیں بالکل نہ تھیں۔ طبیعت میں کسل اور سستی بھی بہت تھی۔ مزاج بھی بلغمی تھا۔ گھنٹوں پڑے رہتے اور اخبار صرف ایک صفحہ یا کالم کے نہ ملنے کی وجہ سے وقت پر شائع نہ ہو سکتا۔ ان اسباب سے قدرتی طور پر میری خود اختیار کردہ

مساعدت اُن کے لیے بہت غنیمت ہوئی اور اُنھوں نے بھی اِس طرح مجھ پر چھوڑ دیا تھا کہ جو چاہتا تھا، لکھتا تھا اور براہ راست کاتبوں کو دیدیتا تھا اور چھپ کر شائع ہو جاتا تھا۔ بھائی مرحوم بھی اِس میں مضامین لکھا کرتے تھے۔

"تحفۂ احمدیہ"

اِس کے کچھ دنوں کے بعد اُنھیں خیال ہوا کہ تحفۂ احمدیہ بھی، جو احمد شاہ کے مقدمے کے بعد سے تحفۂ محمدیہ سے ملقب تھا کلکتے سے پھر نکالیں۔ تحفۂ محمدیہ کانپور میں ایک مذہبی رد و مباحثے کا پرچہ تھا، جو زیادہ تر مسیحی مشنریوں کے رد میں نکلتا تھا۔ مولانا محمد علی کو عیسائی مشنریوں سے مباحثہ کرنے اور اُن کے رد میں رسائل لکھنے سے بہت ذوق رہا ہے۔ اِنھی نے یہ رسالہ خاص اِس موضوع پر نکالا تھا، لیکن اب میں نے کہا کہ اِسے ایک عام علمی و مذہبی رسالے کی شکل میں نکالنا چاہیے، چنانچہ وہ اِس شرط پر راضی ہو گیے کہ اُس کی ترتیب میں اپنے ذمے لوں۔ چنانچہ تحفۂ محمدیہ نکلا۔ اور یہ ایک مستقل ذریعہ ذمہ دارانہ تحریر و ترتیب کا نکل آیا۔

احسن الاخبار میں ہر طرح کے مضامین لکھے۔ کئی مضمون ایسے بھی نکلے کہ انکی وجہ سے رد و بحث کا سلسلہ چھڑ گیا۔ اشہری مرحوم اور بعض اور کہنہ مشق اردو مضمون نگار، جو احسن الاخبار میں باقاعدہ لکھا کرتے تھے بحث و جدال میں شریک ہو گیے، اور ایک ایک بحث ہفتوں جاری رہی۔ اُس زمانے میں مجھے فارسی نظم و نثر کے مطالعے کا بہت ذوق تھا، متعدد مضامین شعرائے ایران کے حالات اور ان کے کلام پر ریویو کے لکھے تھے۔ از انجملہ خواجہ حافظ شیرازی اور

عمر خیام پر ایک پورا سلسلہ شائع ہوا۔ اس سلسلے میں یہ بحث چھڑ گئی کہ اِن شعرا کے کلام سے اُن کی زندگی اور کیرکٹر پر روشنی پڑتی ہے یا نہیں؟ اور اس کا امکان ہے یا نہیں کہ اُن کے جام و ساقی کی صدائیں محض شاعرانہ ہی نہ ہوں بلکہ واقعی ہوں؟ مجھے یاد نہیں، مگر کئی مضمون نگاروں نے اس میں حصہ لیا تھا۔ میرے مضمون میں غالباً کوئی ایسا اشارہ تھا، جس سے یہ پایا جاتا تھا کہ اس بارے میں خواہ نخواہ باصرار و تاکید توجیہیں کرنا، غیر ضروری ہے۔

"خدنگ نظر"

اسی زمانے میں لکھنؤ کے گلدستے "خدنگ نظر" نے جو منشی نوبت رائے نظر، نواڑ گنج سے نکالتے تھے، علاوہ غزلیات کے بتقلید مخزن مضامین کا ایک حصہ بھی شامل کیا گیا اور اُس وقت کے اچھے اچھے مضمون نگار، مثلاً سُرور، ڈاکٹر اقبال، منشی احمد علی مرحوم کاکوروی وغیرہ اس میں مضمون لکھنے لگے۔ اس میں بھی میں نے اور بھائی مرحوم نے خاص طور پر حصہ لیا اور بکثرت مضامین نظم و نثر اس میں شائع ہوتے رہے۔ سال بھر کے بعد جب خدنگ نظر میں نثر کا حصہ اور بڑھایا گیا، تو اس حصے کی ایڈیٹری بھی میرے متعلق کر دی گئی، اور اب زیادہ اہتمام اور پابندی سے اس کے لیے مضامین مرتب کرنے لگا۔ مولانا شبلی مرحوم نے اسی کے ایک مضمون کی بنا پر مجھے خط لکھا تھا، جو عکس ریز یعنی ضوء غیر مرئی کی تاریخ انکشاف اور حقیقت پر لکھا تھا۔

اس کے علاوہ ملک کے اور جتنے اچھے اخبارات و رسائل تھے، تقریباً سب

میں مضامین بھیجتے رہے اور شائع ہوتے رہے۔ اس زمانے میں ہردوئی سے "مرقعِ عالم" بھی نکلتا تھا۔ اس میں ناول کے ساتھ مضامین کا حصہ ہوتا تھا۔ اس میں بھی مضامین لکھے۔ حیدر آباد سے کئی رسائل نکلتے تھے، جن کا نام یاد نہیں، ان میں بھی کئی مضمون خواب کی حقیقت اور علمی مباحث و مواضیع پر لکھے تھے۔

"ہیئت جدیدہ" کا ترجمہ

اسی زمانے میں مسیو کینول فلاماریاں کے رسالے، سولر سسٹم کا ترجمہ اردو میں کیا۔ در اصل یہ ایک فارسی ترجمے کا ترجمہ تھا، جو عبد الرحیم تبریزی نے قسطنطنیہ میں "ہیئت جدیدہ" کے نام سے چھاپا تھا اور سب سے زیادہ سہل، عام فہم اور جامع رسالہ ہے جو اس باب میں عربی و فارسی میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر فانڈیک کی "اصول الہیئۃ" مطبوعہ بیروت بھی پیش نظر تھی، نیز "حدائق النجوم" سے بھی بعض مطالب کا اضافہ کیا، اور اس کے مختلف ٹکڑے "خدنگ نظر" میں بھیجتا رہا، لیکن بڑی دقت نقشوں اور ہاف ٹون تصویروں کے لیے پیش آئی۔ بلا ان کے کتاب کا فہم اور مشکل صورتِ اشکال کا معائنہ ممکن نہ تھا، اور لیتھو میں وہ چھپ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے ابھی نصف کے قریب ترجمہ ہوا تھا کہ طبیعت اچاٹ ہو گئی اور ناتمام رہ گیا۔

مسلکِ سیّد سے انحراف

یہ مضامین اگر جمع کیے جائیں تو کاتب کے افکار و عقائد کے تطوّر و انتقالات کا بھی ان سے درجہ بدرجہ پتہ چلے گا۔ ابتدائی زمانہ وہ تھا کہ قدیم خیالات و عقائد سے

دل برداشتہ ہو چکا تھا اور سرسید مرحوم کی تعلیمات نے ایک نئی دنیا میں پہنچا دیا تھا، لیکن زیادہ دنوں تک طبیعت اس پر قانع نہ رہ سکی، جیسا کہ ہمیشہ ان حالات میں پیش آیا ہے، سرسید کے مذہبی مسلک سے طبیعت اچاٹ ہو گئی اور جو دروازہ انھوں نے کھول دیا تھا، اسی نے بالآخر شک و اضطراب کی ایک نئی راہ میں پہنچا کر الحاد و انکار تک پہنچا دیا۔ ابتدا میں شکوک پھر مذہبی تاویلات کا استغراق اور ایک فلسفیانہ مذہب کا ادعا، پھر مزید اضطراب و جستجو اور اس سے الحاد و انکار کا ظہور، اور بالآخر ایک سخت اضطراب و یاس کا جماؤ۔ ان مختلف زمانوں کے مضامین میں ان مختلف حالات کے اثرات موجود ہیں، علی الخصوص ان مضامین میں جو مذہبی اور علمی ہیں۔

بدعاتِ محرّم

اسی زمانے میں مضامین نویسی کی وجہ سے ایک سخت پریشان کن واقعہ پیش آگیا تھا، اور اس کی وجہ سے مولوی احمد حسین مرحوم اور مالک اخبار و مطبع کو بھی بلاوجہ ایک سخت پریشانی میں مبتلا ہونا پڑا تھا۔ چونکہ اس پریشانی کا تنہا باعث میں تھا، اس لیے ان لوگوں کی آلودگی کے خیال سے مجھے بھی بہت رنج ہوا۔

ایک زمانے میں کلکتہ، ہندوستان کے ایرانی تاجروں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ انگریزوں کے تازہ ورود کی وجہ سے کلکتے میں بیرونی تجارت کی نئی نئی راہیں کھل گئی تھیں اور ان میں ایرانیوں نے بڑا حصہ لیا۔ اس وقت سے کلکتے میں محرّم کے مراسم بڑے اہتمام سے انجام دیے جانے لگے۔ ایرانی تجار نے محرّم کے پبلک مظاہروں کے بعض ایسے طریقے بھی اختیار کیے، جو میں سمجھتا ہوں کہ لکھنؤ میں بھی نہیں ہوتے، اور ایران کے مراسم کی

براہ راست نقل ہیں، مثلاً واقعۂ کربلا کے مشہور ابطال کی تمثیل اور حضرت امام کے تابوت کا جلوس، اور عین واقعۂ شہادت کی تمثیل۔ یہ یہاں علم کے نام سے مشہور ہے سالتویں، نویں اور دسویں کو شہر کا تمام شمالی حصہ اس کے نظارے میں مشغول ہو جاتا ہے، اور پولیس کے سالانہ مخصوص اہتمامات میں اِن علموں کا بھی اہتمام سمجھا جاتا ہے۔ انھیں علم اس لیے کہتے ہیں کہ جلوس نہایت قیمتی کشمیری صنعت کے علموں اور نقرئی کھمبوں کی دورویہ قطار کے اندر اٹھتا ہے۔ یہ قطار بہت طویل ہوتی ہے اور سیکڑوں علموں سے مرکب ہوتی ہے۔ ایک بجے سے لے کر پانچ بجے تک، جو اس کے دوران کا وقت ہے، شہر کے شمالی حصے کی تمام سڑکیں اور ٹریفک حکماً بند ہو جاتی ہے اور سڑک پر اور مکانوں پر نظارہ کرنے والوں کا اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ تعزیے کے جلوس میں بھی ایسا ہجوم نہیں ہوتا، حالانکہ کلکتے میں بمبئی کے بعد سب سے زیادہ اہتمام تعزیوں کا ہوتا ہے۔

اجنبی سیاحوں اور شہر کے یورپین تماشائیوں کی بہت بڑی جماعت آیا کرتی ہے۔ سب سے پہلے متعدد قسم کے باجوں، روشن چوکیوں، اور نقارچیوں کی ٹولیاں گذرتی ہیں۔ اس کے بعد واقعے کے مشہور اشخاص کی سواریاں آتی ہیں، مثلاً حضرت عباس کا گھوڑا آتا ہے، جس پر نہایت قیمتی ساز و سامان اور کشمیری شالوں کا جھول پڑا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ مرثیہ خوانوں کا حلقہ ہوتا ہے اور پیچھے ماتم کرنے والوں کی ٹولی، جو بڑے جوش و خروش سے برہنہ سینوں پر ماتم کرتی ہے کئی جلوس اس طرح گذرتے ہیں، اور آخر میں خود امام کا جلوس آتا ہے۔ یہ گھوڑا سب سے زیادہ با ساز و سامان ہوتا ہے، اور سب سے بڑی جماعت ماتم کرنے والوں کی اس کے ساتھ

ہوتی ہے۔ تمام لوگ سر دپا برہنہ اور سیاہ لباس پہنے ہوتے ہیں، اور اگرچہ، جیساکہ ایسی جماعات کا قاعدہ ہے، اب ماتم کی جگہ یہ ایک خاصا میلہ ہوگیا ہے، اور شہر کے تماش بینوں اور نظر بازوں کی دید اور باز دید کا سب سے بہتر موقعہ سمجھا جاتا ہے، تاہم جلوس کے شرکا اپنی آرائش و تزئین میں بھی ماتمی لباس کا پہلو ملحوظ رکھتے ہیں۔

یہ عَلم ساتویں اور نویں کو اٹھتے ہیں اور دسویں کی صبح کو تابوت نکلتا ہے، جس کے ساتھ سواری کے گھوڑے کی جگہ خون آلود گھوڑے ہوتے ہیں، اور اُن کے تمام بالائی جسم پر تیر چسپاں کر دیے جاتے ہیں۔

مرزا محمد مہدی اور حاجی کربلائی، ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں دو بڑے تاجر تھے، جنھوں نے امام باڑے تعمیر کیے اور اِن علموں کے تمام قیمتی ساز و سامان، کشمیری شالوں کے عَلم، پردے، اور نقرئی کھمبے لاکھوں رُپیہ صرف کر کے تیار کرائے اور آئندہ کے لیے اوقاف کر گیے۔ ماتم کرنے والوں پر چونکہ جلوس کی ساری رونق موقوف ہے، اس لیے اُن کے قیام و اجتماع پر خاص توجہ کی گئی۔ ایک رُپیہ بڑے آدمی کو اور آٹھ آنے لڑکوں کو ماتم کی اجرت ملتی ہے اور اسی سبب سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔

جلوس کا سب سے بڑا وقفہ، ماتم کا زور و شور، ٹولیوں کا جوش و خروش سب سے زیادہ کولوٹولے میں ہوتا ہے، جہاں دونوں جانب مکانوں کے وسیع برآمدوں میں شہر کی تمام وضع دار طوائفوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ وہ سیاہ ماتمی لباس پہن کر آتی ہیں، جو بڑے اہتمام سے تیار کرایا جاتا ہے، اور جلوس کے ارکان و اعضا بھی اس اہتمام کے مناسب جواب سے بے فکر نہیں ہوتے، یا جلوس کے مقامی مبدا میں غیر معمولی جوش و خروش ہوتا ہے، جہاں دو رویہ مکانوں کے برآمدوں اور کھڑکیوں پر نہایت باریک چلمنیں پڑی

ہوتی ہیں، اور اکثر چلمنوں کے گوشے کنارے سے ہٹے بھی ہوتے ہیں، اور جلوس کے سرگرم اور پرجوش اعضا اِس سے بےخبر نہیں ہوتے کہ چلمنوں کی اوٹ میں کیا ہے۔ انہیں ایک کوٹھے پر کرسیوں وغیرہ کا خاص اہتمام ہوتا ہے۔ کچھ ریفرشمنٹ کی میزیں بھی لگائی جاتی ہیں، اور یوروپین مرد و عورت وہاں مدعو کیے جاتے ہیں۔ یوروپین سیاح وہاں مناظر کا عکس بھی لیتے ہیں اور اُن کے خیال سے جلوس کے تمام حصے مناسب موقع پر رکتے اور ٹھہرتے ہیں۔

اُس زمانے میں، جس کا ذکر کر رہا ہوں، ایسا ہوا کہ انگلستان کا کوئی لارڈ جس کا نام یاد نہیں رہا، شوقیہ ہندوستان آیا ہوا تھا۔ مولوی امجد علی بی۔ اے مدرسہ عالیہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، اور اُس زمانے میں اُن سے اکثر ملاقاتیں شام کو ایڈن گارڈن میں رہا کرتی تھیں۔ انھوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ ایک لارڈ آیا ہوا ہے اور وہ محرّم کا علم مناسب موقع سے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا کوئی انتظام کر دو۔ ایک ایرانی، آغا کربلائی آیا کرتا تھا۔ میں نے اُس سے ذکر کیا اور اُس نے منتظمین سے اس کا ذکر کیا اور انھوں نے ایسے بڑے تماشہ بین کو مدعو کرنا اپنے لیے موجب فخر سمجھ کر نہایت خوشی سے کیننگ اسٹریٹ کے امام باڑے میں، جہاں سے عَلم اٹھتے ہیں، خاص انتظام نشست کا کر دیا۔ اس خاص صورتِ حال کے پیش نظر آنے کی وجہ سے میں بھی اُن کے ساتھ چلا گیا۔ اور مولوی امجد علی وہاں جب پہنچے، تو بہت سے لوگوں کو منتظر پایا۔ اِن میں ایک شخص اس غرض سے مقرر کر دیا گیا تھا کہ بطور گائیڈ اُس کے ساتھ موجود رہے۔

غیرتِ دینی

جب عَلم اٹھنے لگے، تو اُس نے اُن کی ماہیت و مقصد کے متعلق سوالات کرنا شروع کیے اور جوابات نوٹ کرتا رہا۔ "ڈیلی نیوز" کا ایک نامہ نگار بھی تھا۔ اُس نے عکس لینا شروع کیا۔ اُس کے سوالات کے جو جوابات یہ لوگ دیتے تھے، وہ تمام تر یہ تھے کہ یہ اسلام کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے اور اسلام کا مشہور و مذہبی حادثہ اس میں تمثیل کیا جاتا ہے، اور وہ بھی اِسے مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا ایک بہت بڑا منظر یقین کر رہا تھا۔ اِس اثنا میں جلوس کے مختلف اجزا یکے بعد دیگرے نکلنے لگے۔ لوگوں کا عجیب وحشیانہ طریقے پر ماتم کرنا، شور وغل کرنا، عجیب وضع و قطع کے گھوڑے کا سوانگ، اور ماتم کرنے والوں کی چیخیں اور اُن پر انگریز تماشہ بینوں کے طرح طرح کے ریمارک، جن کے ساتھ بسا اوقات قہقہے بھی ملے ہوتے تھے، میرے لیے بہت اذیت دہ ہوئے اور جب یہ چیز سامنے آئی کہ غیر مسلموں کی آنکھوں میں یہ اسلام اور مسلمانوں کا اور اُن کے مذہبی احکام و اعمال کا ایک بُرا ریپریزنٹیشن ہے، تو بڑی ہی قلبی تکلیف ہوئی حتیٰ کہ میں وہاں زیادہ دیر تک ٹھہر نہ سکا اور چلا آیا۔

جہادِ اصلاح کا پہلا معرکہ

اگرچہ اِس قسم کے رسوم و عوائد، مسلمانوں کی زندگی کا ایک عام عنصر بن گیے ہیں اور روز آنکھوں کے سامنے گذرتے ہیں اور عَلم و تعزیے کا تماشہ بھی نیا نہ تھا، لیکن اِس نظارے نے اور آنکھوں کے سامنے غیروں کی تضحیک و غلط فہمی نے بالکل ایک نیا

جذبۂ غیرت و جوش کا پیدا کر دیا۔ میں نے اُسی وقت ایک مضمون "اسلام اور محرم" کے عنوان سے لکھا، اور چونکہ عین جذبات کی برانگیختگی میں لکھا تھا، اس لیے اس میں شک نہیں کہ بحث و نظر کے ایک متحمل اور سامح اسلوب کی جگہ سختی اور شدتِ بیان پر مبنی تھا۔ مضمون کا مقصد تو یہ تھا کہ ان بدعات و رسوم کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ اسلام کو غیروں کی نظر میں بالکل غلط اور مسخ طور پر پیش کرتی ہیں، لیکن لوگوں کو مخاطب کر کے ایک شدید لب و لہجہ میں اس پر زجر و توبیخ بھی کی تھی، اور اس قسم کے الفاظ بھی جوش میں لکھ دیے تھے کہ یہ تمام رسوم، رومن کیتھولک عیسائیوں اور بت پرست قوموں سے لی گئی ہیں، اور ان کے کرنے والے اپنے تئیں اسلام کی خاص روح سے بالکل تہی کر دیتے ہیں!

اُس وقت طبیعت میں نیا نیا جوش تھا۔ اصلاح اور ردِّ رسوم و زوائد کا ایک نشہ سا چڑھا رہتا تھا، طبیعت کو ابھی اِن معاملات کا تجربہ کہاں ہوا تھا؟ جوش و ولولے میں قلم اٹھایا اور جو سامنے آیا، لکھ دیا، تاہم یہ ضرور ہے کہ کسی طرح کا بھی فرقہ وارانہ جذبہ اس وقت میں نے محسوس نہیں کیا تھا۔ شیعیت یا سُنیت کا کوئی احساس نہیں تھا۔ مجھ پر اس زمانے میں سر سید کے اسکول کا رنگ چڑھا ہوا تھا، اور اس میں نہ تو سُنیت کو کوئی دخل تھا نہ شیعیت کو۔ جس طرح شیعوں کی یہ تمام رسوم لغو نظر آتی تھیں، اُسی طرح سنیوں کے بھی بیسیوں خیالات بے معنی یقین کرتے تھے۔ سرے سے مسلمانوں کے موجودہ عقائد و اعمال ہی کی طرف سے طبیعت میں بے دلی تھی۔ علاوہ بریں بدعاتِ محرم اب صرف شیعوں کی فرقہ وارانہ چیز نہیں رہی ہے، بلکہ شیعوں سے زیادہ لاکھوں سُنی بھی انھیں ویسے ہی جوش و خروش و اعتقاد سے بجا لاتے ہیں خاصۃً علم و تعزیہ۔ مضمون میں بھی کوئی خطاب شیعوں

سے نہ تھا۔ بلکہ سرتاسر عام مسلمانوں سے۔ کوئی لفظ جو خاص شیعوں کے فریقانہ مخصوصات کی طرف اشارہ کرتا ہو، اس میں نہیں مل سکتا تھا۔

شیعوں میں جوش

لیکن جوں ہی یہ مضمون نکلا، کلکتے کے تمام شیعوں میں اور خاصۃً ایرانیوں میں جوشِ مخالفت کی ایک آگ سی لگ گئی۔ جس دن اخبار نکلا، اسی دن انجمن اصلاح کے دارُ الاخبار میں جلسہ تھا۔ اس زمانے میں آغا سنجر بھی کلکتہ آیا ہوا تھا۔ مرزا کاظم شیرازی جو مرحوم شمس العلماء شیخ محمود جیلانی کے خویش اور کلکتہ بورڈ آف اگزامینیشن کے فارسی مدرس ہیں، اور بہت غیر متعصب اور روشن خیال آدمی ہیں، سنجر کو لے کر جلسے میں آئے تھے۔ اور ابھی جلسہ شروع ہی ہوا تھا کہ اخبار کی کاپیاں آئیں اور میری جو شامت آئی، میں نے سنجر کو بھی ایک کاپی دی اور کہا کہ اس میں ایک خاص مضمون آپ کے مطالعے کا ہے میں اپنی فارسی بول چال کی مشق کے شوق میں سنجر سے بھی ملا کرتا تھا اور ہمیشہ وہ اپنی بے تعصبی اور اتحاد اسلامی کے احساس اور سر سید سے اخلاص و وِداد اور اُنکی بیحد مدمت سرائی اور قصیدہ خوانی اور بدعت و رسوم شیعہ سے بیزاری وغیرہ پر بڑی سرگرمی سے زور دیا کرتا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ اس مضمون سے اسے واقعی دلچسپی ہوگی، لیکن میرا قیاس بالکل غلط تھا۔ مضمون کے پڑھنے کے بعد مجھ سے تو اس نے اور مرزا کاظم نے صرف اس قدر کہا کہ یہ تو شرک و بت پرستی نہیں ہے (کیونکہ مضمون میں فرضی تابوت اور اس کی تقبیل و تعظیم کو اعمال شرک سے قرار دیا تھا) بلکہ ہم لوگ تو محض اس کی نسبت کی تعظیم کرتے ہیں، جیسے قرآن کی نسبت سے اس کی جلد کو بھی بوسہ دے دیتے ہیں، حالانکہ وہ کاغذ

چڑا ہے۔ بھائی مرحوم، اللہ اُنھیں غریقِ رحمت کرے، جو بڑے راسخ الاعتقاد اور اپنے خاندانی عقائد و اعمال میں بڑے مضبوط تھے؛ اُنھوں نے بھی اُن کی ہم زبانی کی اور اس کے بعد جلسہ متفرق ہو گیا۔

فتنہ کا طوفان

لیکن دوسرے دن سے ایک طوفان اُمنڈ آیا۔ سنجر مرحوم، جس کی معیشت محض دریوزہ گری اور مجلس سرائی تھی، اس کو اپنے ذاتی تمتّع کے لیے یہ فتنہ بہت موزوں مل گیا۔ محرّم ہی کے دن تھے۔ روزانہ مجلسیں عزا کی ہر جگہ ہوتی تھیں۔ قدرتی اجتماع لوگوں کا میسّر تھا۔ بات جوش انگیز اور مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرنے والی تھی، خاصۃً فرقانہ جذبات، جو اس بارے میں بہت زیادہ زود مشتعل ہیں، جلد بھڑک جا سکتے تھے۔ ان مواقع سے سنجر نے پورا کام لیا اور اِدھر اُدھر بہت سے فتنہ پرداز شامل ہو گئے۔ صورت یہ قرار دی گئی کہ یہ سنّیوں کی طرف سے شیعوں پر ایک مذہبی حملہ ہے۔ مذہب شیعہ کی توہین کی گئی، تمام شیعوں کی دل آزاری کی گئی۔ یہ مزید آیندہ حملوں کا پیش خیمہ ہے، اور اگر اسے برداشت کر لیا گیا، تو ہمیشہ کے لیے شیعوں کو ایسی ہی توہینوں کا مورد ہونا پڑے گا۔ مضمون میں اِن رسوم کے غیر مذہبی ہونے پر جو اصرار کیا گیا تھا، اُس کے طرح طرح کے فتنہ پردازانہ معانی قرار دیے گئے؛ حتّیٰ کہ اُسے نہ صرف شیعہ، شیعیت، بلکہ ائمہ طاہرین کی براہِ راست توہین بتلایا گیا!

دو چار دن کے اندر ہی یہ آگ اس زور سے بھڑکی کہ اب تمام شہر کی توجہ کھینچ لی اور ہفتہ بھر کے اندر ایک سخت تہلکہ مچ گیا۔ سنجر وغیرہ کی خوب بن آئی۔ جس قدر

مجلسیں عزاداری کی ہوتی تھیں، اُن کا بڑا موضوع یہی مضمون تھا۔ منبر پر سے روضہ خواں یہ مضمون لوگوں کو سناتے اور جذبات برانگیختہ کرتے۔ فوراً چندے کی فہرستیں کھل گئیں۔ امام باڑہ ہگلی میں دو مجلسیں بہت بڑی ہوتی ہیں۔ ہزاروں آدمی کلکتے سے بھی چلے جاتے ہیں۔ وہاں بھی اپیل کی گئی اور ایک خاص کمیٹی کارروائی کے لیے قائم ہوگئی،

"مُصلح" کی زمانہ سازی!

مقصود یہ تھا کہ توہین مذہب کا مقدمہ دائر کیا جائے اور مضمون نویس کے علاوہ اخبار اور پریس پر بھی دعویٰ کیا جائے۔ مجھے کس قدر حیرت ہوئی جب معلوم ہوا، کہ اس ایجی ٹیشن میں سید جلال الدین ایڈیٹر "حبل المتین" بھی پوری طرح شریک ہیں۔ میں اس وقت حبل المتین کو دیکھ چکا تھا۔ اِن سے مل بھی چکا تھا۔ ایران میں نئی تعلیم اور اصلاحِ خیالات کے لیے جو وہ مضامین لکھا کرتے تھے، اُن سے اُن کی روشن خیالی ٹپکتی تھی۔ خود مجھ سے کہا تھا کہ ملاؤں کے وجود سے بڑھ کر مسلمانوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ بارہا نفرت کے اِن خیالات و رسوم پر اور تو ہمانہ مذہبی خوش اعتقادیوں پر تمسخر اڑایا تھا۔ ایسی حالت میں کیونکر امید کی جاسکتی ہے کہ عوام و جہلا کے اس جوش و خروش میں وہ بھی شریک ہوجائیں گے، لیکن یہ بھی میری ناتجربہ کاری کی وجہ سے غلط شناسی تھی۔ فریقانہ تعصب کا جذبہ جس قدر قوی ہے، اور قول و عمل کا عملاً عدم تطابق جس طرح ایک حقیقت ہے، اُس سے میں ناآشنا تھا۔ انھوں نے نہ صرف اس میں حصہ لیا بلکہ نہایت جوش انگیز مضامین، حبل المتین میں لکھے اور اِن رسوم کی خلافی

پر بڑی بڑی موشگافیاں کیں۔ ایجی ٹیٹروں کی ایک بڑی مشورت گاہ، ان کا مکان تھا لطف کی بات یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ یہ سب کچھ کر رہے تھے، دوسری طرف برابر مولوی احمد حسن سے بھی ملتے تھے اور اپنے تئیں اُن کا مددگار ظاہر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میرا ذاتی خیال تو یہی ہے کہ یہ تمام فضولیات ہیں، لیکن عوام اور جماعت کے جوش و ہیجان کو کوئی روک نہیں سکتا، اور اس کا ہمیں لحاظ رکھنا چاہیئے! بظاہر اس سے اُن کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے فریق کو بھی اپنے قابو میں رکھیں اور وقت پر کوئی کام لے سکیں۔

قتل کا منصوبہ

لیکن معاملہ اسی پر ختم نہیں ہو گیا۔ عوام میں جب مذہب کے نام سے جوش پیدا کر دیا جائے، تو پھر اُن کے لیے کوئی لگام باقی نہیں رہتی اور نہ اُن کے لیے کوئی حد ہو سکتی ہے۔ جو لوگ زیادہ پرجوش تھے، وہ قانونی چارہ جوئی اور مقدمات عدالت کا نہ تو انتظار کر سکتے تھے اور نہ اس سے اُن کی تشفی ہو سکتی تھی۔ اُن کو تو بتلایا گیا تھا کہ ائمہ مظلومین کی ایک نئی توہین اور شہدا پر ایک نیا یزیدی حملہ کیا گیا ہے! اور اس کے بعد اُن کے ہوش و حواس کھو دینے کے لیے اور کسی بات کی ضرورت نہ تھی۔ کئی آدمی اس کے لیے آمادہ ہو گیے کہ میری زندگی کا خاتمہ کر دیں۔ چاقو اور چھُرے تیز کیے گیے اور میرے تعاقب میں ایک پوری جماعت لگ گئی!

بے چارے مولوی احمد حسن بھی بیٹھے بٹھائے اس مصیبت کا شکار ہو گیے واقعہ یہ ہے کہ انھیں اس مضمون کی خبر تک نہ تھی۔ میں نے لکھا اور کاتب کو دیدیا

وہ دیکھا بھی نہیں کرتے تھے، لیکن یہ بات کون مان سکتا تھا؟ صورت یہ ہوگئی تھی کہ وہ بھی شریک ہیں، حتیٰ کہ مسکین عبد الغفار بھی، جو ایک اَن پڑھ اور سیدھا سادہ آدمی تھا اور اِس مضمون کو سنکر خود بھی اپنے اعتقاد کو مجروح پاتا تھا۔ وہ ہر چند کہتا کہ میں نے تو اس سال بھی تابوت کی منت مانی اور سبیل کا شربت پیا، لیکن کوئی بھی باور نہ کرتا تھا۔!

اس زمانے میں دار الاخبار اور اخبار کا دفتر اُس عمارت میں تھا، جو مسجد کے تقریباً محاذ میں ہے اور جس کے نیچے حمیدیہ ہوٹل ہے۔ اس کے عقب کا حصہ بالکل نیا ہے اُس وقت چھپر کے مکانات تھے اور ایک تپلی گلی تھی، جو امرتلا لین میں جاکر نکلی تھی اور سڑک سے مسجد کے سامنے ہو کر جانے میں بڑا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ اس گلی کی وجہ سے آدمی اندر ہی اندر حمیدیہ ہوٹل کے عقب میں پہنچ جاتا اور مکان کے عقب کے زینے سے اوپر چلا جاتا۔ قرب کی وجہ سے میں ہمیشہ اسی گلی سے دار الاخبار میں آیا کرتا تھا شب کو اکثر بارہ بجے تک وہیں نشست رہتی اور اس کے بعد تنہا مکان چلا آتا۔ گلی دن کو بھی بالکل سنسان اور تاریک رہتی اور رات کو تو شام ہی سے خاموشی چھا جاتی۔ شیعی مجاہدین میں سے دو چار "غازی" اس پر متعین ہوئے کہ اس گلی میں کمین گاہ بنائیں اور کچھ آدمی ہمارے مکان کے گرد و نواح میں پھرنے لگے۔

بزدلی سے گریز

مولوی احمد حسن بڑے کچے دل کے آدمی تھے۔ اُن کے تو ہوش و حواس ہی رخصت ہو گیے۔ باہر نکلنا بند کر دیا اور مجھ سے منتیں کرنے لگے کہ یا تو کہیں باہر چلے

جاؤ اور یا گھر سے باہر نہ نکلو، لیکن اُس وقت ہمیں بھی ایک دوسرا نشہ چڑھا ہوا تھا، اُدھر مذہبی جہاد کا جوش تھا، تو اِدھر نیچریت، اصلاح، اور "ٹھیٹ" اسلام کے نقیب و داعی ہونے کی سرمستی تھی، اور سمجھتے تھے کہ یہ بڑی خوش نصیبی ہے۔ کہ ایسا معرکہ پیش آگیا ہے، گویا یہ بھی میدان اصلاح کی شہادت تھی۔ اُس وقت طبیعت میں یہ احساس تھا کہ خوف اور جُبن اور بے ہمتی سخت موجب شرم ہے، اور خواہ کچھ ہو، کوئی بات ایسی نہیں کرنی چاہیے، جس سے بے ہمتی پائی جائے۔ میں نے اپنے اوضاع و اطوار اور چلنے پھرنے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ میں مسجد جاتا، دارالاخبار جاتا، اور ان لوگوں کو بھی کمین گاہوں سے تکتے ہوئے دیکھتا۔ البتہ اتنا کرنا پڑا کہ رات کو اُس گلی سے آنا جانا بند کر دیا۔ سڑک ہی پر سے گذرتا۔

اب میرے لیے سب سے بڑی مشکل، خاندانی حالات کی بنا پر پیش آئی۔ والد مرحوم کو ہمارے اِن جھگڑوں کی بالکل خبر نہ تھی۔ اُنھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اخبار نویسی اور ایڈیٹری ہو رہی ہے، اور ایسے مضامین لکھے جاتے ہیں، جن سے شہر میں ایک تہلکہ مچ جاتا ہے، اور لوگوں کے امن میں خلل پڑتا ہے۔ محرّم کے رسوم اور تعزیہ پرستی کو اگرچہ وہ بھی جائز نہیں سمجھتے تھے، لیکن مضمون میں سرے سے اِس طرح کی تمام خوش اعتقادیوں اور تنظیم و اجلال کو، جنھیں وہ بھی نہ صرف جائز بلکہ مستحسن سمجھتے تھے، بدعت و شرک قرار دینا، صریح اور قطعی وہابیت تھا۔ پس یہ ظاہر تھا کہ اِس واقعے کی اطلاع سے جتنی باتیں اُن کے سامنے آتیں، وہ سب اُن کی ناراضگی اور سخت ناپسندیدگی

کا موجب ہوتیں۔ ہم لوگوں پر بچپن سے اُن کا رُعب و ادب اس قدر چھایا ہوا تھا کہ اُن کے غیظ و غضب کے تصور ہی سے دل کانپ جاتا تھا لیکن یہ حادثہ اس طرح کا تھا کہ کسی طرح اُن سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اول تو ضرور تھا کہ مخالفین خود آکر جلد یا بدیر اُن سے ذکر کرتے۔ پھر اگر ایسا نہ بھی ہوتا جب بھی شہر میں اتنا چرچا پھیل گیا تھا کہ کوئی نہ کوئی ضرور ان تک پہنچا دیتا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ بہت جلد عدالت میں دعویٰ ہونے والا تھا۔ اُس وقت بغیر اُن کی اطلاع کے میں کیا کر سکتا تھا؟

راہِ حق کی پریشانیاں

اس بات کی وجہ سے بڑی مصیبت پیش آئی۔ دو چار دن تک تو میں اتنا پریشان رہا کہ کھانا پینا تک چھوٹ گیا۔ بھائی مرحوم واقف تھے۔ مضمون نگاری، اخبار نویسی، اور انجمن اور دار الاخبار میں شریک، مگر اس معاملے میں پاک اور میرے نئے خیالات کے مخالف۔ اُن کی زجر و توبیخ بھی برابر جاری رہتی تھی۔ اُن کو بڑا غم یہ تھا کہ اس قصے کی وجہ سے ہمارے مشترک مشاغل بھی کھل جائیں گے۔

اسی اثنا میں ایسا ہوا کہ گھر میں بہنوں کو بھی اس کی خبر ہو گئی۔ والد مرحوم کا تشدد اُن کے لیے بھی نہایت سخت تھا۔ گھر میں بجز چند گنے ہوئے شہر کے خاندانوں کے اور کسی گھر کی عورتوں کا آنا جانا جائز نہیں رکھا گیا تھا، مگر بد قسمتی سے ان میں ایک خاندان ایسا

تھا، جس کی ایرانی خاندانوں سے رشتہ داری تھی۔ وہاں کی بعض عورتیں آئیں۔ اور انھوں نے بڑی سختی کے ساتھ بطور فریاد کے اس واقعے کا ذکر کیا۔ اب بہنوں کی ملامتیں بھی شروع ہو گئیں، اور گھر میں بھی کوئی میرا ہمدرد نہیں رہا!

مولوی احمد حسن مرحوم اگرچہ ویسے کمزور دل کے آدمی تھے، لیکن بعد کو انھوں نے واقعی مضبوطی دکھلائی۔ معاملہ پولیس کمشنر تک پہنچایا گیا اور بنیاد یہ قرار دی گئی کہ اس اخبار کی وجہ سے امن عامہ میں خلل پڑتا ہے۔ پہلے ابو الحسن خاں کے ذریعہ سے جو اسمال کاز کورٹ کے جج تھے، اور پھر براہ راست خود بلا کر پولیس کمشنر نے اُن سے تحقیق حال کیا، مگر انھوں نے مضمون کی پوری ذمہ داری اپنے اوپر لے لی اور نہایت مضبوطی سے تمام سوالوں کا جواب دیا۔

اس اثنا میں ایک اور لطیفہ ہوا۔ لوگوں میں مضمون اور اخبار کی بنا پر اتنا شور و غل تو مچ گیا، لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ مضمون نگار، درحقیقت کون آدمی ہے۔ بس یہ زبانوں پر تھا کہ احسن الاخبار میں ایسا مضمون نکلا۔

والد مرحوم سے شہر بھر واقف تھا، لیکن یہ بات کم لوگوں کو معلوم تھی کہ انھی کے خاندان کا ایک شخص، مضمون نگاری بھی کرتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کو یہ بات معلوم تھی مگر انھوں نے اس پر

چنداں زور نہیں دیا تھا۔ جب معاملہ زیادہ سنگین ہوگیا تو یکایک بعض لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ سب سے پہلے والد مرحوم سے تو اس بارے میں گفتگو کرنی چاہیے اب تک کسی کو اس کا خیال ہی نہیں ہوا تھا۔ والد مرحوم کا اس بارے میں جو مسلک تھا، وہ فریق مخالف کو بھی معلوم تھا۔ لوگوں کو اس پر تعجب بھی ہوا کہ اُن کے خاندان کا ایک شخص کیونکر ایسے خیالات ظاہر کر سکتا ہے، حتیٰ کہ بہت سے لوگوں کو اس میں شبہ ہونے لگا کہ یہ مضمون میرا ہے یا نہیں، نواب امیر خاں، پولیس کورٹ کے مجسٹریٹ اور شیعہ تھے۔ انھیں جب مضمون نگار کے خاندانی حالات بتلائے گیے تو انھوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اب لوگ آمادہ ہو گیے کہ ایک وفد کی صورت میں آئیں اور اس بارے میں والد مرحوم کو اطلاع دیں لطف کی بات یہ ہے کہ بعض لوگوں نے، جو ہمارے یہاں زیادہ آیا کرتے تھے، والد مرحوم سے یہ تذکرہ بھی کر دیا تھا۔ کہ ایک اخبار کے مضمون کی وجہ سے شیعہ جماعت میں بہت شورش پھیل گئی ہے، مگر یہ انھیں نہیں معلوم تھا کہ یہ آگ میری ہی لگائی ہوئی ہے۔

والد کا غیظ و غضب

نواب امیر حسن خاں کا لڑکا جب تعین وقت کے لیے آیا، تو میں سمجھ گیا کہ یہی معاملہ ہے۔ اب اخفا بالکل بے سود تھا۔ مجھے تو جرأت نہیں ہوئی، لیکن بڑی ہمشیر نے بعنوان مناسب پورا حال کہہ سنایا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہم سب کو اطلاع کے بعد جس غیظ و غضب کا پورا یقین تھا اُس کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ ناراض

ضرور ہوئے۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ اب لوگ اشتعال و تخویف کے ذریعہ دھمکانا چاہتے ہیں، اُن پر بھی یہی اثر پڑا کہ اب معاملہ کسی نہ کسی طرح سلجھانا ہی چاہیے۔ مجھے ایک حد تک اطمینان ہوا، لیکن یہ میرا خیال ہی خیال تھا۔ بات یہ تھی کہ اِس وقت تک اصل مضمون اُنھوں نے نہیں سُنا تھا۔ صرف اتنا کہا گیا تھا کہ شیعوں کے مراسم کے خلاف تشریح ظاہر کیا ہے۔ اب اُنھوں نے اصلی مضمون طلب کیا۔ اُس وقت اُن کی بینائی میں فتور آ چکا تھا، اِس لیے بھائی مرحوم نے پڑھ کر سنایا اور اِتنی مہربانی کی کہ اُس کے زیادہ سخت حصے نہیں سنائے۔ اپنی طرف سے عبارت جوڑتے گیے۔ اِس پر بھی غیظ و غضب کا ایک طوفان اُمنڈ آیا۔ نہایت ہی ناراض ہوئے۔ نہ صرف اِس حرکت پر اور اخبار نویسی پر، جسے وہ اپنے خیال میں ایک نہایت موجبِ عار کام سمجھتے تھے، بلکہ اُن خیالات پر بھی، جو کچھ نہ کچھ اُن کو سُنانے ہی پڑے تھے۔ بہرحال دو دن کے بعد وفد آیا اور اُنھوں نے مظلومانہ فریاد کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا، ہمیں اِس میں بھی شک ہے کہ یہ مضمون اُن کا لکھا ہوا ہے یا کسی نے شرارت کی ہے۔ خیر والد مرحوم نے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے اِس کی اطلاع مل چکی ہے۔ مضمون لڑکے ہی نے لکھا ہے، لیکن یہ اُس کی نادانی و نالائقی ہے، اور مجھے اِس کا نہایت افسوس ہے۔ اگرچہ فتنہ پردازوں کی کارروائیاں بدستور باقی تھیں، مگر والد مرحوم کی ملاقات کے بعد شہر کے بااثر لوگوں کو کسی کارروائی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ اُنھوں نے مزید کارروائی سے اب انکار کر دیا، اور مقدمے کی جو ابتدائی کارروائیاں ہو چکی تھیں، وہ بھی واپس لے لی گئیں۔ اِدھر محرم بھی ختم ہو چکا تھا۔ جوش میں بھی کمی پڑ گئی تھی۔ وقت و موسم کا جو مقتضیٰ تھا، وہ بھی اب باقی نہ رہا تھا۔ اہلِ غرض اپنی جیبیں بھی بھر چکے تھے۔ اِن تمام حالات کی وجہ سے عوام کے جوش میں بھی آہستہ آہستہ تنزل ہوتا گیا۔ اور سر گرمی

بہت کم رہ گئی، تاہم جو اشرار سازشی حملوں اور بدمعاشانہ اقدام کی فکر میں تھے، اُن کی کارروائیاں عرصے تک جاری رہیں۔

مولوی احمد حسن مرحوم ذاتی بہت مشکل میں پڑ گئے تھے۔ اُن کو مکان و قیام کی اچھی حفاظت بھی حاصل نہ تھی۔ مجبور ہو کر اُنھیں قانونی چارہ جوئی کرنی پڑی، اور گیارہ آدمیوں سے اپنی حفاظت کے لیے مچلکہ لینے کی درخواست دینی پڑی، چنانچہ کئی پیشیوں کے بعد ایک سے پانچ سو روپیہ کی اور پانچ آدمیوں سے ایک ایک ہزار روپیہ کی اعتباری ضمانتوں کے مچلکے لیے گئے۔ اس کے بعد جا کر کہیں اِس فتنے کا بمشکل خاتمہ ہوا۔ کئی ہزار روپیہ جو جمع ہوا تھا، اُس کا بڑا حصہ تو خرد برد ہو گیا۔ کچھ روپیہ، جو باقی رہا تھا، وہ امام باڑے ہنگلی کی نذر ہوا۔ آغا سنجر کئی ہزار روپیہ وصول کر کے چل دیا!

بیش قیمت تجربے

اِس واقعے سے مجھ کو بیش قیمت تجربے حاصل ہوئے، جو شاید دوسری صورتوں میں اِس قدر جلد مشاہدے و علم میں نہ آ سکتے۔ جو رسوم و زوائد، عوام کے مذہبی عقائد میں داخل ہو گئے ہیں، اُن کی اصلاح کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہم عوام کے جذبات کو مشتعل کریں۔ اِس سے اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اور نئی اجتماعی مضرتیں پیدا ہو جاتی ہیں، بلکہ چاہیے کہ نہایت صبر و تحمل سے کام لیا جائے۔ اُن کے جذبات کو بلا ضرورت ٹھیس نہ لگے، نہ اشتعال انگیز صورت نہ ہو۔ فریقانہ نزاع کی شکل حتی الامکان پیدا نہ کی جائے۔ بیان میں سختی و گرمی نہیں ہونی چاہیے۔ بہتر یہ ہے کہ تعیُّن و تسمیہ کے ساتھ رد و طعن بالکل نہ کی جائے۔ عملاً ایسی فضا پیدا کرنی چاہیے اور ایسے وسائل اختیار کرنے چاہییں کہ خود بخود اِن اعمال کی شگفتگی و رونق و

محبوبیت ماند پڑ جائے، اور ان میں کشش و دل ربائی باقی نہ رہے۔ شاہ صاحب نے تفہیمات کی ایک تفہیم میں اپنی عادت کے مطابق اس کے مبادیات و اصول بتلانے چاہے ہیں اور بہت قیمتی فوائد لکھے ہیں۔

اس واقعہ سے مالک اخبار بر داشتہ خاطر ہو گیا۔ اس مسکین کے لیے یہ تجربہ بہت ہی سخت تھا۔ تجارتی نفع کی غرض سے اُس نے اخبار نکالا تھا اور نتیجہ یہ پیش آیا کہ خود اُس کی جان کے لالے پڑ گیے۔ اس واقعہ کی وجہ سے مولوی احمد حسن مرحوم اور اُس کے تعلقات میں گرہیں پڑ گیں اور بالآخر دو تین مہینے کے بعد اخبار بند ہو گیا۔

مولوی احمد حسن کے لیے بھی بڑی پریشانی ہوئی تھی، لیکن ہم نے کوشش کی کہ ان کے لیے اور مشغلے پیدا ہو جائیں۔ مولوی محمد یوسف جعفری چیف مولوی بورڈ آف اگزامنر کلکتہ نے کوشش کر کے اُن کے لیے انگریز شاگرد مہیا کر دیے اور معقول معاوضہ ملنے لگا، مگر افسوس ہے کہ ان کی زندگی کی مہلت ہی کم رہ گئی تھی۔ ایک انگریز کے ساتھ دارجیلنگ گیے۔ وہاں سے آکر بیمار پڑ گیے اور انتقال کر گیے۔ وہ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ پورے مولوی تھے، لیکن مولویانہ زندگی کبھی اختیار نہ کی۔ محنت سے روٹی پیدا کرنی چاہتے تھے، اور کسی کا احسان لینا اُنھیں گوارا نہ تھا۔ انگریزی بھی پڑھی تھی، لیکن اُنھیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ انگریزی داں ہیں۔ قومی خدمت کا پورا جوش تھا۔ سیاسی مسائل کو خوب سمجھتے تھے اور اونچے اونچے خیالات دماغ میں رکھتے تھے۔ عربی کی قابلیت بہت اچھی تھی، برخلاف عام حالت کے عربی کے بولنے اور لکھنے میں بھی مشاق تھے۔ مجھے اُن کے انتقال کا بہت افسوس ہوا اور ہمیشہ رہے گا۔

انجمن "الاصلاح"

اسی زمانے میں شوق ہوا کہ ایک انجمن بھی قائم کرنی چاہیے۔ میں کسی دوسرے وقت بتلاؤں گا کہ مجھے تقریر کرنے کا کیونکر شوق ہوا، اور کیونکر اُس کے محرکات بہم ہوئے؟ احسن الاخبار نکلنے سے پہلے کی بات ہے کہ میں نے عام مجالس میں تقریر کرنا شروع کر دیا تھا، اور طبیعت کے شوق و ذوق کے لیے ایک نیا میدان سامنے کھلا تھا۔ ان چیزوں کا شوق اِس قدر طبیعت پر غالب تھا کہ یہ تمام اشغال گویا اپنی پیش نظر زندگی کے ضروری عناصر تھے، اور کوشش تھی کہ کوئی عنصر باقی نہ رہ جائے۔ مضمون بھی لکھنا چاہیے۔ اخبار بھی ہونا چاہیے۔ ایڈیٹری بھی کرنی چاہیے۔ ماہوار علمی رسالہ بھی ہونا چاہیے۔ تقریر بھی کرنی چاہیے، اور معاملۂ تقریر کی تکمیل یہ ہے کہ انجمن بھی ہونی چاہیے۔ دوسری انجمن نہیں خاص اپنی انجمن۔ یہ اُس زمانے کی گویا سرمستیاں تھیں اور اسی دنیا میں محو تھے!

دارالاخبار

چنانچہ خیال ہوا کہ ایک انجمن قائم کرنا چاہیے، اور اُس کی دلچسپی برابر قائم رکھنے کے لیے ایک ریڈنگ روم بھی دارالاخبار کے نام سے قائم کرنا چاہیے۔ دارالاخبار کی ترکیب، ریڈنگ روم کے لیے ایک نئی مخترعہ ترکیب تھی، لیکن بعد کو میں نے عراق میں دیکھا کہ ترک اور ایرانیوں نے اچھا لفظ اختیار کیا ہے: قرأت خانہ اور مصری، دارالمطالعہ کہتے ہیں۔ خیر ہم نے دارالاخبار نام رکھا۔ اس میں بڑی سہولت یہ تھی کہ احسن الاخبار کے مبادلے میں دنیا جہان کے اخبار مفت آیا کرتے تھے۔ مقامی انگریزی اخبار خریدے ہی

جاتے تھے۔ کتابیں ہمارے پاس موجود ہی تھیں۔ صرف ایک کمرے کے انتظام کر دینے سے
بآسانی قرأت خانہ قائم ہو جاتا تھا۔

چنانچہ میں نے مولوی احمد حسن مرحوم کو آمادہ کیا۔ وہ مخارج کے خیال سے گھبراتے
تھے، لیکن ہم کو تو اُس وقت لیڈروں کے سے دماغ کا دعویٰ تھا۔ اِن رکاوٹوں سے
کیوں رُکنے والے تھے۔ بہر حال حمیدیہ ہوٹل کے اوپر نیا نیا سلسلہ کمروں کا تیار ہوا
تھا اور بہت باموقعہ اور پُر فضا جگہ تھی۔ ایک بڑا ہال اور ایک کمرے کا انتظام کیا گیا
اور ابتدائی جلسے کا اعلان ہوا۔ مکان اِس علاقے کے مشہور تاجر، حاجی موسیٰ سیٹھ
کا تھا اور اُن کے لڑکے، حاجی اسماعیل سے متعلق تھا۔ وہ ہمارے یہاں آیا کرتے
تھے۔ اُن سے کہا گیا، تو اُنھوں نے تین مہینے کا کرایہ معاف کر دیا، اور آیندہ کے لیے
نصف کرایہ منظور کر لیا۔ مجموعی کرایہ اِس کا پچاس روپیہ تھا۔ پہلا جلسہ بہت اچھا ہو گیا
اور ہر قسم کے لوگ خاصی تعداد میں جمع ہو گیے۔ مولوی امجد علی، جو بانکی پور کے مشہور
انگریزی کے اساتذہ میں سے ہیں، اور اُس وقت کلکتہ مدرسہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے،
اُن کو صدر قرار دیا گیا، اور مولوی احمد حسن سکریٹری قرار پائے۔ انجمن کا نام "الاصلاح" تھا،
اور اِس کے مقاصد یہ تھے کہ شہر میں علمی مذاق کو ترقی دینا، عام اتحاد و ائتلاف پیدا
کرنا، تقریر و تحریر کے ذوق کو ترقی دینا، اور اِس کی مشق و ترقی کے لیے عمدہ وسائل
مہیا کرنا، اصلاح رسوم وغیرہ وغیرہ۔

اِنھی مقاصد کے سلسلے میں ایک قرأت خانہ اور کتب خانہ بھی قرار دیا گیا، اور وہیں
اُس کا بھی افتتاح عمل میں آیا۔ پہلے ہی جلسے میں جب دارالاخبار کے فرنیچر وغیرہ کے لیے
اپیل کی گئی، تو سو روپیے جمع ہو گیے، اور اِس کے بعد ہم نے اپنے یہاں آنے جانے والوں

میں چند آدمیوں سے، جو مناسب ہو سکتے تھے، ذکر کیا، تو دو تین سو روپیے اور ہو گیے تین درجن کرسیاں لے لی گئیں۔ چائے وغیرہ کا انتظام کرا گیا۔ ایک بڑے ٹیبل پر اردو اخبارات و رسائل اور دوسرے ٹیبل پر انگریزی اور عربی رکھے گیے۔ ہم نے اردو کتابوں کا ایک عمدہ ذخیرہ، جو عام مطالعے کے لیے کار آمد ہو سکتا تھا، وہاں رکھوا دیا اور واقعی ایک مفید اور دلچسپ جگہ پیدا ہو گئی۔

"الاصلاح" کے ہفتے وار جلسے ہوتے تھے، اور موضوع، مقررین کو دے دیے جاتے تھے، اور بعض لوگ تحریریں اور بعض لوگ زبانی تقریریں کرتے تھے۔ بعض موضوعوں کے متعلق مباحثے کا بھی وقت رکھا جاتا تھا۔ اُس وقت کالجوں کے بعض ذہین انڈر گریجوٹ بھی آنے لگے اور تحریر و تقریر میں حصہ لینے لگے۔ باہر سے کوئی مشہور آدمی آجاتا، تو وہ بھی وہیں لکچر دیتا۔ بھائی مرحوم بھی برابر اِس میں تقریریں کرتے تھے۔ کلکتے میں فی الحقیقت ایسی صحبت بالکل ناپید تھی، کوئی ایسی جگہ نہ تھی، جہاں علمی ذوق رکھنے والے اکٹھے ہوں اور علم و فن کا چرچا ہو سکے۔ اخبار بینی کا بھی کوئی ذریعہ نہ تھا، اِس لیے اِس کلب کے قائم ہو جانے سے واقعی ایک بہت بڑی ضرورت پوری ہو گئی۔ یہ تو اُس وقت بچپنے کا ایک کھیل تھا، لیکن آج بھی کلکتے میں اِس کی ضرورت ویسی ہی ہے۔ جیسی کہ فی الحقیقت اُس وقت تھی۔

"لسانُ الصّدق"

یہی دار الاخبار ایک دوسرے مشغلے کا باعث ہوا، یعنی "لسان الصدق" کی اشاعت کا۔ جب احسن الاخبار بند ہو گیا۔ تو مبادلے کے جو اخبارات آتے تھے،

وہ بھی آہستہ آہستہ بند ہونے لگے۔ دارالاخبار کے وجود کی بنیاد اِنھی پر تھی۔ اب بڑی مشکل پیش آئی۔ لوگ وسیع مطالعے کے عادی ہو چکے تھے۔ اخبارات کی کمی کا نتیجہ یہ تھا کہ دارالاخبار بند ہو جائے۔ بقیمت اگر اِس قدر اخبارات منگوائے جاتے، تو اس کے لیے ایک بہت بڑے فنڈ کی ضرورت تھی، اور اُس کا مہیا کرنا دشوار تھا۔ اخبارات سے خط و کتابت کی گئی کہ ایک عام نفع کا کام جاری ہے۔ وہ اخبار بند نہ کریں، لیکن ہندستانی پریس کا اِس بارے میں جو حال ہے، اُسے دیکھتے ہوئے یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ کیا جواب ملا ہوگا۔

اِس زمانے میں مولوی محمد یوسف جعفری، جو اب شمس العلما، خان بہادر ہو کر ریٹائر ہوئے ہیں، ملاقات بہت بڑھ گئی تھی، اور روزانہ دارالاخبار میں ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ ابتدا سے وہ احسن الاخبار، انجمن، اور دارالاخبار کی تجویز اور انتظام کے ایک شریک اور معاون رہے تھے۔ اُن سے میں نے کہا کہ اخبارات کے حصول کی یہی ایک راہ نظر آتی ہے کہ ایک چھوٹا سا ماہوار یا پندرہ روزہ رسالہ نکال دیا جائے اور اِس کے مبادلے میں اخبارات حاصل کیے جائیں۔ جو خرچ اِس کی چھپائی میں ہوگا، وہ اول تو خریداروں سے کچھ نہ کچھ حاصل ہی ہو جائے گا، اور بالفرض نہ ہو، جب بھی سیکڑوں اخبارات کی قیمت کے مقابلے میں یہ خرچ بہت ہی ہلکا ہوگا۔ انھوں نے یہ رائے پسند کی اور اِس کا انتظام اپنے ذمے رکھنے پر راضی ہو گئے۔ ہادی پریس سے انتظام کیا گیا۔ اور تجویز ہوئی کہ بالفعل فلس کیپ تقطیع پر ایک جزو کا رسالہ نکالا جائے اور مہینے میں دو بار نکلے۔ میں نے اِس کا نام "لسان الصدق" تجویز کیا اور بلا کسی اعلان کے پہلا نمبر چھاپ کر شائع کر دیا۔

جب یہ رسالہ ریویو کے لیے معاصرین کے پاس پہنچا، تو بہت ہی تعریفی ریویو کیے گیے، علی الخصوص مخزن وغیرہ سربرآوردہ رسائل نے۔ اُن کے خیال میں لسان الصدق ایک بڑے معمر اور کہنہ مشق اہل قلم کی ایڈیٹری میں جاری ہوا ہے، جو عرصے سے اخبارات و رسائل میں مضمون نویسی کر رہا ہے، حالانکہ جب یہ پرچہ نکلا ہے، تو میری عمر بمشکل پندرہ سولہ برس کی تھی!

انجمن ترقی اردو

اسی زمانے میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی شاخ، انجمن ترقی اردو قائم ہو چکی تھی اور مرحوم مولانا شبلی اِس کے ناظم تھے۔ انجمن ہی کے سلسلے میں میں نے خط و کتابت کی تھی، اور انھوں نے خط و کتابت کے بعد مجھے بڑا شائق اور کارکن سمجھ کر انجمن کے ارکان انتظامیہ میں چن لیا تھا۔ دوسری شاخ، خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے اصلاح رسوم کی قائم کی تھی اور "عصر جدید" نکالا تھا۔ اِس میں بھی مضامین لکھا کرتے تھے۔ لسان الصدق کے خاص مقاصد میں یہ دو مقصد بھی داخل کیے گیے، یعنی ترقی اُردو اور اصلاحِ رسوم۔ اِس کے علاوہ عام طور پر علمی و ادبی مضامین کا وہ مجموعہ تھا۔ انجمن ترقی اردو نے اُس کی دلچسپی دیکھ کر اُسے اپنا آرگن قرار دیدیا تھا اور مولانا مرحوم، انجمن کے متعلق جس قدر مفید و دلچسپ باتیں ہوتی تھیں، اُنھیں سب سے پہلے اسی میں اندراج کے لیے بھیج دیتے تھے، اور تمام ممبرانِ انجمن کے نام ایک اطلاع شایع کر دی تھی کہ اِس پرچے کو ضرور منگوائیں۔ اِس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد متعلقین انجمن کی اِس کی خریدار ہو گئی تھی۔ دو

تین نمبروں کے بعد ہی چھ سات سو خریدار ہو گیے تھے۔ پہلے تو خیال تھا کہ محض دارالاخبار کے قیام کا یہ ایک ذریعہ ہے، رسالہ مقصود بالذات نہ تھا، اس لیے اُس کی زیادہ اہمیت نظر میں نہ تھی۔ لیکن جب ایسے لوگوں میں مقبولیت حاصل ہوئی، اخبارات نے لمبے چوڑے ریویو لکھے، اُس کے ہر نمبر کے مضامین ”وکیل“ وغیرہ میں نقل کیے گیے، تو خیال ہوا کہ اب اُسے ایک اچھا رسالہ بنانا چاہیے۔ چھ مہینے کے بعد ماہوار کر دیا اور کتاب کی شکل میں کم از کم تین جزو کی ضخامت تک پہنچ گیا۔ باہر سے بھی لوگ مضامین بھیجنے لگے تھے اور اُس وقت کے رسائل کے مضمون نگار اِس میں بھی مضامین بھیجتے تھے۔

تاہم یہ بھی دراصل بچپنے کا ہی ایک کھیل تھا۔ اِس سے زیادہ اس کی کوئی وقعت اب نظر میں نہیں ہے۔ سال بھر کے بعد بمبئی جانے کا اتفاق ہوا، تو وہاں سے بھی پرچہ جاری رہا۔ چھپائی کا انتظام مولوی محمد یوسف جعفری نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ اِسی زمانے میں ایک حادثے کی وجہ سے آگرے ٹھہر گیا، تو منشی قادر علی خاں مفید عام پریس سے گفتگو ہوئی اور اِس کے بعد چند نمبر وہیں سے چھپ کر نکلے۔ ایک دو نمبر بمبئی میں بھی چھپے۔ اِس کے بعد عراق کا سفر پیش آیا اور پرچہ بند ہو گیا۔

معترضین سیّد سے مقابلہ

”لسان الصدق“ کا زمانہ، سر سیّد مرحوم کی تقلید و اتباع کی سرمستی کا زمانہ تھا۔ طبیعت میں اُن کی عقیدت، پرستش کی حد تک پہنچ گئی تھی۔

کوئی آواز، جس میں ایک شائبۂ اختلاف یا تنقیص ہو طبیعت کو گوارا نہ تھی۔ سرسید مرحوم کے ساتھ اُن کا حلقہ، یا اُس وقت میری اصطلاح کے بموجب، "نورتن" بھی اُسی درجہ محترم تھا، جس قدر سرسید۔

اِسی زمانے میں "حیات جاوید" پر شیخ عبدالقادر نے مخزن میں نقد لکھنا شروع کیا تھا، اور عبارت و مطالب، دونوں پر چند اعتراضات کیے۔ اعتراضات بہت ہلکے اور دھیمے لہجے میں تھے، اور اُس کے مقابلہ میں فی الحقیقت گویا کچھ نہ تھے، جتنے ہونا چاہیے تھے۔ ایک اور ریویو، جس میں بھی تھوڑی سی نکتہ چینی مذہبی عقائد کے متعلق کی گئی تھی، مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی کا تھا جو پہلے شاید "علی گڑھ گزٹ" میں نکلا تھا، اور پھر ایک رسالے کی شکل میں چھپ گیا تھا۔ اِس میں ویسے تو کتاب کی بہت تعریف کی تھی، لیکن یہ لکھا تھا کہ سرسید کے مذہبی کاموں کی نسبت بے لاگ رائے نہیں دی گئی ہے۔

اُس وقت مجھ پر یہ دونوں ریویو بہت شاق گزرے، اور ایسا محسوس ہوا کہ گویا ایک بہت بڑی جناب میں گستاخی کی گئی! میں نے "لسان الصدق" میں "حیات جاوید" کے ریویو کا ایک سلسلہ شروع کیا، اور اِس میں پہلے ان نکتہ چینیوں کا رد بڑے جوش و خروش سے کیا تھا۔ بعض اخبارات نے اِس کی تائید کی، بعض نے مخالفت اور اِس طرح ایک نئی بحث چھڑ گئی۔ اِس زمانے میں شاید "مشرق" نہیں نکلا تھا، لیکن گورکھپور سے ریاض مرحوم "ریاض الاخبار" نکالتے تھے اور ایڈیٹر حکیم برہم ہی تھے۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں، لیکن شاید انھوں نے بھی مخالفت میں کئی مضمون لکھے تھے۔ "لسان الصدق" مولانا حالی مرحوم کے پاس بھی جاتا تھا۔ اُس

وقت تک سرسری خط و کتابت ہیں نے اُن سے کی تھی۔ اُنھوں نے یہ ریویو پسند کیا۔ اور میری ہمت افزائی کی۔

اعتراضات، جو اُس وقت کیے گئے تھے وہ زیادہ تر دو قسم کے تھے: کتاب کی ادبی حیثیت پر اور مذہبی مباحث پر۔ ادبی حیثیت سے انگریزی الفاظ کے بکثرت استعمال پر مخزنؔ نے نکتہ چینی کی تھی، اور کتاب کے بعض حصوں کی عبارت، ادبی درجے سے گھٹی ہوئی بتلائی تھی، جس کی ایک ایسے مصنف سے توقع ہونی چاہیے۔ مذہبی اعتراض یہی تھا کہ سرسید کے مذہبی اجتہادات کی مدحت سرائی میں محض طرفدارانہ اور مقلدانہ جذبے سے کام لیا گیا ہے۔ حقِ نقد ادا نہیں کیا گیا ہے یہ دونوں اعتراض صحیح تھے، لیکن میں نے اپنے جوشِ عقیدت مندی میں اِن دونوں کا رد کیا اور چند مقامات، جہاں بعض فرعی تاویلات سے مصنف نے دبتا ہوا سا اختلاف کیا ہے، یا اختلافاتِ سرسید و محسن الملک میں محسن الملک کی تائید کی ہے، مثلاً مبحثِ تعینِ ذوالقرنین اور استجابتِ دعا وغیرہ، اور جنھیں قطعاً سرسید کے اصول و مقدمات اساسیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، بطور شواہد نقد کے پیش کیا، اور ثابت کرنا چاہا کہ مولانا حالیؔ نے بے طرفانہ اور نقّادانہ بحث کی ہے

حالیؔ کی بہترین تصنیف

"حیاتِ جاوید" اردو کی سب سے زیادہ ضخیم کتاب، وقت کے مباحث و حالات کا بہترین مجموعہ، اور مولانا حالی کی سب سے بڑی ادبی محنت ہے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا نے سرسید کی محبت و تقلید کے استغراق میں واقعات

و مباحث دونوں میں جو مداحانہ طریقہ اختیار کیا، وہ بالکل کھلا اور حدود معذرت سے متجاوز ہے، اور کتاب اس اعتبار سے کوئی سنجیدہ وقعت نہیں رکھتی۔ لوگوں کا خیال ہے اور میرا بھی اُس وقت خیال تھا کہ مولانا مرحوم کی یہ بہترین تصنیف ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب سے فرد تر۔

اُن کی سب سے بہتر تصنیف "حیات سعدی" ہے، جس نے اردو میں نئے طریق سیرت نگاری کا بہترین نمونہ پیش کیا، اور اس کے بعد مقدمہ دیوان حالی ہے۔ مقدمے کی وقعت، اضافی حیثیت سے ہے، یعنی شاعری پر اس نئے اسلوب پر بحث و نظر اُس وقت تک ناپید تھی۔ مولانا، یورپین لٹریچر سے براہ راست واقفیت نہ رکھتے تھے۔ یورپ کے مباحث کا کوئی نمونہ سامنے نہ تھا، بایں ہمہ اُنھوں نے نیا دروازہ اردو علم و ادب کے سامنے کھولا، اور اس باب میں اگر تقدم حاصل ہے، تو صرف محمد حسین آزاد کو۔ آب حیات، حیات سعدی اور مقدمہ، دونوں سے پہلے لکھی گئی۔

مولانا حالی سے ملاقات

لسان الصدق کے تھوڑے عرصے کے بعد ہی میں نے پہلی مرتبہ شوقیہ سفر کیا، اور لاہور کی انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں شریک ہوا۔ یہ ۱۹۰۱ء کی بات ہے۔ اس جلسہ میں مولانا حالی مرحوم بھی تشریف لائے تھے، اور یہ آخری مجلس تھی، جس میں مولانا نے نظم پڑھی۔

مولوی وحید الدین سلیم نے جب میری مولانا سے تقریب کی، اور انھیں معلوم

ہوا کہ لسان الصدق کا ایڈیٹر میں ہی ہوں، تو اُنھیں اس قدر تعجب ہوا کہ مکرر سہ کرر دریافت فرمایا۔ یہ صورت مولوی وحید الدین سے ملتے ہوئے بھی پیش آچکی تھی، اس لیے اُنھوں نے پہلے ہی سے تقریب کی ایسی ہی شکل اختیار کی تھی۔ مولانا مرحوم۔ مولوی تصدق حسین کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے، جو اُن کے بیٹے اور گورنمنٹ پنجاب کے میر منشی تھے۔ انجمن میں مولوی وحید الدین سے، میں ملا تھا۔ میں اُنھیں "معارف" کی وجہ سے بھی جانتا تھا۔ اُنھوں نے ایک تحریری لکچر بھی پڑھا تھا۔ علی گڑھ کانفرنس کے آخری جلسوں کی رپورٹوں میں اُن کی تقریروں کا ذکر بھی موجود ہے۔ یہ سب میں پڑھ چکا تھا، لیکن میری عمر چودہ پندرہ برس سے زیادہ نہ تھی اور ہر شخص سے ملتے ہوئے قدرتی طور پر جھجک ہوتی تھی۔ میں نے لسان الصدق کا اپنے کو ایڈیٹر ظاہر کیا تو اُن کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔

بہرحال جب اُنھیں یقین ہو گیا، تو اصرار کیا کہ چلو مولانا حالیؔ سے ملیں۔ مولانا کی قیام گاہ پر آئے۔ آتے ہی اُنھوں نے مولانا سے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ آپ کے خیال میں اِن کی عمر کیا ہے؟ مولانا مرحوم نے بے انتہا سنجیدہ لہجے میں بہت کچھ تامّل کر کے کہا کہ ابھی بہت کم سن ہیں۔ اِنھوں نے پھر زور دیا کہ نہیں، بتلائیے عمر کتنی ہے؟ مولانا نے کہا، پندرہ سولہ برس کی ہو گی۔ اِنھوں نے کہا لسان الصدق کے یہی ایڈیٹر ہیں! مولانا نے کہا، جو کلکتے سے نکلتا ہے؟ میں نے کہا، ہاں، لیکن اُنھیں اطمینان نہ ہوا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ معاملے میں کوئی پیچیدگی سی محسوس کرتے ہیں۔ جب مولوی وحید الدین نے اپنے تعجب کا بھی ذکر کر کے اُنھیں یقین دلایا کہ یہی ایڈیٹر ہیں، بمجرد

اس یقین کے وہ بہت ہی خوش ہوئے۔ میں دور بیٹھا تھا۔ مجھے قریب بلایا، اور حالات پوچھنے لگے۔ کہا ابھی آپ پڑھتے ہیں؟ میں نے کہا نہیں۔ میں اپنی تعلیم ختم کرچکا ہوں کہنے لگے، کتنا عرصہ ہوا ہے؟ میں نے کہا، دو تین سال۔ اس پر انھیں اور بھی تعجب ہوا، اور اُس دن سے وفات تک برابر شفقت فرماتے رہے، اور ہمیشہ اُن کے خطوط آتے رہے۔

مولانا حالی کی فراخ دلی

"الہلال" جب نکلا اور اُس کے مباحث مذہبی و سیاسی، دونوں اُس نقطۂ خیال سے بالکل مختلف ہوئے، جو سرسید مرحوم کا تھا، حتیٰ کہ سختی کے ساتھ اُن پر ایراد و اعتراض کیا گیا، تو کئی آدمیوں نے انھیں میری نسبت مخالفانہ خط لکھے، لیکن اُنھوں نے جو جوابات دیے، اور جو پھر مجھے خود اِن لوگوں نے دکھائے؛ اُن سے اُن کی طبیعت کی بلند خیالی، بے تعصبی، فراخ دلی، اور کمال انصاف پسندی اس درجہ واضح ہوتی ہے کہ موجودہ عہد میں شاید ہی اُس کی ایسی نظیر مل سکے۔ اُنھوں نے خود مجھے بھی لکھا تھا کہ میں "الہلال" کی پالیسی اور اُس کے مشرب سے نہ صرف متفق ہوں بلکہ صد درجہ اُس کا معترف اور اُس کی کامیابی کا خواہشمند ہوں، البتہ میرا خیال ہے کہ آج جو آپ کہہ رہے ہیں، یہ بالکل صحیح ہے، اور سرسید مرحوم نے ۱۸۹۰ء میں جو کہا تھا، وہ بھی صحیح تھا۔ یہ اشارہ اُن کا سرسید مرحوم کی پولیٹکل پالیسی اور کانگریس کی مخالفت کی طرف تھا۔ البتہ مجھے نہیں معلوم کہ اُنھوں نے لسان الصدق اور الہلال میں جو بُعد دبین ہے، اُس کے لیے

کیا رائے قائم کی تھی؟

مولانا شبلی کا اصرار

سنہ ۱۹۰۶ء میں ایسے حالات پیش آئے کہ میں عراق چلا گیا، اور پھر کوئی نمبر لسان الصدق کا نہیں نکلا۔ وہاں سے جب واپس آیا، تو بمبئی میں مولانا شبلی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔ اُس وقت مولانا مرحوم حیدرآباد میں ناظم علوم وفنون تھے، اور تقریباً پانچ سال سے میری خط وکتابت اُن سے جاری تھی۔ میں اُن کی ملاقات کا حال پہلے کہہ چکا ہوں۔ میں چونکہ اُن کی تصنیفات کا مطالعہ کر چکا تھا، اِس لیے اُن کی اپنے دل میں بڑی عزت و وقعت رکھتا تھا، اور طبیعت میں شوق تھا کہ ایسے لوگوں کی معیت وصحبت کا موقعہ حاصل ہو۔

مولانا مرحوم تقریباً دو تین ہفتہ رہے اور اکثر اوقات میں اُن کے ساتھ رہا۔ اُسی زمانے میں مولانا مرحوم نے الندوہ جاری کیا تھا۔ شاید ایک یا دو نمبر نکل چکے تھے۔ جب چند دنوں میں گفتگو وصحبت سے اُنھیں میرے علمی شوق کا خوب اندازہ ہو گیا، تو وہ بڑی محبت کرنے لگے۔ بار بار کہتے کہ مجھے ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔ تم اگر کسی طرح حیدرآباد آسکو، تو الندوہ اپنے متعلق کر لو، اور وہاں مزید مطالعہ وترقی کا بھی موقعہ ملے گا۔

ایک دن میرے یہاں بیٹھے تھے اور کتابوں کی الماریوں سے کتابیں نکال نکال کے دیکھ رہے تھے۔ اِس میں خدنگ نظر کا ایک مجموعہ نکل آیا۔ اُس میں میرے مضامین بھی تھے۔ پڑھ کر انھوں نے بہت زیادہ اصرار کیا، اس میں ایک

مضمون، اکسِ ریز کی ایجاد و حقیقت پر تھا۔ اُنھوں نے کہا، جب تم ایسے مضامین لکھ سکتے ہو، تو کیوں اِس طرح بلا کسی مشغلے کے ہو؟ کم سے کم ایک مضمون الندوہ کے ہر نمبر کے لیے لکھ دیا کرو۔

سب سے زیادہ مولانا شبلی پر میرے شوقِ مطالعہ اور وسعتِ مطالعہ کا اثر پڑا۔ اُس وقت تک میرا مطالعہ اِتنا وسیع ہو چکا تھا کہ عربی کی تمام نئی مطبوعات اور نئی تصنیفات تقریباً میری نظر سے گزر چکی تھیں، اور بہتیری کتابیں ایسی بھی تھیں کہ مولانا اُن کے شائق تھے اور اُنھیں معلوم نہ تھا کہ چھپ گئی ہیں، مثلاً محصّل امام رازی، جس کا ذکر آچکا ہے۔

مولانا شبلی کی حیرت!

پٹنہ کے ایک شخص، علی محمود جن کا انتقال ہو چکا ہے، اُس وقت بمبئی میں تھے، اور وہ بھی برابر مولانا سے ملنے کے لیے جایا کرتے۔ ایک دن میں اُس ہوٹل میں گیا، جہاں مولانا ٹھہرے ہوئے تھے، تو دیکھا کہ ایک بحث بڑی سرگرمی سے ہو رہی ہے۔ علی محمود سے شاید مولانا نے کہا تھا کہ فنِ مناظرہ کی ناواقفیت کی وجہ سے لوگوں کی گفتگو کس قدر بے اسلوب ہوتی ہے، اور اُنھوں نے بتلایا تھا کہ رشیدیہ اِس میں اچھا متن ہے۔ وہ لے کر آئے تھے۔ ایک اور مولوی نظام الدین، پنجاب کے تھے، وہ بھی پہنچ گئے تھے، اور اِس بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ میں جب پہنچا، تو میں نے دیکھا کہ رشیدیہ کے بعض مطالب، مولانا علی محمود کو سمجھانا چاہتے ہیں، لیکن مولوی نظام الدین بار بار اُلجھ پڑتا ہے، اور ہر چند

وہ بجھاتے ہیں، لیکن کج بحثی بڑھتی جاتی ہے۔ میں بھی ایک دو موقع پر بول اٹھا اور پھر مولوی نظام الدین کو مخاطب کر کے میں نے بعض باتیں، جو مابہ النزاع ہوئی تھیں، کہیں تھا اس پر مولانا شبلی میری طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ اپنی تقریر پوری کرو۔ میں نے اِس حصۂ کتاب پر ایک اچھی خاصی بسیط تقریر کر ڈالی۔ اُس وقت مجھے دریا سیات خوب مستحضر تھیں۔ نیا نیا پڑھنے پڑھانے سے فارغ ہوا تھا۔ اعتراضات اور اُن کی بحثیں بھی بار بار منجھ چکی تھیں۔ میں نے بڑی زوردار تقریر کی، اور اگرچہ بات کچھ بھی نہ تھی، لیکن مولانا شبلی مرحوم اِس درجہ متاثر ہوئے کہ بار بار تعریف کرتے اور کہتے کہ تمہارا ذہن و دماغ عجائب روزگار میں سے ہے۔ تمھیں تو کسی علمی نمائش گاہ میں بطور ایک اعجوبے کے پیش کرنا چاہیئے!

ہوس پرستی!

میرا خیال ہے کہ یہ پہلا موقعہ تھا کہ مولانا مرحوم کی رائے میری نسبت اچھی قائم ہوئی، اور پھر اُن کی شفقت و بزرگی کی وجہ سے ہمیشہ بڑھتی ہی گئی۔ دو تین ہفتے کے بعد وہ حیدرآباد واپس چلے گیے اور وہاں سے برابر خط بھیجتے رہے کہ میں حیدرآباد آؤں۔ اِس زمانے میں جیسا کہ کسی دوسرے موقعے پر کہوں گا، میرے خیالات اور خیالات کی وجہ سے حالات ایسے ہو رہے تھے کہ گھر کی زندگی سے، جو کئی سال پہلے دل برداشتگی، ہوئی تھی، وہ اب تک باقی تھی، اور اس لیے خیال ہوتا تھا کہ یہ اچھا موقع ہے۔ ایک ایسے شخص کی صحبت ہاتھ آتی ہے۔ چلا جانا چاہیے، لیکن بعض اور وابستگیاں، اُس وقت کی زندگی کی، ہوس پرستیوں سے ایسی پیدا ہو گئی تھیں کہ قدم روک

لیتی تھیں!

"الندوہ" کی ایڈیٹری

اس اثنا میں مولانا مرحوم نے استعفا دے دیا اور مجھے لکھا کہ اب میں بقیہ عمر، ندوے کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں، اور اعظم گڑھ ہو کر لکھنؤ جاؤں گا۔ یہ ٹھیک اُس وقت کی بات ہے کہ دسمبر کا آخری ہفتہ تھا اور لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس تھا۔ میں اور بھائی مرحوم اِس کی شرکت کی غرض سے لکھنؤ پہنچے تھے، اور وہیں مولانا کا خط مجھے ملا تھا۔ اعظم گڑھ سے اُنھوں نے پھر خط لکھا اور اصرار کیا کہ اب زیادہ اچھا موقع ہے۔ لکھنؤ میں اگر رہو، تو حیدرآباد سے بھی بڑھ کر یہ بہتر ہوگا۔

اِس مرتبہ میں نے قطعی فیصلہ کر لیا اور لکھنؤ پہنچ گیا، لیکن لکھنؤ میں مولوی حفیظ اللہ[ع] سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے گھر کی علالت کی خبر سنکر پھر اعظم گڑھ چلے گیے ہیں اور اُن کا تار آچکا ہے کہ اگر ہو سکے تو خود اعظم گڑھ جاؤ۔ چنانچہ میں اعظم گڑھ گیا۔ عجیب اتفاق، جس دن پہنچا، اُسی دن اُن کی بیوی کا انتقال ہوا۔ وہاں سے ہم ایک ساتھ لکھنؤ واپس آئے اور میں ندوے ہی میں ٹھہر گیا، اور الندوہ کی ایڈیٹری اُنھوں نے میرے متعلق کر دی۔ تقریباً سات آٹھ مہینے وہاں قیام رہا۔

مولانا شبلی سے عقیدت

ہر وقت مولانا مرحوم سے یکجائی رہتی تھی۔ وہ بھی صبح سویرے سے اُٹھنے کے عادی

ع۔ دار العلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم تھے۔

اور میں بھی بچپن سے اس کا خوگر۔ جاڑے کا موسم تھا، صبح چار بجے میں اُن کے کمرے میں چلا جاتا۔ اُسی وقت چائے کا دور چلتا۔ طرح طرح کے علمی تذکرے رہتے۔ اکثر فارسی اشعار کا اپنے خاص لحن میں ترنم کرتے۔ اِن اشعار کے متعلق تذکرے رہتے شام کو کبھی قیصر باغ یا اور کہیں دور کا چکر لگانے نکل جاتے اور یہ تمام وقت بھی علمی ادبی تذکروں میں بسر ہوتا۔ حقیقتہً وہ ایسی صحبتیں تھیں، جن کا لطف و کیفیت عمر بھر فراموش نہ ہوگی۔ مجھے اِن صحبتوں سے بہت فائدہ ہوا۔ مولانا مرحوم کے انتقال سے جہاں کتنی ہی خوبیاں اور کمالات اُن کے ساتھ مدفون ہو گئے، وہاں ایک سب سے بڑی چیز، یہ پُرلطف صحبت تھی، جو اُن کے بعد ایک مرتبہ بھی مجھے کہیں کسی گوشے اور کسی حلقے میں میسر نہ آئی۔ اُن کا علمی ذوق، جو وسیع اور ہر وادی میں تھا، ایک ساتھ ہی مدفون ہو چکا ہے۔

اخبار ”وکیل“ سے تعلق

الندوہ میں اُن کا کوئی نہ کوئی مضمون ضرور ہوتا تھا۔ ایک دو نمبر ایسے بھی نکلے کہ تمام ترمجھی کو بھرنا پڑا، لیکن اِس کے بعد بمبئی میں ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا کہ میں لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہوا اور بمبئی آیا۔ لاہور کے پچھلے سفر میں جن لوگوں سے خاص طور پر ملاقاتیں رہی تھیں۔ اُن میں مرحوم شیخ غلام محمد مالک ”وکیل“ بھی تھے۔ وہ اِس کے بعد برابر خواہشمند رہتے تھے کہ میں ”وکیل“ میں مضامین لکھا کروں، اور میں بھی گاہ گاہ مضامین بھیجتا رہتا تھا۔ لکھنؤ میں اُن کا خط آیا کہ حامد علی صدیقی جو اُس وقت ایڈیٹر تھے، اپنی اصلی ملازمت پر واپس چلے گئے ہیں۔ اب کوئی ایڈیٹر نہیں ہے، میری خواہش

ہے کہ آپ آجاتے۔ اگر آپ آجائیں تو میں اخبار بالکل آپ کے سپرد کر دوں، اور پوری آزادی سے آپ اپنے خیالات ظاہر کر سکتے ہیں۔ اس پر بھی وہ بہت زور دیتے تھے کہ قومی خدمت اور قوم کو تعلیم دینے کا جو ذریعہ ہو سکتا ہے، وہ سب سے بہتر اخبار ہی ہے، اور اردو اخبارات میں وکیل کا حلقۂ مطالعہ جتنا وسیع اور اونچا ہے، ویسا اور کسی اخبار کا نہیں ہے۔ یہ آخری بات صحیح بھی تھی، لیکن میں مولانا شبلی سے الگ ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔ بمبئی میں پھر اُن کا خط آیا اور انجمن حمایتِ اسلام کا بھی سالانہ جلسہ ہونے والا تھا، چنانچہ میں لاہور گیا، اور جلسے کے بعد امرتسر آیا۔ پہلے تو محض عارضی طور پر اخبار کی ترتیب شروع کر دی، کیونکہ اس وقت دفتر میں کوئی انتظام نہ تھا، مگر اُس کے بعد طبیعت لگنا شروع ہو گئی اور میں نے رائے قائم کر لی کہ کچھ دنوں اس عالم کی بھی سیر کرنی چاہیئے۔

زیادہ تر دو خیال اُس وقت سامنے تھے۔ اول یہ کہ اخبار سے بہتر اپنے خیالات کی اشاعت اور عام بحث و نظر کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ دوم اگر خود کوئی اخبار نکالا جائے، تو اُس کو ایک وسیع حلقہ پیدا کرنے کے لیے کافی وقت چاہیے۔ برخلاف اس کے وقت کے کسی نامور اور مقبول اخبار کی تحریر اگر اپنے اختیار میں آجائے، تو پہلے ہی دن سے ایک وسیع اور اچھا حلقہ پڑھنے والوں کا میسر آجائے گا، اور جو کچھ لکھا جائے گا، وہ ایک وسیع اخبار میں نکلنے کی وجہ سے اعتماد و توجہ کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ وکیل اُس وقت تمام اردو اخبارات میں سب سے زیادہ متین و سنجیدہ اور قومی مسائل میں صاحب رائے و نظر اخبار تسلیم کیا جاتا تھا، اور متعدد معاملات میں اُس نے اپنا وقیع درجہ بھی نمایاں کر دکھایا تھا، مثلاً علی گڑھ

کالج کے معاملات، جو اُس وقت مسلمانوں کی ترقی یافتہ سوسائٹی کا تنہا اور سب سے بڑا مرکز بحث ورائے تھا، ٹرکی اور مصر کے معاملات سے بھی عام دلچسپی اِسی نے پیدا کرائی اور اس بارے میں ہمیشہ آزادانہ رائیں اُس کے صفحات پر نکلیں۔ حجاز ریلوے کے لیے چندے کی فراہمی میں بھی اس نے بہت حصہ لیا۔ ایسا سمجھا جاتا تھا کہ ہندستان میں ٹرکی کے مسائل پر آزادانہ لکھنے والا صرف وہی ایک اخبار ہے۔

میں نے خیال کیا کہ وقت کے ایک ایسے بہتر اخبار کو اڈیٹری میں رکھنا، اس سے بہتر ہوگا کہ کوئی نیا اخبار نکال کے جد وجہد و مقابلے میں وقت ضائع کیا جائے۔ شیخ غلام محمد مرحوم کے اصرار اور اُن کی ذاتی خوبیوں کو بھی اس کشش میں بہت کچھ دخل تھا۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ اتحاد مشرب میں میں بھی سر سید کی تقلید میں مخمور اور وہ بھی اِس وادی میں اور کسی سے کم نہ تھے۔ پہلی مرتبہ جب وہ ملے تو مجھ سے کہا کہ سچ یہ ہے کہ اگر نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی، تو اُن کا (سرسید کا) دماغ تو نبوت کا دماغ تھا؟ میں یہ سنکر بہت خوش ہوا، گویا یہ رائے دیکر انھوں نے اپنا اہل الرائے ہونا مجھ پر ثابت کر دیا!

"وکیل" کی اِدارت

غرضکہ اِن اسباب سے مجھے "وکیل" میں دلچسپی پیدا ہو گئی اور چند ہفتوں کے بعد اُس کی اڈیٹری کی پوری ذمہ داری قبول کر لی۔ اس زمانے میں "وکیل" ہفتے میں تین مرتبہ نکلتا تھا، اور دفتر میں بجز ایک مترجم اخبار کے اور کوئی مددگار نہ تھا۔ اس مترجم کا بھی یہ حال تھا کہ بلا نگرانی اور اصلاح کے ایک سطر بھی درج نہیں کی جا سکتی تھی۔ اخبار

کے لیڈنگ۔ آرٹیکل سے لے کر جزوی مواد تک، سب گویا تن تنہا ہی مرتب کرتا پڑتا تھا۔ میرے جانے سے پہلے وکیل میں عموماً ایک، ڈیڑھ کالم کا لیڈنگ آرٹیکل اور ایک کالم کے بریف نوٹس ہوا کرتے تھے۔ باقی مراسلات و اقتباسات، لیکن اس زمانے میں طبیعت میں ان چیزوں کا ایسا شوق تھا کہ اس ترتیب پر طبیعت قانع نہ رہی اور دو کالم کی جگہ کم سے کم چار کالم تک ایڈیٹوریل رہنے لگا۔ اس کے علاوہ مراسلات و اقتباسات کے انتخاب کا بھی معیار زیادہ تنگ اور بلند کر دیا گیا۔ مراسلات عموماً وہی منتخب کی جاتی تھیں، جو مفید و متین ہوتیں۔ علمی و تاریخی مقالات بھی ایڈیٹوریل صفحات کے علاوہ اکثر درج کیے جاتے تھے۔
مجھے اس سے پہلے بیک وقت اس قدر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، لیکن جب ذمہ داری پڑ گئی تو کوئی دقت محسوس نہ ہوئی، البتہ یہ ضرور ہوا کہ ایک لمحے کی بھی مہلت، آرام و تفریح کے لیے نہیں ملتی تھی۔ صبح سے جو بیٹھتا تھا، تو بمشکل مغرب تک فارغ ہو سکتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد سخت بیمار پڑ گیا، حتیٰ کہ یہ حالت ہو گئی کہ شب و روز پلنگ پر لیٹا رہتا، لیکن لیٹے لیٹے بھی کام کرتا رہا، اور اخبار کی معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ وکیل کی اشاعت اس زمانے میں بہت بڑھ گئی، یعنی پہلے سے ڈیوڑھی ہو گئی، اور لوگوں نے اس کے مباحث اور علمی و ادبی رنگ کی ترقی محسوس کی۔

مولانا نذیر احمد سے ملاقات

سال بھر تک وہاں رہا تھا کہ بھائی مرحوم کے آنے اور انتقال کرنے

کی خبر ملی اور طبیعت اس درجہ دل برداشتہ ہوئی کہ وہاں قیام تکلیف دینے لگا۔ اِس اثنا میں والد مرحوم نے پے در پے اصرار کیا اور پھر کلکتہ سے دو آدمی لانے کے لیے بھیج دیئے۔ مظفر نگر میں انجمن اسلامیہ نے اپنا سالانہ جلسہ کیا تھا اور مولوی ثناء اللہ بہت مصر تھے کہ ایک دن وہاں ٹھہر جاؤں اِن لوگوں کے بھی پے در پے تار آ رہے تھے۔ میں مظفر نگر آیا اور دو دن ٹھہر کے دلّی چلا گیا۔

مولوی نذیر احمد سے آخری ملاقات اسی مرتبہ ہوئی۔ اِس زمانے میں "الحقوق والفرائض" چھپی تھی۔ مجھے ایک نسخہ دیا اور کہا کہ میں کسی شخص کی رائے زنی اور ریویو کی پروا نہیں کرتا، اور نہ آج تک کبھی کسی کو اس غرض سے اپنی کتاب بھیجی ہے، لیکن تمہیں اِس لیے دیتا ہوں کہ پڑھنے کے بعد اگر محسوس کرو کہ یہ کتاب ضروری و مفید ہے، تو پبلک کو اس کا مشورہ دو۔ اِس سے پہلے انھوں نے مجھے اپنے ترجمے کا بھی ایک نسخہ دیا تھا، اور جن لوگوں کو اِس بارے میں اُن کی طبیعت کا حال معلوم تھا، وہ اِس تبرّع کو ایک غیر معمولی واقعہ سمجھتے تھے۔ کتاب واقعی مفید تھی۔ میں نے ریویو لکھ کر وکیل میں بھیج دیا، اور بعض باتوں کی طرف توجہ بھی دلائی، جس کی نسبت انھوں نے مجھے لکھا تھا کہ وہ صحیح ہیں۔ آئندہ ایڈیشن میں انھیں ملحوظ رکھوں گا۔

اخبار "دار السلطنت"

جب کلکتے پہنچا، تو مولوی محمد یوسف جعفری نے ذکر کیا کہ مولوی عبد اللطیف

تاجر چرم، جن کے والد، مولوی عبد الباری، اخبار "دار السلطنت" کلکتے سے نکالتے تھے، چاہتے ہیں کہ اب دار السلطنت دوبارہ شایع کیا جائے۔ اگر تم اس کی ایڈیٹری منظور کرلو، تو وہ فوراً آمادہ ہوجائیں۔ اسی زمانے میں نواب سلیم اللہ خاں مرحوم ملے اور چونکہ مشرقی بنگال میں تقسیم بنگال کا قضیہ سرگرمی کے ساتھ جاری تھا، انھوں نے بھی بہت خواہش ظاہر کی کہ کلکتے سے ایک اخبار نکلنا چاہیے، چنانچہ میں نے منظور کرلیا۔ چند دنوں کے بعد پریس وغیرہ کا انتظام ہوگیا اور دار السلطنت نکلنے لگا۔ یہ ہفتہ وار تھا اور چھپائی اور کتابت کا اچھا انتظام کیا گیا تھا۔

دار السلطنت درا صل اردو کے قدیم ترین اخبارات میں سے ہے۔ اس کا پہلا نام "اردو گائیڈ" تھا۔ غدر سے پہلے جب اردو تصنیف و تحریر کا عام رواج نہیں ہوا تھا، لیکن کلکتے میں انگریزی حکومت کے استقرار کی وجہ سے نئی چیزوں سے لوگ آشنا ہو چکے تھے۔ فارسی میں کئی اخبار نکلے۔ من جملہ ان کے "دور بین" تھا، جس کے کئی ایڈیٹر ہوئے، اور آخری ایڈیٹر، نواب شمس الہدیٰ مرحوم کے والد تھے۔

مرزا غالب کلکتہ میں

میں نے اس کے وہ پرچے دیکھے ہیں، جن میں مرزا غالب مرحوم کے ورود قیام کلکتہ، یہاں کے مشاعرے اور صحبتیں، اور شعرائے کلکتہ کی مخالفت اور مثنوی باد مخالف وغیرہ حالات چھپے تھے، اور پھر ایک پرچے میں مرزا غالب

مرحوم کی بالزام قمار بازی، دلی میں گرفتاری اور سزایابی کی خبر بڑے طعن و تشنیع و استہزا و تذلیل کے ساتھ چھپی تھی۔

اُس وقت کے کلکتے کے شعرا و ادبا اِن اخبارات میں فارسی نظم و نثر لکھا کرتے تھے۔ غدر کے بعد جب مرزا غالب مرحوم نے "قاطع برہان" شایع کی، جس میں "برہان قاطع" پر اعتراضات کیے گیے تھے، اور اُن کے ایرادات مقلدین لغت ہند پر نہایت شاق گزرے اور ایک عام ایجی ٹیشن اُن کے خلاف پھیل گیا، تو اِس میں بڑا حصہ، کلکتے کے اِن فارسی اخبارات ہی نے لیا تھا، اور بکثرت مضامین اِس موضوع پر شایع ہوتے رہتے تھے۔ میں نے وہ تمام پرچے دیکھے ہیں۔

غدر کے بعد بتدریج فارسی تحریر و مطالعے کا ذوق کم ہوتا گیا، اور اُس کی جگہ اردو نے لے لی۔ اِس زمانے میں دوربین پریس کو مولوی کبیرالدین احمد نے خرید لیا اور کچھ دنوں تک اِس نام سے اردو میں اخبار جاری رہا، اور پھر اُس کا نام "اردو گائیڈ" ہو گیا۔ اُس زمانے میں یہ بڑا وقیع اخبار تھا اور دور دور تک اِس کی پہنچ تھی۔ مولوی کبیرالدین کے انتقال کے بعد مولوی عبدالباری نے اِس کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اُنھی کے خرچ سے عرصے تک جاری رہا۔ اِسی کا نام آخر میں "دارالسلطنت" ہو گیا تھا۔ مولوی عبدالغفور شہباز مرحوم بھی اِس کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔

مولوی عبدالباری کے انتقال پر یہ بند ہو گیا تھا، جس کو اُن کے لڑکے نے اب جاری کیا۔ افسوس ہے کہ اب اُن کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ بہرحال کچھ عرصے

تک دارالسلطنت کا مشغلہ رہا، لیکن پھر میں نے محسوس کیا کہ مرحوم عبداللطیف، جو خود ذاتی دلچسپی اس کام میں نہیں رکھتے تھے، دوسرے لوگوں کے اغراض سے متاثر ہوتے ہیں، اور اخبار کی پالیسی اور وقت کے مسائل کی نسبت دخل دینے لگتے ہیں۔ میں نے چونکہ محض اپنے لیے ایک مشغلہ سمجھ کے اسے اختیار کیا تھا، ان باتوں کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ میں نے علیحدگی اختیار کر لی اور پھر اخبار بھی بند ہو گیا۔

امرتسر کو واپسی

چند دنوں کے بعد میں دوبارہ امرتسر گیا۔ مولوی غلام محمد مرحوم کے خطوط برابر آتے رہتے تھے اور میں جب وہاں سے آیا تھا، تو اُس وقت بھی عارضی علیحدگی کی صورت تھی، اور واپسی کا وعدہ تھا۔ یہاں آنے کے بعد پھر ایسے حالات پیش آئے جن کا دوسرے موقعے پر ذکر کروں گا، کہ چند دنوں کے بعد میں نے امرتسر جانے کا ارادہ کر لیا۔ کراچی میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ تھا خیال تھا کہ پہلے کانفرنس میں شریک ہوں وہاں سے آ کے امرتسر میں ٹھہر جاؤں، لیکن امرتسر پہنچ کے شیخ غلام محمد نے اپنا ارادہ کراچی کا فسخ کر دیا اور پھر میں بھی نہیں گیا۔

اس مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ اخبار کا ہفتے میں تین مرتبہ نکلنا تقریباً بے سود ہے۔ روزانہ کا وہ کام نہیں دے سکتا اور تین ٹکڑے ہو جانے کی وجہ سے محنت بے کار منقسم ہو جاتی ہے۔ شیخ غلام محمد نے بھی اتفاق کیا اور اخبار کو ہفتے میں دو بار کر دیا گیا۔ دو مرتبہ میں ضخامت اُس سے کہیں زیادہ تھی جتنی تین مرتبہ میں

ہوا کرتی تھی۔

انقلابی تبدیلیاں

اِس عرصے میں میری طرزِ تحریر اور ذوق و افکار میں بھی تبدیلیاں ہو چکی تھیں، جن کی رفتار اِس حصۂ عمر میں اِس قدر تیز رہی کہ میں ٹھیک طور پر انھیں بیان نہیں کر سکتا۔ استعداد، مطالعہ، معلومات، ذوق، افکار و عقائد، تحریر و انشا، اِن تمام چیزوں میں بہت جلد جلد تغیرات ہوتے گئے کہ بیان کرنے میں وہ ایک پوری عمر کی داستان معلوم ہوتی ہے، حالانکہ یہ سب کچھ چند سالوں کا واقعہ ہے۔ ایک حالت سے دوسری حالت تک بمشکل چند ماہ پیش آتے تھے۔ ساری باتوں میں بڑھنے اور متغیر ہونے کا یہی حال رہا ہے۔ میری تحریرات اگر اِس زمانے کی دیکھی جائیں گی، تو عجب نہیں کہ ہر ہفتہ کی تبدیلیاں ایک باریک بیں نظر محسوس کر لے گی۔ میں نہیں کہہ سکتا یہ نقص ہے یا حسن، مگر واقعہ یہی ہے۔

"وکیل" سے علیحدگی

آٹھ نو مہینے کے بعد میں نے پھر "وکیل" ہاتھ میں لیا، لیکن اب اتنے عرصہ میں بہت سی باتوں میں تغیر ہو چکا تھا، اور تغیرات کا سلسلہ پوری سرعت کے ساتھ جاری تھا۔ اِس مرتبہ میرے پولٹیکل خیالات میں خاصۃً مسائلِ ہند کے متعلق وہ تبدیلی ہوتی، جس نے آگے چل کر میرے عہدِ الہلال کے مسلک کی طرف رہنمائی کی۔ چونکہ شیخ غلام محمد صاحب اِسے متفق ہو سکتے تھے، اور نہ سمجھ سکتے تھے، انھیں صرف ایک

ری راہ کا استغراق رہا تھا، اور اُس سے انحراف کے معنی یہ تھے کہ وہ اپنی تمام پچھلی اخباری زندگی کے خیالات و اعمال پر قلم کھینچ دیں، اس لیے نو دس مہینے کے بعد پھر میں دل برداشتہ ہوا اور امرتسر سے بھوپال آگیا، جہاں ہمشیر آئی ہوئی تھیں، اور مجھے بلا رہی تھیں۔

اِس زمانے میں میں نے یہ رائے قائم کی کہ جو مقاصد اب پیش نظر ہیں، وہ اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے، جب تک ایک طاقتور اور وسیع اہتمام و انتظام کے ساتھ اپنا ذاتی اخبار نہ نکالا جائے اور ذاتی پریس نہ ہو۔

پونا کی برساتیں

پنجاب کی گرمی کیسی سخت ہوتی ہے اور اس سال بارش کی قلت کی وجہ سے اور بھی زیادہ گرمی پڑتی تھی۔ امرتسر کے مئی جون نے مجھے بالکل جھلس ڈالا تھا۔ صحت بہت خراب ہو رہی تھی، اس لیے میں بھوپال سے بمبئی چلا گیا اور وہاں سے پونا پُونا میں مولوی رفیع الدین نے اپنی اردو کانفرنس کا کارخانہ کھول رکھا تھا۔ اُس کا جلسہ بھی تھا۔ آغا خاں صدر تھے۔ کچھ دنوں وہاں ٹھہرا، اور وہاں کے عمدہ برسات کے موسم نے، جس سے بہتر ہندستان میں کہیں بھی برسات کا موسم نہیں ہوتا، میری صحت کو بہت فائدہ پہنچایا۔

میرا خیال ہے کہ جولائی و اگست میں پونا کا موسم جس قدر صحت بخش اور پُر فضا ہے، شاید ہی ہندستان کا کوئی پہاڑ یا سنیٹیرین مقام ہو، باستثناء کشمیر، مگر کشمیر، بارش میں بے کار ہے۔ ابھی پونا ہی میں تھا کہ والدہ مرحوم کی سخت علالت کا

تار آیا۔ تار، حافظ ولی اللہ مرحوم کے نام آیا تھا وہ لے کر میرے پاس آئے اور میں
اور وہ دونوں اُسی دن کلکتہ روانہ ہو گیے۔ کلکتے میں صبح آٹھ بجے پہنچے۔ والد مرحوم
کے مرض موت کا وہ آخری دن تھا۔ اور گویا میری آمد کے منتظر تھے اُسی دن سہ پہر
کو اُن کا انتقال ہو گیا۔

خطابت

میں سمجھتا ہوں کہ گویائی کا غیر معمولی ابھار فطرۃً میری طبیعت میں تھا۔ میں
ابھی بہت چھوٹا تھا کہ لوگ کہتے تھے، کہ میں بہت باتیں کرتا ہوں۔ جب لکھنے پڑھنے
لگا، تو بحث و بیان کا بہت شائق تھا۔ خود بخود یہ بات پیدا ہو گئی تھی کہ جو کچھ پڑھتا
جو کچھ سنتا، جو کچھ جانتا، اُس کو زور و قوت کے ساتھ بیان کرنے کا اندر شوق پیدا
ہوتا۔ اگر ان چیزوں میں وراثت کو دخل ہے، جیسا کہ علمائے اخلاق کا ایک گروہ
کہتا ہے، تو اس میں شک نہیں کہ والد مرحوم کی مشہور گویائی میرا خاندانی ورثہ تھا۔
بھائی مرحوم میں بھی بہت اچھی گویائی تھی اور ایک گویا آدمی کے لیے جس قدر ضروری
اجزا ہیں، مثلاً آواز کا بلند ہونا، لغزش و لکنت کا نہ ہونا، تیز گوئی اور تسلسل بیان
کا عادی ہونا وغیرہ سب باتیں اُن میں تھیں۔

والدہ کی گویائی

والدہ مرحومہ بھی بہت گویا اور فصیح البیان تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُن
میں غیر معمولی قوت بیانیہ تھی۔ رمضان کے دنوں میں تراویح کے بعد کثرت کے ساتھ

تمام مکے کے اچھے خاندانوں کی عورتیں ہمارے یہاں آتیں، اور سحری کے وقت تک والدہ مرحومہ، بلند آواز کے ساتھ کچھ نہ کچھ بیان کرتی رہتیں۔ کبھی کوئی خاص کتاب، کبھی کوئی مفید مذہبی قصہ، کبھی کسی مذہبی مسئلے کا بیان۔ اُن کا خاندان، حجاز کے نہایت سربلند علوی خاندانوں میں سے تھا، اور اُن کے والد و چچا کی عزت، حرمین کے تمام عالموں کے دلوں پر نقش تھی، اس لیے اُن کی بھی تمام گھروں میں تعظیم کی جاتی تھی، اور عقیدت و استفادہ کے جذبے کے ساتھ عورتیں اُن کے پاس آیا کرتی تھیں۔ میرے ماموں، محمد ہاشم مرحوم کی نسبت، بھی جو کچھ میں نے سنا ہے (کیونکہ اُن کا انتقال بالکل میری اوائل طفولیت میں ہوا) اُس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بہت گویا ولسان تھے۔

ننھا سا واعظ!

میں بہت چھوٹا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ مغرب کے بعد دیوان خانے میں والد مرحوم کے مریدوں کی بڑی تعداد اُن کی ملاقات کا انتظار کرتی۔ اُس وقت میں ایک واعظ کی طرح بیٹھ کر جو جی میں آتا بکتا رہتا۔ بچپن میں بات چیت کرنے میں جو جھینپ اور حجاب ہونا چاہیئے، وہ بالکل نہ تھا۔ اکثر لوگوں کو میری وہ باتیں یاد ہیں۔ حاجی مصلح الدین، والد مرحوم کے ایک مسن مرید ہیں۔ انھوں نے مجھے ایک مرتبہ یاد دلایا کہ تم سے "ولما جاء موسیٰ لمیقاتنا" کا مطلب ہم نے پوچھا تھا۔ اور تم نے حضرت موسیٰ کے واقعات اور اُن کا کوہ طور پر جانا اور توراۃ کی تختیوں کا لینا، ایک گھنٹے تک سنایا تھا۔ اُس وقت میری عمر آٹھ نو برس کی ہوگی۔

میں قرآن کا مطلب اس لیے سمجھتا تھا کہ قرآن، ترجمے کے ساتھ پڑھایا گیا تھا، گو اس التزام کے ساتھ پورا نہیں ہوا تھا۔ شاید دس بارہ پارے ترجمے کے ساتھ پڑھے تھے۔ جب درسیات میں ذرا آگے بڑھے، تو یہ چیز بھی زیادہ ترقی کر گئی۔ درسیات کے مطالب بالکل نوک زبان رہتے تھے۔ لہٰذا اوقات ہمارے اَن پڑھ اور جاہل مریدوں کے مجمع میں اُن کے اظہار ونمائش کا موقعہ نہیں ملتا تھا، تو ہم دونوں بھائی آپس ہی میں یوں تقریر بازی کیا کرتے تھے کہ آج کے درس پر وہ بطور استاد و مدرس کے تقریر کریں اور میں بھی کردوں۔ کون حفظ درس اور خوبی بیان میں بازی لے جاتا ہے؟ جب ہم ایسا کرتے، تو بے چارے مرید، حلقہ باندھ کر بیٹھے رہتے۔ اور گو اُن کی سمجھ میں نہ آتا، مگر عقیدت کے کانوں سے سنتے رہتے تھے اور سمجھتے کہ اُن کے پیر زادوں کی یہ بھی کوئی غیر معمولی کرامت ہے۔ یہ بات اُس وقت ہمارے خاندان کے حلقہ معتقدین میں عام طور پر زبان زد تھی کہ حضرت کی کرامتوں میں سے (والد مرحوم اسی لقب سے گھر میں بھی اور باہر بھی پکارے جاتے تھے، حتیٰ کہ ہم بھی اُنھیں ابا، یا کوئی اور لفظ نہ کہتے تھے۔ حضرت ہی کہتے تھے) ایک بڑی کرامت یہ ہے کہ اُن کے لڑکے ماں کے پیٹ سے عالم و واعظ پیدا ہوئے ہیں!

"کرامت"

اس زمانے میں مقامی معترضین میں ایک شخص، مولوی عبد الشکور مرحوم تھے، جو والد مرحوم کی مخالفت میں اکثر رسالے لکھتے رہتے تھے۔ والد مرحوم اس بارے میں بہت بلند نظر رکھتے تھے، اور کبھی عام معترضین یا مخالفین کو مخاطب نہیں کرتے تھے، اسی لیے

انھوں نے تو کبھی اِس کی پروا نہ کی، لیکن اُن کے معتقدین میں جو لوگ علما میں سے تھے، وہ بھی رسالہ بازی کرتے رہتے تھے۔ ایک شخص، مولوی حبیب الرحمان تھے۔ کچھ دن ہوئے گھر میں کتابیں دیکھ رہا تھا، تو اُن کا ایک رسالہ نکل آیا جو اُنھوں نے اُس زمانے میں مولوی عبدالشکور کے رد اور والد مرحوم کے انتصار میں لکھا تھا۔ مجھے بڑی ہنسی آئی، جب میں نے اُس کے دیباچے میں دیکھا کہ مصنف نے والد مرحوم کے فضائل و خوارق بیان کرتے ہوئے واقعی ایک بڑی کرامت کے طور پر لکھا ہے کہ اُن کے صاحب زادے، نو برس کی عمر میں عالم و فاضل اور بہت بڑے واعظ ہیں، جس کا جی چاہے، اُس دربار میں حاضر ہو کے کانوں سے سن لے اور آنکھوں سے دیکھ لے!

جب ذرا اونچی کتابیں پڑھنے لگے، اساتذہ میں توسیع ہوئی، ملنے جلنے کے وسائل بھی زیادہ بڑھے، تو پھر اِس میں بھی (تقریر میں) اور ترقی ہوئی، اور اِس فن و ذوق کا زیادہ تر ظہور، بحث و مناظرے کی شکل میں ہوا۔ چنانچہ اُس زمانے میں جو اہلِ علم بھی ملتا، میں کوئی نہ کوئی بحث ضرور چھیڑ دیتا، اور اُس کو اپنی تیز زبانی اور قوتِ بیانی سے حیران اور مبہوت ضرور کر دیتا۔ جامع مسجد کی صحبتیں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ عصر کے بعد اکثر ملنے جلنے والے وہاں آ جاتے، کچھ اونچے درجے کے طلبہ بھی ہوتے، بعض مولوی بھی تھے پہلے بحث و مناظرہ اور پھر تقریر و بیان کی صورت پیدا ہو گئی۔ کچھ دنوں کے بعد ایسا ہوا کہ اچھا خاصہ مجمع رہنے لگا۔ اِس بات سے لوگوں کو استعجاب ہوتا کہ ایک کم سن لڑکا، بے باکانہ تقریر کر رہا ہے، لیکن اب تک کوئی ایسی باقاعدہ تقریر، جسے لکچر کہا جائے کسی باقاعدہ جلسے میں کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

رضا علی وحشت

سنہ ۱۹۰۱ئہ میں ندوۃ العلماء کا جلسہ ہوا، اور حسرت اتنا حس علماء سے دو بدو گفتگو کرنے میں مانع نہ ہوئی، لیکن تقریر کی جرأت نہ کرسکا۔ تقریباً اسی زمانے کی بات ہے کہ مولوی رضا علی وحشت اور کچھ اور نوجوان طلبہ، جن سے شاعری کی وجہ سے رسم و راہ تھی، انھوں نے کرایہ میں ایک انجمن "انیس الاسلام" کے نام سے قائم کی۔ مقصود اس سے تقریر و تحریر کے ذوق کی ترویج و ترقی تھا۔ نواب شمس الہدیٰ، جو اس وقت نواب نہ ہوئے تھے، اِس کے صدر تھے۔ انجمن کے لیے ایک بڑا کمرہ اور ضروری فرنیچر مل گیا تھا، لیکن بڑے جلسے اُن کے نئے مکان میں ہوا کرتے تھے۔

پہلا لکچر

سب سے پہلے ایک باقاعدہ لکچر کی صورت میں مجھے تقریر کرنے کا وہیں اتفاق ہوا۔ ان لوگوں نے مجھ سے شرکت کی درخواست کی اور ایک دن میں گیا۔ پہلے سے نہ تو کوئی موضوعِ خاص معلوم تھا اور نہ تقریر کا ارادہ تھا۔ محض شرکت مقصود تھی، لیکن وہاں لوگوں نے اصرار کیا اور جس موضوع پر ایک دو مقرروں نے تحریر پڑھی تھی، میں نے اُسی پر ایک مختصر تقریر کردی۔ اِس تقریر کا مجمع پر غیر معمولی اثر پڑا اور لوگوں نے اصرار کیا کہ انجمن کا ایک خاص جلسہ صرف میری تقریر کے استماع کے لیے منعقد ہو، چنانچہ ہفتہ بھر بعد وہ جلسہ منعقد ہوا۔ جلسہ نواب شمس الہدیٰ کے مکان میں منعقد ہوا۔ انجمن کے معمولی شرکا کے علاوہ ایک غیر معمولی تعداد وکلا اور تعلیم یافتہ اشخاص کی بھی اکٹھی ہوگئی تھی۔

گزشتہ یوم کے جلسے میں چونکہ مذہب کی ضرورت کے موضوع پر تقریریں ہوئی تھیں، اور کوئی دقیق بات نہیں کہی گئی تھی، اس لیے اِسی موضوع پر میں نے لکچر دیا، جو تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہا۔ لکچر محض زبانی اور بلا نوٹ کے تھا۔ لوگ بے انتہا متاثر ہوئے اور مولوی شمس الہدیٰ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اِس وقت تک بڑے بڑے مسّن اسپیکروں سے بھی ایسی تقریر نہیں سنی۔ اِس کے بعد مجھے خود بھی زیادہ دلچسپی ہو گئی۔ اِس انجمن کی مجالس کے دائرے میں زیادہ توسیع کرائی اور نسبتاً بڑے بڑے جلسے ہونے لگے۔

اس کے بعد ایسا ہوا کہ شہر کے جلسوں میں بھی میں تقریر کرنے لگا۔ بھائی مرحوم نے بھی انجمن مذکور میں تقریریں کی تھیں، اور وہ بھی برابر اِس میں ترقی کر رہے تھے۔ ایک شخص منشی تصدق حسین تھے۔ انھوں نے نئی زمین خریدی اور مکان بنایا اور ارادہ کیا کہ ایک ریڈنگ روم اور مکتب خانہ قائم کریں۔ یہ والد مرحوم کے مرید تھے۔ مجھے معلوم ہوا، تو میں نے اُن کے اس خیال کو اور مضبوط کرنا چاہا، چنانچہ اُس کے بھی جلسے ہونے لگے۔ اس میں بھی ہم دونوں تقریریں کرتے تھے۔

والد کی توبیخ

ابھی تک والد مرحوم کو ہماری اِن بلند پردازیوں کا حال معلوم نہ تھا، لیکن منشی تصدق حسین والے معاملے کی وجہ سے یہ بات اُن کے گوش گزار ہو گئی، اور بہت سے لوگوں نے آکر اصرار کرنا شروع کیا کہ اُنھیں اجازت دیجیے کہ ہم جلسے منعقد کریں اور یہ وعظ کہیں۔ والدِ مرحوم اس پر راضی نہ تھے، اور نہ ہماری تعلیمی زندگی

ہیں اسے پسند کرتے تھے ۔ لوگوں کو تو ٹال دیا، مگر ہمارے حصے میں تعریف کی جگہ زجر و توبیخ آئی! تاہم ہماری لکچر بازیوں کا سلسلہ بڑھتا ہی گیا۔ اسی شوق کا نتیجہ "انجمن الاصلاح" اور دار الاخبار بھی تھا، جس کا حال بیان کر چکا ہوں۔ اس کے جلسوں کا حلقہ زیادہ وسیع تھا۔ اتنے ہی عرصے میں شہر میں بڑی شہرت ہو چکی تھی، اور شوق و نصیحت دونوں جذبے لوگوں میں کام کر رہے تھے ۔ اس کے جلسے ہفتے وار ہوتے تھے ۔ اچھا مجمع ہو جاتا، اور ہر طرح کی تقریریں ہوتی تھیں ۔ علمی و ادبی موضوع بھی اور سامعین کی تشویش و تحریک کے مطالب بھی ۔

کانفرنسیں

لیکن جو شوق، تقریر کا پیدا ہو گیا تھا، اُس کے لیے یہ محدود میدان کافی نہ تھے ۔ طبیعت چاہتی تھی کہ ملک کی مشہور کانفرنسوں، پلیٹ فارموں پر کھڑے نظر آئیں ۔ اس زمانے میں بڑی قومی مجلسیں، جو ہر سال منعقد ہوتی تھیں، دو تھیں: علی گڑھ کی ایجوکیشنل کانفرنس اور لاہور کی انجمن حمایتِ اسلام ۔ اُردو کے تمام بڑے بڑے مقررین انہی دونوں مجلسوں میں تقریریں کرتے تھے، جن کی تقریروں کا حال ہم رپورٹوں میں پڑھتے تھے ۔ ایک عجیب ولولہ دل میں پیدا ہو گیا تھا ۔ مولوی نذیر احمد، نواب محسن الملک، مولانا شبلی، مولانا حالی، ان ناموں میں میرے لیے ایک خاص کشش پیدا ہو گئی تھی ۔ ۹۹ء میں جب کلکتے میں علی گڑھ کانفرنس کا جلسہ ہوا ہے، تو ہم لوگ بمبئی میں تھے، اس لیے اس کے دیکھنے کا موقعہ نہ ملا ۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں کا حال اخباروں میں پڑھتے تھے، اور اس کی بھی نظروں میں بڑی وقعت تھی ۔

انجمن حمایت اسلام میں لکچر

اِس اثنا میں انجمن حمایت اسلام کے جلسے کا زمانہ آگیا۔ اخباروں میں اُس کا پروگرام چھپا اور طبیعت میں بے اختیار ایک جوش سا اُٹھا کہ کسی نہ کسی طرح اِس میں شریک ہوں۔ اُس وقت یہی چیزیں تمام تر دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں۔ یہ ممکن نہ تھا کہ والدِ مرحوم جانے کی اجازت دیتے۔ تقریباً یہ بات محال تھی۔ اب میں نے ارادہ کیا کہ پوشیدہ چل دینا چاہیئے۔

چند خاص دوستوں سے ذکر کیا اور ایک دن شب کو ایک جوڑا کپڑا لے کے لاہور کا ٹکٹ لے لیا، اور پنجاب میل میں بیٹھ گیا۔ اُس زمانے میں گورنمنٹ آف انڈیا کلکتے میں تھی اور تمام آفس شملے جاتے اور پھر کلکتے میں آیا کرتے تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا میں پنجاب کے کچھ لوگ اسسٹنٹ تھے اور کلکتے میں ایک دو مرتبہ اِن سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نام بھول رہا ہوں، ایک شخص جالندھر کے تھے اور اردو اخبارات و رسائل کا بہت شوق رکھتے تھے، یہ لوگ بھی شملہ جا رہے تھے، کیونکہ مارچ کا اختتام تھا۔ جس درجے میں میں جا کر بیٹھا، اُس میں یہ لوگ بھی تھے۔

خیر، اِن کی وجہ سے لاہور تک کا سفر بہت اچھی طرح کٹا، اور میں انجمن کے مہمانوں میں ٹھہر گیا۔ میں نے پہلے سے شیخ عبدالقادر کو خط لکھ دیا تھا۔ اور منشی محبوب عالم کو بھی اطلاع دے دی تھی۔ لسان الصدق کی وجہ سے یہ لوگ واقف تھے، اور شیخ عبدالقادر سے ندوۃ العلماء کے موقع پر ملاقات ہو چکی تھی۔

خیر وہاں اِن سب لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ تیسرے دن شب کو انجمن کا بڑا

پُر رونق اجلاس تھا۔ مولانا نذیر احمد ہی اِس اجلاس کے صدر تھے۔ وہی وقت میری تقریر کے لیے رکھا گیا تھا۔ میں نے لیکچر دیا اور لوگوں پر اور تمام جلسے پر ویسا ہی اثر ہوا، جیسا متوقع تھا۔ لیکچر کے بعد یہ حالت تھی کہ ہر شخص میرا ہی متجسس اور میری ہی نسبت مُستفسر تھا۔ نہ صرف لاہور بلکہ پنجاب کے اکثر شہروں میں بہت جلد اس کا چرچا پھیل گیا، کیونکہ انجمن کے جلسے میں ہر جگہ کے لوگ آئے ہوتے تھے۔ اب لوگوں کے خطوط ہر مقام سے آنے لگے اور بعض مقامات سے لوگ لینے کے لیے آ گئے۔ میں امرتسر، جالندھر، ہوشیار پور وغیرہ مقامات میں گیا اور ہر جگہ لیکچر دیے، اور لوگوں نے بہت ہی شوق و ذوق سے استقبال کیا۔ یہ دراصل پہلا موقعہ تھا کہ کسی بڑی کانفرنس میں میں نے تقریر کی۔ اِس کے بعد پھر برابر تقریروں کا اتفاق ہوتا رہا۔

انجمن میں دوسرے سال پھر گیا اور تقریر کی۔ مولانا حالیؔ مرحوم سے ملاقات کا حال پہلے کہہ چکا ہوں، جو اِس سے پہلے سفر لاہور میں حاصل ہوئی تھی۔ اُس وقت کے اکثر مشہور آدمیوں سے اِسی طرح واقفیت ہوئی۔ بڑی دقت یہ تھی کہ میری کم سنی کی وجہ سے باوّل نظر کوئی غیر معمولی توجہ کا مستحق نہ سمجھتا تھا، اِس لیے مجھے زبان کھولنی پڑتی تھی۔ پھر استعجاب و توجہ دونوں باتیں حاصل ہو جاتیں۔ مولانا نذیر احمد مرحوم سے بھی پہلی مرتبہ اِسی سفر میں ملا۔ اُس زمانے میں ڈاکٹر اقبال کی شاعری کو مخزن نے نیا نیا ملک کے سامنے پیش کیا تھا، لیکن بہت جلد ہی لوگوں میں غیر معمولی شہرت ہو گئی تھی۔ انجمن میں اُن کی نظم خوانی خاص طور پر شوق و ذوق سے سُنی جاتی تھی۔ اُن سے بھی پہلی مرتبہ اِسی سفر میں ملاقات ہوئی۔

مناظرے

بمبئی میں ایک نیا مشغلہ تقریر و مجالس کا پیدا ہو گیا تھا، اور وہ بھی کئی اعتبار سے مفید ہی ہوا۔ دوسری مرتبہ جب بمبئی گئے، تو وہاں مشنریوں کے پریچنگ ہال بکثرت کھل گئے تھے۔ آریہ سماج کی شاخیں بھی مختلف حصّوں میں قائم تھیں، اور چند مشہور مشنری اسپیکر باہر سے آئے ہوئے تھے۔ پنجاب کے پُرانے نومسیحیوں میں ایک شخص منصور مسیح تھے۔ یہ پادری رجب علی وغیرہ کے ساتھیوں میں سے تھے۔ فارسی و عربی کی بھی استعداد تھی۔ کتابیں بھی دیکھی تھیں، اور مشنری طریقوں میں بھی اچھا درخور رکھتے تھے۔ انھوں نے بھی ایک پریچنگ ہال قائم کر رکھا تھا۔ ہفتے میں دو مرتبہ عام جلسے ہوتے تھے اور مسلمانوں کو چیلنج دیئے جاتے تھے۔

بمبئی میں مسلمانوں کی جو اونچی اور تعلیم یافتہ جماعتیں ہیں، وہ عام مسلمانوں سے بالکل الگ ہیں۔ اور اُن میں اُس وقت تک انجمنوں اور مجالس کی زندگی بالکل ہی ناپید تھی۔ اور اب بھی بمقابلہ دیگر حصص ہند ناپید ہے۔ البتہ عام مسلمانوں میں سے چند آدمیوں نے ایک انجمن "ضیاء الاسلام" بنا رکھی تھی۔ علی خاں ایک مستعد آدمی تھا اور زیادہ کوشش اسی نے کی تھی۔ یہ گویا مشنریوں اور آریہ سماج کا جواب تھا۔ اس کے بھی ہفتہ وار جلسے ہوتے تھے۔ ہم نے اِن سب میں شرکت شروع کر دی، اور چونکہ سرگرم تقریریں ہونے لگیں، اِس لیے لوگوں میں بھی ایک نئی دلچسپی پیدا ہو گئی اور بکثرت لوگ آنے لگے۔

اِس سے یہ بھی فائدہ ہوا کہ بحث و مناظرے کی وجہ سے دیگر مذاہب کی نسبت معلومات میں ترقی ہوئی، علی الخصوص عیسائیوں اور آریوں کی نسبت۔

تقریباً جس قدر مخالفین اسلام کے مشہور اعتراضات ہیں، وہ سب معرضِ بحث میں آتے تھے اور نئے نئے اعتراضات سے بھی مقابلہ کا اتفاق ہوتا تھا۔ آریہ سماج کے بھی بعض مشہور مشنری پنجاب وغیرہ سے بلائے گئے اور اُن سے بھی مباحثے جاری رہے۔ ایک دو مباحثوں نے بہت طول پکڑا۔ کئی ہفتے تک جاری رہے۔ سامعین کا مجمع اس قدر بڑھ جاتا تھا کہ کئی بار سڑک کی آمد و رفت رک گئی۔ بھائی مرحوم بھی بڑے سرگرم مباحثہ کرنے والے تھے۔

یارباش پادری

اس زمانے میں میں نے بائبل کا مکمل مطالعہ کیا اور مسیحی مصنفین کی تفاسیر و شروح سے جس قدر واقفیت حاصل کی جا سکتی تھی، حاصل کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مذہبی خیالات میں بھی جنبش ہو چکی تھی، اس لیے قطع نظر ضروریاتِ مناظرہ خود بھی طبیعت میں طلب و جستجو تھی۔ ایک اچھا قابل اور یورپ کے مدارسِ الہیات کا سند یافتہ، رچرڈ بال دمشق کا مسیحی پادری تھا۔ عرصے تک انگلستان و فرانس میں رہا تھا۔ عربی میں کئی مشنری کتابیں اس نے لکھی ہیں اور بعضوں کا علمائے عراق نے جواب بھی دیا ہے۔ ایک کتاب "الہدیٰ" کے نام سے بیروت میں چھپی ہے، اور اسی کے رد میں ہے۔

ابتدا میں تو اس سے مباحثے رہے۔ ایک مباحثہ کئی ماہ تک جاری رہا، لیکن بعد کو بڑی دوستی ہو گئی۔ جلسے میں مباحثہ رہتا اور مکان میں گپ شپ ہوتی۔ وہ بھی بڑا یارباش آدمی تھا۔ سوسائٹی اور کھانے پینے کا بڑا شائق۔ مجھے مسیحی مذہب کی معلومات میں اس سے بڑی مدد ملی۔ قدیم و جدید مسیحی متکلمین کے جتنے اسکول ہیں اور مختلف مشرب کے

مفسرین عہدِ قدیم و جدید نے جو کچھ لکھا ہے، وہ سب اُسے مستحضر تھا۔ میں نے سرسید کی تبیین الکلام کی بعض بحثیں اُسے سُنائیں تو اِس پر اُس نے مفسرین توراۃ کے حوالوں پر حوالے دینا شروع کر دیے اور سینکڑوں موافق و مخالف رائیں سُنا دیں۔ معلوم ہوا کہ سرسیّد کے پیش نظر بجز ایک دو شرحوں کے اور کوئی کتاب نہ تھی۔ اس سلسلے میں کچھ اور تفصیلات ہیں، لیکن اُنھیں اپنی مذہبی زندگی کی سرگزشت میں کہوں گا۔

دہری سے مقابلہ

اخبار بین لوگوں کو غالباً یاد ہوگا، ایک امریکن دہری اِس زمانے میں آیا تھا۔ ہندستان کے تمام بڑے شہروں میں گیا تھا، اور ہر جماعت کے مذہبی حلقوں میں اُس کی بے باکانہ زبان درازیوں کا بڑا چرچا پھیل گیا تھا۔ مشنریوں پر تو ایک مصیبت آگئی تھی۔ وہ امریکا کی اُس سوسائٹی کا ایجنٹ تھا، جو سرے سے مسیح کے وجود ہی کی منکر ہے۔ "مسیح اِز نتھنگ" اس کا موٹو ہے۔ اس پر اُس نے کتابوں کی ایک سیریز شائع کی ہے اور بُنیادیں قائم کی ہے کہ نہ تو مسیح کا کوئی وجود ہے اور نہ اُن تمام واقعات کا، جو اناجیل میں بیان کیے گئے ہیں۔ اُسی عہدِ قدیم میں مذہبی فقرا کی ایک مخفی برادری قائم ہوئی تھی۔ پہلے اسکندریہ میں، اور پھر تمام شام میں پھیل گئی۔ "سفید پوش برادری" یہ اُسی کی ایجاد ہے۔ اِنھوں نے وقت کے بعض مذہبی و سیاسی مصالح کے لیے یہ افسانہ (مسیح کا افسانہ) گھڑا اور دنیا نے قبول کر لیا۔ مصر کے بعض قدیم کھنڈروں اور خانقاہوں سے قدیم یونانی میں بعض کتابیں ملی ہیں، اور گویا اِنھی

آثار قدیمہ سے دنیا پر یہ سب سے بڑا راز فاش ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے افسانے ہیں، جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اور تمام بحثوں اور کاوشوں سے بچنے کے لیے مناسب تدبیر یہ دیکھی کہ سرے سے بنیاد ہی ڈھا دی جائے۔ جب مسیحؑ ہی کا وجود نہ رہا، تو پھر وہ تمام عقائد بھی فنا ہو گئے، جو صلیب، کفارہ، اور تثلیث پر مبنی ہیں۔ یہ اس سوسائٹی کا مشنری تھا اور ایک مکروہ صورت شخص تھا، مگر بڑا ہی لسان اور چرب زبان۔ تمام دنیا میں پھر چکا تھا اور ایک درجن زبانیں جانتا تھا۔ جب لکچر دیتا تھا، تو سننے والے ہکّے بکّے رہ جاتے تھے۔ بمبئی میں اس نے تمام گلی کوچوں میں تقریریں کرنا شروع کر دیں اور خاصتہً پادریوں کو چیلنج دیا۔ ابتدا میں کچھ کچھ ٹھہرے لیکن پھر اس طرح بھاگنے لگے کہ یہ ایک ایک مشن ہال میں اُن کا تعاقب کرتا اور وہ منھ چھپاتے پھرتے!

ایک اور باک تھا۔ یو۔پی کا باشندہ اور نومسیحی۔ اس کا بھی پریشان حال تھا، اور وہی وجہ معیشت تھی۔ اس نے مجھے مجبور کیا کہ کسی طرح اُس (دہری) کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ اُس کا چیلنج صرف مسیحیت کو نہیں ہے بلکہ تمام مذاہب عالم کو۔ چنانچہ میں نے اُس سے بحث شروع کر دی۔ ساتھ ہی اُس کی قیام گاہ پر جا کر اُس سے ملنے بھی لگا۔ اُس نے بہت سے معتقد اپنے پیدا کر لیے تھے، خاصتہً پارسی اور ہندو طلبہ میں۔ جب کچھ صحبت جاری رہی، تو مجھے معلوم ہوا کہ علمی معلومات اور برہانی قوت میں کوئی غیر معمولی قابلیت نہیں ہے، اور محض قوّتِ بیانیہ کے زور سے غیر معمولی شہرت حاصل کر لی ہے۔ اُس سے تقریباً دو ہفتے تک مسلسل بحث ہوتی رہی اور ابھی اور بھی

ہوتی، لیکن وہ اچانک کلکتہ چلا گیا۔

عرصے کے بعد جب میں کلکتہ آیا تو پھر ایک دن اُس کا غلغلہ سنا۔ اُس زمانے میں ولنگٹن اسکوائر میں پادریوں کے وعظ ہوتے تھے۔ اُس نے وہاں سب کو ایک ہی دن میں پریشان کر ڈالا۔ اب پھر میں نے اُس سے گفتگو کرنا چاہی، مگر اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ سرِ دست میرا مقابلہ عیسائی مشنریوں سے ہے۔ اگر اُن کی طرف سے گفتگو کرو تو میں تیار ہوں۔ میں نے کہا کہ میں تو نفسِ مذہب کا مدافع ہوں۔ اِس پر اس نے گفتگو کرنے سے انکار کر دیا۔ لوگوں پر اس کا بڑا اثر پڑا اور میں نے دیکھا کہ نوجوانوں کا جو جمگھٹا اُس کے اِردگرد رہتا تھا، اُس میں اب وہ صولت و سطوت باقی نہ رہی۔ اُس زمانے میں ہیبٹسٹ مشن کا ایک مشہور پادری جیمیس تھا، میں مزاحاً اُسے جمال الدین کہا کرتا تھا۔ اُس سے بڑی ملاقات تھی۔ کتنے ہی بائبل کی قیمتی اور متنوع ایڈیشن، خوبصورت جلدوں کی لالچ میں میں نے اُس سے وصول کر لیے۔ اس سے بھی مباحثہ رہتا تھا، میں مباحثے میں ولادتِ مسیح اور صعودِ مسیح سے گریز کر جاتا تھا۔ مجھ پر تو اس زمانے میں سرسیّد کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ اِس سے پادری بڑے جز بز ہوں، کیونکہ مسلمانوں سے بحث کرتے ہوئے اُن کا بڑا استدلال، مسلمانوں کے مُسلّمات سے ہوتا ہے۔ اُس دن (یعنی دہری سے مباحثے کے دن) جیمیس بھی تھا۔ اُسے اِس پر بڑی خوشی ہوئی کہ اُس کے حریف نے باوجود میری آمادگی کے خود ایک طرح کا گریز کیا۔ چنانچہ اس نے میرا بڑا شکریہ ادا کیا اور مشن کے جرنل میں میری بڑی تعریف چھاپی۔

مرزا صاحب قادیانی

سفرِ پنجاب میں میں قادیان بھی گیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی مرحوم کے دعاوی اور بعض رسالے دیکھ چکا تھا۔ طبیعت میں ہر نئی بات کے تجسّس اور واقفیت کا شوق تھا ہی، خیال ہوا کہ اِنھیں بھی دیکھنا چاہیے، چنانچہ بٹالہ گیا اور وہاں سے قادیان روانہ ہوا۔ سخت گرمی شروع ہو چکی تھی اور سڑک بالکل کچی تھی۔ بڑی تکلیف ہوئی۔

وہاں پہنچا تو قصبے کے باہر ہی ایک باغ میں اُتارا گیا۔ معلوم ہوا کہ مرزا صاحب اور اُن کے وابستہ اشخاص یہیں مقیم ہیں۔ اس سال مشہور کانگڑے کا زلزلہ آیا تھا۔ اور اس کے بعد عرصے تک کچھ کچھ وقفے کے بعد زلزلوں کا ظہور ہوتا رہا تھا۔ یہ زیادہ نقصان رساں نہ تھے، لیکن آیندہ کے لیے کھٹکا پیدا ہو گیا تھا۔ زلزلے ہی کی وجہ سے مرزا صاحب عمارات چھوڑ کے باغ میں آ گئے تھے۔

شام کو مغرب کے بعد پہنچا۔ یکّے والا مرزا صاحب کا مرید تھا، اس لیے وہ ٹھیک منزلِ مقصود پر لے گیا۔ انجمن کے جلسے میں قادیان کے کئی شخصوں سے ملاقات ہو گئی تھی۔ انھی میں مولوی یعقوب علی ایڈیٹر "الحکم" بھی تھے۔ اُنھوں نے بھی حسبِ عادت بہت اصرار کیا تھا کہ میں قادیان جاؤں، اور وعدہ لیا تھا کہ روانگی سے پہلے اطلاع دے دینا، لیکن میں نے کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔

ایک درخت کے نیچے چارپائی پر مولوی عبدالکریم مرحوم بیٹھے تھے۔ میں نے اُن کی بیساکھی سے جو پاس پڑی تھی، پہچان لیا کہ مولوی عبدالکریم یہی ہیں۔ کیونکہ میں پہلے سُن چکا تھا۔ اُن کے بعض عزیز والدِ مرحوم کے مرید تھے اور کلکتے میں ذکر

کہا کرتے تھے۔ میں اُن سے ملا اور اپنے آنے کا مقصد مرزا صاحب کی ملاقات بتلایا۔ وہ بڑے اخلاق سے ملے اور فوراً لوگوں سے کہا کہ میرے لئے کھانا لے آئیں اور کہا کہ اِکرامِ ضیف تو ہمارا فرض ہے۔

میں یکّے کے سفر اور کچّی سڑک کی وجہ سے ہچکولوں سے بالکل چُور ہو رہا تھا۔ عشا کی نماز مولوی عبدالکریم کے پیچھے پڑھ کے ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ اور صبح کو چار بجے اُٹھا، تو نماز کے چبوترے پر لوگوں کو نماز صبح کے لیے تیار پایا۔ اور اِس سے طبیعت متاثر ہوئی۔ نماز کے بعد مرزا صاحب باہر نکلے اور ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ معتقدین نے ہر طرف سے ہجوم کیا۔ بعض لوگ پاؤں دبانے لگے۔ انھوں نے مولوی نورالدین مرحوم کو بُلایا۔ میں اُن کا نام مرزا صاحب کی جماعت کے ایک خاص رکن کی حیثیت سے سُن چکا تھا۔ وہ خضاب حنا کی وجہ سے ڈھاٹا باندھے آئے اور مرزا صاحب نے شب گزشتہ کے تازہ الہامات سنانا شروع کیے۔ ایک الہام یہ تھا "اِیّاکَ نَعبُدُ وَاِیّاکَ نَستَعِین" مولوی نورالدین مرحوم سے وہ پوچھتے تھے کہ اِس کا مقصود کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اِس پر یاد نہیں کہ مولوی صاحب نے کیا جواب دیا۔ پھر وہ میری طرف متوجّہ ہوتے اور میرے حالات پوچھتے رہے، اور کہا کہ جب آپ آئے ہیں، تو کم سے کم چالیس دن تک ضرور رہیے۔ اس طرح آنے سے اور جلد چلے جانے سے تو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اِس کے بعد مرزا صاحب اندر چلے گیے۔ اور مولوی عبدالکریم مرحوم نے مجھے پھر مولانا نورالدین مرحوم اور جماعت کے بڑے بڑے لوگوں سے ملایا۔ نواب محمد علیؒ مالیر کوٹلہ کے بھی وہیں تھے۔ جمعہ کی نماز وہیں ایک میدان میں ہوئی۔ میں گیا تو لوگوں نے مجھے پہلی صف میں جگہ دی۔

اتنے میں مرزا صاحب آئے اور منبر کے جنب میں امام کے مُصلّے پر بیٹھ گئے۔
اُس وقت مولوی عبدالکریم مرحوم نے خطبہ دیا۔ خطبے کا موضوع یہ تھا کہ بہت سی برکتیں، جو انبیائے سلف کے حصے میں نہیں آئیں، اُن سے خدا نے مرزا صاحب کو سرفراز فرمایا۔ ازانجملہ یہ کہ اعلان و تبلیغِ رسالت کے یہ وسائل اُن انبیا کے زمانے میں کہاں تھے۔ ریل، تار، ڈاک، گرموفون، اخبارات، پریس۔ اِن وسائل سے کس طرح ہر صدا مشرق و مغرب میں پھیلائی جاسکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

نماز بھی مولوی عبدالکریم نے پڑھائی، اور مرزا صاحب صف سے آگے، مگر اُن سے دو اِنچ پیچھے تنہا کھڑے رہے۔ نماز کے بعد پھر میری طرف ملتفت ہوئے اور اصرار کیا کہ میں چندے قیام کروں۔ میں نے معذرت کی اور اُسی دن روانگی کا ارادہ ظاہر کیا۔ میرا مقصود اِس سفر سے صرف وہاں کا طور طریقہ دیکھ لینے کا تھا، تاکہ معلومات سے باہر یہ معاملہ باقی نہ رہے۔ اِس سے زیادہ کوئی خواہش نہ تھی۔ وہاں یہ کوشش بھی کہ میں کوئی معین خیال بھی ظاہر کروں۔ مرزا صاحب نے کئی باتیں اپنے دعاوی اور منصب کی نسبت ایسی کہیں، جو سامع کو نفیاً یا اثباتاً کسی جواب پر مجبور کرنے والی تھیں، لیکن میں خاموش رہا۔

اُنھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میری تمام کتابیں تم نے دیکھی ہیں؟ جو رسائل دیکھے تھے اُن کا ذکر کیا۔ اِس پر اُنھوں نے چند کتابیں مجھے دینے کے لیے مولوی محمد صادق ایڈیٹر "بدر" سے کہا، جو اِس صحبت کے نوٹ لے رہے تھے۔ اُنھوں نے وفاتِ مسیح کا بھی ذکر چھیڑا اور کہا کہ یہی مسئلہ ہے جس کے اعلان نے کسرِ صلیب کی خبر پوری کردی۔ اس پر میں نے کہا کہ اگر ایسا ہے، تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ سے پہلے بعض

مفسرین مثلاً صاحب "اسرار الغیب" اور اس عہد میں مولوی چراغ علی اور سر سید اس کا بڑے زور شور سے اعلان کر چکے ہیں۔

یہ بات اُن پر گراں گزری۔ انھوں نے کہا، چراغ علی اور سر سید نے جو کچھ کہا، وہ محض مادّی رنگ میں تھا اور میں نے اسے روحانی رنگ میں ثابت کیا ہے۔

یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی، لیکن میں بحث کا رویّہ اختیار نہیں کرنا چاہتا تھا، اور نہ کوئی اِس طرح کا جذبہ اپنے اندر رکھتا تھا۔ میرے خیالات اُس وقت سر سیّد کی تقلید پر مبنی تھے، اس لیے اُن کے مشن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اِس کے بعد کچھ دیر تک مولوی نورالدین مرحوم اور بعض دیگر وہاں کے اعیان سے میں ملا۔ واپسی میں نواب محمد علی نے اپنی رتھ بٹالے تک کے لیے دے دی، جو کچّی سڑک پر بہت آرام دیتی ہے، اور واپسی میں مجھے اِس سے بہت آرام رہا۔

عقائد و افکار میں انقلاب

اُن اہلِ علم و معرفت میں جنھوں نے طلب و جستجو کی تمام وادیوں میں قدم رکھا، اور پھر منزلِ مقصود تک پہنچے، ایک امام غزالی بھی ہیں۔ کس قدر تجربہ و صداقت سے بھرا ہوا یہ قول ہے کہ "شک، جستجو کی علّت ہے۔ جستجو سے تحیّر پیدا ہوتا ہے اور تحیّر، وسیلۂ یقین ہے"۔ امام غزالی کا یہ قول اُن کے تمام علم و اختیار کا ماحصل ہے۔ میں اِس قول کی صداقت پر گواہی دینی چاہتا ہوں۔

میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی، جو مذہبی ریاست و پیشوائی رکھتا تھا۔ علم اور طریقت نسلاً بعد نسلٍ، اُس کی وراثت چلی آتی تھی۔ یہ خدامت و

توارُث جہاں بے شمار ایسے محاسن کا باعث ہوتا ہے، جو نَو علم اور نو امتیاز افراد کو حاصل نہیں ہو سکتے، وہاں متوارث و قدیم حکومت و امارت کی طرح طرح کے فکری و ذہنی مفاسد بھی پیدا کر دیتا ہے۔ ایک قدیم دولتمند خاندان، ایک قدیم شاہی نسل، جس طرح اجتماعی امراض میں مبتلا ہو جاتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ علم و ریاستِ دین کا امتداد و توارُث بھی فکری امراض پیدا کر دیتا ہے۔ دونوں کی حالت تقریباً یکساں ہے۔ پُرانا بادشاہی خاندان، جوہر ذاتی کی جگہ محض نسلی تفوّق اور متوارث دولت پر اعتماد کرتا ہے۔ اسی طرح قدیم علمی خاندانوں میں بھی عموماً ذہنی تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ آبائی شہرت، خاندانی دولت کی طرح ورثے میں ملتی ہے، اس لیے ذاتی کاوش و محنت کا ولولہ معدوم ہو جاتا ہے۔

پیری و طریقت

پیری و طریقت کے خاندانوں میں تو یہ حالت اور زیادہ گہری اور شدید ہو جاتی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ علم و عمل میں روایتی قدامت، سخت تقلید اور جزم و صلابت پیدا کر دیتی ہے۔ اور تمام آبائی عقاید و افکار، ایک نسلی رسم بن کر ذہن و دماغ پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ دوسری صورتوں میں ایک شخص کے لیے صرف قوم، جماعت یا سوسائٹی کے عقائد و رسوم کی تقلید درپیش ہوتی ہے، لیکن قدیم خاندانوں میں تو اُن کا دائرہ اور روایت ایک مزید تقلیدی حد پیدا کر دیتی ہے، جس کو توڑنا اور جس سے باہر قدم نکالنا محال ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح دولت و امارت میں زیادہ عرصے تک توارث نہیں رہتا، اُسی طرح علم بھی بہت کم اپنی صحت و ترقی

کی حالت میں ایک دو نسلوں سے زیادہ قائم نہیں رہتا ہے۔ ہمارے حکیم ابن خلدون نے تو لبطور قاعدے کے تین نسلوں میں محدود کر دیا ہے۔ یہ تحدید تو مشاہدہ و تجربے کے خلاف ہے، اور بلا شبہ صدیوں تک علمی توارث رہا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مفاسد کا ظہور بھی ساتھ ساتھ ہوتا رہا ہے۔

میں نے اپنے خاندان میں اس چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کے محاسن و سیئات کا ذاتی تجربہ کیا۔ میں خاندانی قدامت کے محاسن کو بھی بہتر جانتا ہوں، اور مفاسد کا بھی سب سے زیادہ زخمی ہوں، تاہم میں نہیں سمجھتا کہ اسے بطریق تعلیل و توجیہ کس بات سے منسوب کر دوں کہ باوجود سخت مُہلکات و موبقات میں مبتلا ہو جانے کے کسی نہ کسی طرح میری کشتی کنارے تک پہنچ گئی!

میرے خاندان پر پیری و طریقت کا رنگ غالب تھا، اور بحیثیت مجموعی بزرگوں کی حیثیت ایک عالم ہی کی نہ تھی، بلکہ ایک پیر اور صاحبِ سجّادہ و طریقہ کی بھی، اس لیے آنکھ کھولتے ہی سب سے پہلے جو صدائیں کانوں میں پڑیں، اور جو منظر چاروں طرف دیکھا وہ سرتاسر انسانی اطاعت، ارادت و عقیدت اور پرستش و تعبّد کا تھا۔ ہم نے سب سے پہلی بات جو اس دنیا میں نمایاں طور پر دیکھی، وہ یہ تھی کہ بڑے بڑے انسان آتے ہیں اور ہمارے بزرگوں کے اور ہمارے ہاتھ پاؤں چومتے ہیں!

معتقدین و مریدین کا طرزِ عمل ہمارے خاندان میں یہ رہتا تھا کہ ہر شخص، جو والد مرحوم سے ملنے کے لیے آتا، تو پہلے سلام کے بعد کھڑے ہی کھڑے جھک کر اُن کا ہاتھ چومتا اور آنکھوں پر لگاتا۔ اس کے بعد بیٹھ جاتا اور دو زانو ہو کر اُن کے قدم چومتا۔ زیادہ عقیدت مند تو جب تک دونوں پاؤں چوم نہ لیتے سیر نہ ہوتے۔

اِس کے بعد دور فاصلے پر دو زانو، جس طرح التحیات میں بیٹھتے ہیں، ہاتھ باندھ کے بیٹھ جاتا۔ گرمیوں میں پنکھا جھلنے لگتا، لیکن اس طرح کہ ایک ہاتھ پنکھے پر اور دوسرا ہاتھ، ہاتھ باندھنے کے موضع پر، آنکھیں نیچی رہتیں، اور بڑے سے بڑا معزز آدمی بھی آنکھ ملا کر کبھی بات نہ کرتا۔ جو بات اُن کی زبان سے نکلتی "درست، بجا" کا کلمہ فوراً نکلتا۔ چلتے وقت پھر اُسی طرح دست بوسی اور قدم بوسی ہوتی، اور دروازے تک رجعتِ قہقری کرتے ہوئے، ہاتھ باندھے ہوئے، سر جھکائے ہوئے واپسی ہوتی مجھے ایک شخص بھی یاد نہیں جو پیٹھ مُوڑ کر گیا ہو۔

پیرزادے

ہم چونکہ پیرزادے سمجھے جاتے تھے، اِس لیے ابھی بالکل بچے ہی تھے کہ یہ عمل ہمارے ساتھ بھی ہر شخص کرتا تھا۔ اگر ہم والد کی خدمت میں حاضر رہتے، تو وہ اُن کے ہاتھ پاؤں چوم کر پھر اُسی طرح ہمارے ہاتھ پاؤں چومتا۔ اگر تنہا ہوتے، جب بھی ہمارے ہاتھ پاؤں چومے جاتے۔ مکّے سے جب میرے ماموں زاد بھائی "محمد سعید آئے"، تو لوگ اُن کے بھی ہاتھ پاؤں چومتے تھے۔ حافظ ولی اللہ مرحوم، والد کے قدیمی خادم و مرید تھے، لیکن چونکہ اُنھیں والد سے خدمت کی نسبت تھی، اس لیے ہم دیکھتے تھے کہ سب نہیں، مگر بہت سے لوگ اُن کے بھی ہاتھ پاؤں چومتے ہیں، گویا ہر وہ شخص جو ہم سے نسبت رکھے، ایک مافوق العادت انسانی تعظیم کا مستحق ہے!

بچپن میں ہمارے دماغ پر یہ نقش بیٹھ گیا۔ کبھی اس کا گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ بات کیوں ہے؟ دل پر اثر یہی تھا کہ یہ قدرتی بات ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہیے،

اور کوئی وجہ نہیں کہ نہ ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں بہت چھوٹا تھا، لیکن میرے ذہن میں یہی بات تھی کہ جب کوئی ہاتھ پاؤں والا مخلوق میرے پاس آئے، تو یہ ضروری ہے کہ وہ میرے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دے!

حافظ صاحب کبھی کبھی پھرانے کے لیے باہر لے جاتے، تو قدم قدم پر رُکنا پڑتا۔ لوگ دکانوں سے اُٹھ کر، یا راستوں میں چلتے ہوئے گھیر لیتے اور ہاتھ پاؤں چومنے لگتے، سڑک ہے، کیچڑ ہے، گرد و خاک ہے، اِس لیے صرف ہاتھ چومنے پر اکتفا کریں۔ نہیں، کتنے ہی صاف کپڑے پہنے ہوں، وہ زمین پر گر جاتے تھے اور ہماری جوتیاں چومنے لگتے تھے بعض مسکین اور خود رفتہ ارادت مند ایسے تھے کہ جو ہماری جوتیوں کے تلے پر ہتھیلی مل کر اس کی خاک اپنے منھ پر مل لیتے۔

اب میں اِن باتوں کو سوچتا ہوں تو شرم و انفعال سے میری رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے۔ لوگ ایسا کرتے تھے اور ہم اِسے بالکل ایک قدرتی بات سمجھتے تھے۔ عید کے دن یہ منظر سب سے زیادہ قابلِ دید ہوتا تھا۔ ہزاروں آدمی، مسجد یا عیدگاہ میں پاؤں پکڑتے تھے۔ عید کے قیمتی اور زرّیں جوڑے پہنے ہوئے ہیں عطر لگائے ہوئے ہیں، لیکن مظلوم، مسکین، قابلِ رحم انسان، میں سوچ کر کس قدر کڑھتا ہوں ـــ کہ کیچڑ بھری ہوئی زمین پر زانو رکھ کر گر جاتے تھے، اور پاؤں نہیں جوتوں کو چومتے تھے۔ وہ خاک اُن کے چہروں پر لگ جاتی تھی، کیچڑ کے دھبوں سے کپڑے داغ دار ہو جاتے تھے، مگر جوشِ عقیدت میں اُنھیں اِن باتوں کی کچھ پروا نہ ہوتی تھی۔

عقیدت کی مصیبت

مجھے یاد نہیں کہ بچپنے میں کبھی یہ باتیں مجھے بُری معلوم ہوئی ہوں، اور یہ بھی یاد نہیں کہ کوئی خاص دلچسپی ہوئی ہو۔ روزمرہ کا یہی معمول تھا اور طبیعت کے لیے یہ ایک ایسی بات ہوگئی تھی، جیسے عامۃ الورود واقعات، اس لیے طبیعت پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا تھا۔ ہاں اگر کبھی ناگواری ہوتی تھی، تو اُن لوگوں کی قابلِ رحم حرکت پر نہیں، بلکہ اُس تھوڑی سی تکلیف پر، اُن کے ہجوم، جلد بازانہ جوش، اور بعض اوقات بعض سادہ مزاج لوگوں کی بے پروائی سے۔ کبھی سختی سے کوئی ہاتھ جھٹک دیتا، کبھی ایک پر ایک گرتے ہوئے اس طرح ہاتھ پکڑتے کہ ہاتھ میں جھٹکا آجاتا، تو میں سختی سے ان کو ملامت کرتا اور ان کی بدتمیزی پر غصہ آتا۔

ایک بہت پرانی بات مجھے یاد آتی ہے۔ بہت سے لوگ دیہات کے رہنے والے، سیدھے سادھے، اُجڈ آجاتے، اور بے چارے اپنے جوشِ عقیدت میں اپنی سمجھ کے مطابق اظہارِ عقیدت کرتے۔ کوئی ہاتھ پکڑ کے اتنے زور سے دباتا کہ ہڈیاں کھنچ جاتیں، کوئی پاؤں پکڑ کے زور سے کھینچ لیتا، ٹھیک اُس طرح جیسے کسی کو ٹانگ پکڑ کے گھسیٹا جائے، اور پھر اس کے بعد بوسہ دیتا۔ یہاں تک بھی مضائقہ نہ تھا۔

بعض لوگوں کی عقیدت ایک قدم اور آگے بڑھ جاتی تھی۔ نہیں معلوم کیوں، میں اُس وقت بھی کوئی تعلیل نہیں کرسکا، اور اب بھی نہیں کرسکا، لیکن وہ پاؤں کے تلوے چاٹنے لگتے، اور اُن کی گرم زبان میرے تلوے میں لگتی۔ ساتھ ہی یہ تخیّل بھی ہوتا کہ اُن کے منہ کی رال بھی پاؤں پر لگ گئی ہے، اور اس سے مجھے بڑی تکلیف

ہوتی بعض لوگ ہاتھ اس طرح چومتے کہ کم سے کم ایک انچ مربع جگہ لعاب دہن سے
مزدور تر ہو جاتی۔ یہ سب سے زیادہ میرے لیے ناقابلِ برداشت معاملہ تھا۔ میں اسی
وقت جا کے صابن سے ہاتھ دھوتا۔ ایک مرتبہ میں پردے کی ایک بڑی سلوٹ میں
کھڑا ہو کر رونے لگا۔ ہمشیرہ نے پوچھا کہ کیا قصہ ہے، اور میں نے ہاتھ بڑھا کے بتلایا کہ
ایک شخص نے اسے چومتے ہوئے تھوک لگا دیا ہے۔ اب میں ان خبیثوں سے نہیں
ملوں گا! مجھے یاد ہے کہ اس پر گھر میں بڑی ہنسی ہوئی تھی!

تاہم اس میں نزاع نہ تھی اور نہ کوئی اس کا سوال تھا کہ جو کچھ ہوتا ہے، قدرتی
نہیں ہے، یا کیوں نہ ہونا چاہیے۔ جب ذرا اور بڑے ہوئے، تو والد مرحوم کے
ساتھ جمعہ کے دن مسجد بھی جانے لگے۔ وہاں وعظ کے بعد عجب عالم ہوتا تھا۔
ہزاروں آدمی جد و جہد کرتے تھے۔ ایک پر ایک گرتا تھا، چوٹیں کھاتے تھے۔ حادثے
ہو جاتے تھے۔ گر پڑتے تھے: صرف اس بات کے لیے کہ دور ہی سے سہی، مگر ایک
مرتبہ ان کے ہاتھ کو، ان کے دوپٹے کو، ان کے جبّے کے دامن کو چھو لیں، یا اس
چھوٹے ہاتھ ہی کو منھ اور آنکھوں پر رکھ لیں!

لوگوں کو والد مرحوم کی حفاظت کے لیے بڑا اہتمام کرنا پڑتا تھا، اور
فی الحقیقت وہی لوگ سب سے زیادہ تکلیف اس دن اٹھاتے تھے۔ ابھی
وعظ کا فاتحہ اختتام ختم نہیں ہوتا تھا کہ وہ منبر کا احاطہ کر لیتے اور اس کے
بعد اپنے سینوں کی ایک دیوار قائم کر لیتے اور لوگ اندر ہاتھ لے جا کر ان کے
ہاتھ کو بوسہ دیتے۔ آدھ گھنٹہ اس میں نکل جاتا، اور بڑا حصہ مجمع کا باقی رہ جاتا۔
پھر وہ اسی حلقے میں منبر سے دروازے تک آتے اور راستے میں دست بوسی

کے لیے جو لوگوں کا ہجوم اور ایک پر ایک کا گرنا ہوتا تھا، وہ ایک سخت رست خیز ہوتی تھی۔ کوئی جمعہ ایسا نہیں گزرتا تھا کہ ایک دو آمیوں کو سخت چوٹ نہ آتی۔ یہ سب ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے، اور اس کا اثر دماغ پر بھی پڑتا تھا کہ یہ ہمارا قدرتی حق ہے اور عام انسانوں سے ایک ایسے بلند مقام میں ہیں، جہاں سے انھیں ہاتھ بڑھانا اور تمام دنیا کو جھک کر چومنا چاہیے!

جب ذرا اور بڑے ہوئے اور باہر دیوان خانے میں بیٹھنے اٹھنے لگے، تو یہ صورت پیش آئی کہ تمام لوگ حلقہ باندھ کر اور ہاتھ باندھ کر بیٹھتے اور سر جھکا کر ہماری ہر بات پر آمنّا وصدقنّا کہتے، اور معمولی سے معمولی بات کو بھی ایسی عزت و احترام سے سنتے گویا ایک کرامت اور مافوق العادت فضیلت ہے!

محرومیِ علم

سب سے پہلا نتیجہ جو اس حالت کا نکلنا چاہیے تھا، وہ یہ تھا کہ علم سے قطعاً محرومی۔ اسی چیز نے آج تمام خانقاہوں میں پیرزادوں کو علم سے محروم کر دیا ہے۔ جب ریاست و بزرگی بلا محنت و سعی کے خاندانی ورثے میں ملتی ہے، اور بچپن ہی میں قبل از فضیلت و استحقاق وہ قبول و ریاست حاصل ہو جاتی ہے، جو اہلِ فضل و استحقاق کو بھی نصیب نہیں، تو ظاہر ہے کہ نفسِ حیلہ جو پھر کیوں طلبِ علم پر مائل ہونے لگا، اور تحصیل کی مشقتیں برداشت کرنے لگا؟ ابن خلدون نے ٹھیک لکھا ہے کہ ہر قرن میں یہ طبیعتِ اجتماع ہے کہ دولت و علم پرانے خاندانوں سے چھنتی اور نئے خاندانوں میں آتی ہے۔

والدِ مرحوم کو اِس بات کا ضرور احساس تھا۔ وہ اس سے خائف بھی تھے۔ پرانے سے پرانا زمانہ، جو اُن کی باتوں کا یاد ہے، اُس میں بھی اُن کا احساس برابر یاد پڑتا ہے۔ وہ ہمیشہ کہتے رہے کہ پیروں کی اولاد ہمیشہ جاہل رہی ہے، اور میں ڈرتا ہوں کہ تمہارا بھی یہی حشر ہوگا۔ جب کبھی ہم لوگوں سے کوئی قصور ہوتا، یا پڑھنے میں کوئی سستی ہوتی، اور وہ ناراض ہوتے، تو یہ بات ضرور کہتے، مگر ساتھ ہی یہ بات بھی کہتے "یہ نہ سمجھنا کہ بزرگوں کی تلوار ماری ہوئی ہے، یہ ابھی جو کچھ ہو رہا ہے، اس لیے ہے کہ میں موجود ہوں۔ میرے بعد اگر تم جاہل رہے تو جاہل مریدوں میں تو اپنی پیری جما لوگے، مگر اہلِ علم میں کوئی نہ پوچھے گا!" مگر اُس زمانے میں ہم پر ان باتوں کا کچھ زیادہ اثر نہ پڑتا تھا۔

کرمِ الٰہی!

پس خدا کا پہلا فضل و کرم، جو عام حالات و نتائج سے میری سرگزشت کو مختلف کر دیتا ہے، یہ ہے کہ باوجود اِن مُہلکات و موانع کے علم کا شوق، طفولیت ہی سے ساتھ رہا، اور یہ مفاسد اُس پر غالب نہ آسکے۔ ابتدا میں جب اِس خاندانی زندگی پر طبیعت پوری طرح مطمئن تھی، جب بھی کبھی دل میں سستی و بد شوقی کی طرف میلان نہ ہوا۔ یہ بھی نہیں کہ خاص طور پر یہ خیال، دل میں رہتا ہو کہ علم ضرور ہی پڑھنا چاہیے؛ اور اُس کی تحصیل سے کیا فوائد حاصل ہوں گے، یا بصورتِ ترک والد مرحوم کی تنبیہات صحیح ثابت ہوں گی۔ اِس طرح کا کوئی خاص احساس نہ تھا۔ مجھے جو کچھ یاد پڑتا ہے، وہ یہی ہے کہ بس ابتدائے سے طبیعت

کی افتادہی ایسی پڑی تھی کہ بلا کسی خاص خیال و تشریح کے طبیعت، تحصیل علم ہی میں مصروف تھی، اور یکے بعد دیگرے اُس کی تدریجی ترقی، نئی نئی راہیں کھولتی جاتی تھی، اور اُس میں طبیعت کو استغراق و اِستلذاذ تھا۔

سوچتا ہوں، تو اُس زمانے میں کچھ دماغ کا احساس ایسا تھا کہ جیسے یہی ہمارا طبیعی مشغلہ ہے، اور بس یہی ہونا چاہیے۔ کھیل کود کے نہ مواقع حاصل تھے اور نہ کبھی طبیعت للچائی۔ اپنے ہم سنوں کو کھیلتے کودتے دیکھتے تھے، لیکن کبھی یاد نہیں کہ طبیعت میں للچاہٹ پیدا ہوئی ہو۔ دل کا یہ حال تھا کہ بس پڑھنے لکھنے ہی میں لذت پاتا تھا، اور اُس میں ترقی کی دھن لگ گئی تھی۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس حالت میں بلا شبہ خاندانی حالت، نسلی توارُث، آبائی روایات اور منزلی ماحول کو بہت کچھ دخل ہے، اور بلا شبہ یہ تمام باتیں میرے حق میں تھیں۔ اِس میں والد مرحوم کا وہ غیر معمولی تشدُّد بھی داخل کر دینا چاہیے، جو ہمارے بچپنے میں جاری رہا، اور لہو و لعب کی کوئی راہ کھُلی ہی نہیں، لیکن جو طبیعت ثانیہ اِس خاندانی ریاست و پیشوائی کی زندگی اور انسانوں کی پرستش گاہ ہونے سے پیدا ہو گئی تھی، اُس کی غیر مسخر طاقت کا صرف وہی لوگ اندازہ کر سکتے ہیں، جن پر یہ حالات گزر چکے ہیں۔ اور جب میں سوچتا ہوں کہ اگر توفیق الٰہی دستگیر نہ ہوتی، اور مجھے ایک سخت ذہنی و فکری بحران پیش نہ آتا، جو گو خود بھی مرض تھا، لیکن شفا کا ذریعہ بھی وہی ہوا، تو نہیں معلوم میری ذہنی بربادیوں کا کیا حال ہوتا۔

ذہنی آزادی

غور کرنا چاہیے کہ ایک لڑکا، جس نے آنکھ کھولتے ہی یہ عالم اپنے گرد وپیش پایا ہو، اُس کے آگے طلب و جستجو اور آزادیٔ فکر ورائے کی راہ کیوں کر کھل سکتی ہے؟ اور وہ کون سی طاقت ہے، جو خاندانی رسوم وتقالید کی اِس زنجیر کو توڑ سکتی ہے؟ تاہم یہ ڈھیلی پڑی، اور پھر کھل گئی، اور میرے پاؤں آزاد ہو گیے!

میں سچ کہتا ہوں کہ میرے ذہنی تفکرات میں سے ہمیشہ ایک سخت فکر یہ رہی ہے کہ سلسلۂ اسباب و علل کے بموجب میں اِس کے لیے کوئی نمایاں محرک دریافت کر دوں۔ میں نے گھنٹوں، ہفتوں اِس پر غور کیا ہے، لیکن میں، سچ کہتا ہوں کہ میرے ذہن و حافظے میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے۔ میں نے اُس عہد کی ایک ایک بات یاد کی ہے، ایک ایک واقعے پر نشان دیا ہے، ایک ایک معاملے کی سراغ رسانی کی ہے۔ میں اور میرا دماغ تھک گیا ہے اور حافظے کے آگے تاریکی پھیل گئی ہے، مگر مجھے کوئی بات بھی ایسی یاد نہیں آئی، جسے میں صحیح طور پر اس انقلاب فکر کے لیے سبب قرار دے سکوں۔

خیالات کی کشاکش

ٹھیک زمانہ تو متعین کرنا دشوار ہے، اور یہ بھی ٹھیک نہیں کہہ سکتا کہ سب سے پہلے اِس طرح کے خیالات کب دل میں آئے تھے؟ تاہم تقریباً دس گیارہ برس کی عمر ہوگی، جب میرے خیالات میں یہ کشاکش پیدا ہوئی۔ سب سے پہلے جو بات یاد آتی ہے، وہ یہ ہے کہ یکایک خود بخود مجھے اِن اوضاع و اطوار پر ایک طرح کی بے اطمینانی

محسوس ہونے لگی تھی یہی باتیں، جو پہلے بالکل قدرتی اور معمولی معلوم ہوتی تھیں یکایک، ایسا محسوس ہونے لگا کہ ٹھیک نہیں ہیں۔ شاید میں اس وقت کے احساس کو ٹھیک طور پر معیّن نہیں کر سکتا۔ کچھ ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ باتیں نہ ہوں، تو بہتر ہے، یا یہ اچھی نہیں ہیں، یا ان میں کوئی خوشی کی بات نہیں ہے۔

اس زمانے میں میری معلومات، گھر کی فضا میں محدود تھیں۔ کوئی خارجی اثر نہیں پڑا تھا۔ میں بالکل نہیں بتلا سکتا کہ اِس نئے احساس کا بیرونی مبدا کیا تھا؟ ابتدا میں ایک مُبہم اور مجرّد اِستکراہ کی شکل میں محسوس ہوا۔ اچانک یہ خیال ہوا کہ یہ باتیں ٹھیک نہیں ہیں، لیکن نہ تو وجوہ سامنے تھیں اور نہ کسی طرح کا اِس مبہم احساس میں کوئی تفصیل و شرح کا پہلو تھا۔

اسی زمانے میں میرے ماموں زاد بھائی، مکہ سے نئے نئے آئے تھے۔ اُن کے لیے یہ سلوک ایک حد تک نیا تھا، اور اس لیے بہت مرغوب و مطلوب تھا۔ وہ نہ صرف پسند کرتے تھے بلکہ اپنی جانب سے تحریک کی مزید کوششیں بھی کرتے تھے۔ اب مجھے خیال ہونے لگا کہ اُن کی یہ بات اچھی نہیں ہے۔ چند دنوں کے بعد یہ احساس یہاں تک بڑھا کہ اب مجھے لوگوں کی اِس تعظیم و اجلال میں پوری طرح کراہت محسوس ہونے لگی، اور میں کوشش کرنے لگا کہ یہ باتیں میرے ساتھ زیادہ نہ ہوں۔ میں لوگوں کو ہاتھ چومنے کے بعد پاؤں چومنے سے روک دیتا تھا۔ ہاتھ جلدی سے کھینچ لیتا تھا۔ "بس کافی ہے" ایسے الفاظ کہہ دیتا، گو اِن کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا، مگر میری طرف سے گویا رکاوٹ و مزاحمت شروع ہوگئی اور شب و روز یہی بات ایک دُھن کی طرح دل میں سما گئی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس وقت تنہائی میں گھنٹوں یہ سوال میرے دماغ میں چکر کھاتے: یہ کیسی فضول بات ہے؟ کیوں اس طرح لوگ کرتے ہیں؟ آپس میں تو کوئی اِس طرح نہیں کرتا؟ اِس سے کیا فائدہ ہے؟ "حضرت" کے ساتھ اگر ایسا کرتے ہیں، تو وہ اُن کے پیر ہیں، اور بہت بڑے ہیں۔ اُن کا سب کو ادب کرنا چاہیے لیکن ہمارے ساتھ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ یہ تو بہت بُری بات ہے کہ خواہ مخواہ ایک آدمی اپنے ہی طرح کے ایک آدمی کے آگے اِس طرح گرے، اور بلا وجہ اُس کو ایسی تعظیم کا حق دار سمجھے۔ میں نے بارہا بھائی مرحوم سے یہ ذکر کیا۔ محمد سعید مرحوم سے بھی کہا، لیکن بجائے تاثر کے اُنھوں نے یا تو جھڑک دیا اور یا کہہ دیا، تم نہیں جانتے!

بھائی مرحوم کی طبیعت آخر تک اِس بارے میں بہت مضبوط رہی، اور اُس وقت تو اُنھیں اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بسا اوقات راتوں کو میری آنکھ کھلتی، تو میں اِنہی سوالات پر غور کرتا۔ میرے پاس نہ پورے جوابات تھے نہ دلائل، لیکن یہ بات روز بروز دل میں جمتی جاتی تھی کہ یہ جو کچھ کیا جا رہا ہے، بہت ہی بُرا ہے، اور کوئی ایسی بات نہیں ہے، جو موجب عزت ہو۔

تعظیم

چند دنوں کے بعد خیالات نے زیادہ وسعت اختیار کی اور اب ابہام کی جگہ تفسیر پیدا ہو گئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے والد مرحوم سے بھی چند سوالات کیے تھے، اور اپنے اساتذہ سے بھی۔ مسجد کی آمد و رفت کی وجہ سے بعض اور علما کو بھی دیکھا

تھا، اور اُن کے ساتھ لوگوں کو ایسا کرتے ہوئے نہیں پایا تھا۔ غور و فکر سے بھی مزید روشنی سامنے آئی اور اب میرے خیالات حسبِ ذیل ہو گئے۔

یہ قطعی ہے کہ خود رسول اللہ کی اُن کے صحابہ اتنی تعظیم نہ کرتے تھے۔ اُن سے جو ملتا تھا، اُن کا حکم یہی تھا کہ مصافحہ کرو۔ اِس طرح کی تعظیم کرانے کا کسی کو کیا حق حاصل ہے؟ یہ صرف اِس لیے ہے کہ لوگوں پر اپنی ایسی فوقیت رکھی جائے، جس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ فی نفسہ یہ فعل جہالت کا نتیجہ ہے!

چند دنوں کے بعد خیالات نے اور ترقی کی۔ اِس سوال نے آگے بڑھ کر نئی نئی راہوں تک پہنچا دیا۔ اب لازمی ربط کے ساتھ بقیہ ٹکڑے سامنے آگئے، یعنی وہ باتیں کیا ہیں جن کی وجہ سے یہ سب کچھ کیا جاتا ہے، یعنی پیری اور اُس کے رسوم۔ میرے لیے یہ چیزیں بالکل گھر کی چیزیں تھیں۔ جو کچھ تھا، سامنے تھا۔

اب میں نے اِس کا مطالعہ بالکل ایک مخالف و نکتہ چیں کی طرح شروع کر دیا، اور صدہا سوالات سامنے آئے۔ جن میں سے ہر سوال کے لیے جستجو پیدا ہوتی اور اس کا جواب سوچتا رہتا۔ یہ ایک ایسا سلسلہ تھا، جو اُس وقت میرے لیے گویا لامتناہی تھا۔ یہ تمام کارخانہ کیا ہے؟ پیری مریدی کا مقصد، ہدایت و ارشاد، یہ سب باتیں تو سمجھ میں آتی تھیں، جو اعمال و اشغال ہوتے تھے، جن میں اپنے بزرگوں کو اور مریدوں کو مشغول دیکھتے تھے، جن میں سے بعض میں ہم بھی شریک کیے جاتے تھے۔ اِن سب کی تو دل میں قدرتی طور پر عزت تھی، اور یہ یقین تھا کہ یہ سب ٹھیک و ضروری ہے، مگر باقی جتنا حصہ طرح طرح کے طُرق و رسوم کا، اور بحیثیت مجموعی ایک کارخانے کا نظر آتا تھا، اُس کی طرف سے دل میں بالکل بے اطمینانی

اور طرح طرح کے شکوک پیدا ہوگئے۔ یہ بے اطمینانی بڑھتے بڑھتے گاہ گاہ ایک ایسی حالت تک پہنچ جاتی تھی، گویا میرے اندر ایک نفرت اُٹھ رہی ہے، لیکن میں اُس پر غالب آنے کی کوشش کرتا، اور اپنے کو ملامت کرنے لگتا!

گھر بھر میں سب سے زیادہ میں چھوٹی بہن[1] سے مانوس تھا، جو مجھ سے بڑی مگر دو بہنوں سے چھوٹی تھیں۔ گھر میں زیادہ بیٹھنا اُٹھنا اُنہی کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ اُردو لکھنا پڑھنا تو گویا میں نے اُنہی سے سیکھا۔ میں اُن سے یہ باتیں گھنٹوں کرتا، اور وہ مجھے اِن پر ملامت نہ کرتیں، بلکہ بعض باتوں کے تسلیم میں شریک ہو جاتیں۔ اِس اشتراک خیال نے ایک اور نئی اور گہری محبت باہم پیدا کر دی تھی۔

اب ملنے جلنے کا دائرہ زیادہ وسیع ہوا۔ اُردو کتابوں کا مطالعہ بھی شروع ہو گیا، اور اِس کی وجہ سے ذہن کا عمل زیادہ کام کرنے لگا۔ جو لوگ اُس زمانے میں ملے اُن میں دو چار شخصوں سے میں نے اِس موضوع پر بھی بات چیت شروع کر دی تھی۔ اِن میں صرف ایک شخص، جن کا ذکر پہلے کر چکا ہوں، محمد حسین متھرا کے ایسے شخص تھے، جنھوں نے میرے خیالات پر بڑی خوشی ظاہر کی، اور مجھ سے کہا، اِن خیالات کے لیے تو مجھے اجازت دو کہ میں تمہارے ہاتھ چوم لوں! اُنھوں نے کہا، خود بخود ایسے خیال کا تمہارے دل میں پیدا ہونا، بہت عجیب بات ہے۔ مجھے اُن سے بہت اُنس ہو گیا۔ وہ کسی نیل کی کوٹھی میں ملازم تھے۔

---

[1] مرحومہ آبرو بیگم صاحبہ۔

اُس وقت تک نیل کی کاشت بالکل بند نہیں ہوئی تھی۔ ہر سال کلکتے نیلام کے لیے آتے اور دو تین مہینے رہ کر چلے جاتے۔ اب سوچتا ہوں، تو خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک سنی، حنفی، اور عام عقائد و خیالات میں راسخ الاعتقاد آدمی تھے۔ شاہ فضل الرحمان گنج مراد آبادی کے مرید بھی تھے، لیکن طبیعت بہت معتدل اور دانشمندانہ تھی، اس لیے حد سے گزرے ہوئے رسوم و بدعات کے قائل نہ تھے۔ اِس سے زیادہ مجھے خیالات کی کسی سطح پر اب معلوم نہیں ہوتے، لیکن جس فضا میں مَیں تھا، اُس کے لیے تو یہ بھی بالکل نئی ہوا تھی۔ مجھے وہ بہت مغتنم معلوم ہوتے، اور یہ پہلا موقعہ ہے کہ باہر کی ایک صدا کانوں میں ایسی آئی، جس نے دل کے اُٹھے ہوئے خیالات کی تصدیق کی۔ یہ ۹۸ء اور ۹۹ء کی بات ہے۔

آزاد زندگی کی تڑپ

اب وہ وقت آیا کہ اُردو نثر و نظم کے مطالعے میں رغبت ہوئی۔ مصنفین وقت کی کتابیں دیکھنے لگا، اور ذوق لینے لگا۔ شاعری کا جنون بھی شروع ہو چکا تھا۔ اب بحیثیت مجموعی دماغی رجحان کی حالت یہ تھی کہ طبیعت میں خاندانی زندگی سے بے میلی اور عام زندگی جو لوگوں کی نظر آتی تھی، اُس کی طرف طبیعت بے حد مائل تھی۔ ممکن ہے آپ کو حیرت ہو، مگر یہ امر واقعہ ہے کہ اُس وقت میں کسی غریب طالب علم کو مسجد میں، کسی معمولی راہ گیر کو سڑک پر، کسی اپنے یہاں آنے جانے والے معمولی آدمی کو دیوان خانے میں بیٹھا دیکھتا، تو حسرت ہوتی کہ کاش میں اِن کی سی زندگی بسر کرنے کے لیے آزاد ہو جاؤں! یہ نہ ہو کہ لوگ میرے

پیچھے دوڑیں، میرے ہاتھ پیر چومیں، اور اس طرح اور باتیں میرے ساتھ لگی ہوں!
میں جب تنہائی میں ہوتا اور اپنی نسبت اِس طرح سوچتا کہ کیا ہونا چاہیے، تو کوئی
ایسا ہی نمونہ سامنے آجاتا، اور دل بے قرار ہوتا کہ کاش ایسی زندگی مل جائے!

اِس زمانے میں ہمارے یہاں سہسرام کی ایک عورت سینے پرونے پر ملازم
ہوئی۔ اُس کے بھائی کا حال پہلے کہہ چکا ہوں۔ وہ بے چارہ بہت ہی غریب آدمی
تھا۔ اپنے شوق سے تحصیل کی تھی۔ بہن ہمارے یہاں ملازم تھی۔ دن کا کھانا یہاں
کھا لیتا۔ رات کا حاجی بابُ اللہ ایک عطر فروش کے یہاں، جہاں وہ پانچ روپے
پر ملازم تھا اور اُن کے خطوط لکھ دیتا تھا۔ ایک اور حکاک تھا۔ اُس کے یہاں بھی
کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کرتا۔ دس پانچ مل جاتے تھے۔ کرُتے، پائجامے، اور ٹوپی
کے سوا کوئی لباس اُس کے جسم پر نہ تھا۔ غربت کی وجہ سے اور ہو ہی کیا سکتا تھا؟
اکثر جوتی پھٹی ہوتی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ بارہا اُس کی زندگی سامنے آجاتی اور سخت
آرزو ہوتی کہ کاش ایسی زندگی میسر آتی! اپنا بڑا مکان، سازوسامان، دھوم
دھام، عزّت و شوکت، تعظیم و اجلال، اور اِن کا کارخانہ اور تمام نمائشیں، یہ امر
واقعہ ہے کہ مجھے بالکل ایک تکلیف دہ قید خانے کی طرح محسوس ہوتا تھا!

یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ بزرگوں کی نگرانی اور گھر کی پابندیاں طبیعت
پر شاق گزرتی تھیں، اِس لیے ایسا خیال ہوتا تھا۔ اُس وقت بھی میرے احساسات
صاف تھے، اور اب تو اِس قدر مراقبہ و احتساب کر چکا ہوں کہ دل کا کوئی چور
باقی نہیں رہ سکتا۔ یہ یقینی بات ہے کہ ایسا نہ تھا۔ کم سے کم میرے محسوسات ایسے
نہ تھے۔ اُس وقت یہ پابندیاں بھی کچھ ایسی شدید نہ تھیں۔ چلنے پھرنے ملنے جلنے

کی سہولتیں حاصل تھیں۔ اِس سے زیادہ کا کوئی ولولہ بھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ شوق اور طلب جس چیز کی تھی، وہ صرف علم تھا۔ درسیات و مطالعہ۔

پس فی الحقیقت طبیعت میں اپنی زندگی سے استکراہ اور اُس کے مقابلے میں غربت و افلاس کی سخت سے سخت زندگی کی آرزو، بشرطیکہ اِن آلودگیوں سے پاک ہو۔ بجز اِس ایک خیال کے اور کسی جذبے پر مبنی نہ تھی۔ مجھے کتنی حیرت ہوتی، جب میں لوگوں کو دیکھتا کہ وہ میرے حالات کو حسرت و رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں، یا اپنے بھائیوں کو دیکھتا کہ وہ خوش و خواہشمند ہیں۔ مجھے سخت تعجب ہوتا کہ کیا اِن باتوں کی بھی انسان کو خواہش ہونی چاہیے؟ یہ تو بڑی ہی ذلّت کی بات ہے۔ یہ آخری جملہ میرے ٹھیک اُس وقت کے احساسات کی تعبیر ہے۔

اب مجھے نہ صرف اِن باتوں میں محض رکاوٹ تھی بلکہ یہاں تک اُن کی بُرائی کا استغراق ہوگیا تھا کہ میں اِن باتوں سے اِس طرح اپنے اندر شرمانے لگا تھا جیسے کوئی آدمی کسی سخت ذلت و عار کی بات سے شرمانے لگے۔ جب کبھی ایسا ہو کہ مسجد میں یا سڑک پر لوگ ایسا کرنے کے لیے ہجوم کریں، تو حتیٰ الامکان میں بچنے اور نکل جانے کی پوری سعی کروں، لیکن اگر پھنس جاؤں تو اُس وقت اِس خیال سے کہ کتنے ہی آدمی دیکھ رہے ہوں گے، مجھے ایسی شرم دامن گیر ہو، جیسے کوئی بڑا جرم میری طرف منسوب ہو رہا ہے!

"وہابی" اور "وہابیت"

لیکن میں ایک بہت ضروری بات کی تشریح کر دینا تو بالکل بھول گیا۔ مجھے

پہلے ہی یہ بات کہہ دینی تھی کہ اس احساس اور فکر کے ساتھ ایک اور چیز بھی چپکے چپکے میرے اندر کام کر رہی تھی، یعنی وہابیت اور وہابیوں سے عدم نفرت اور پھر ہمدردی و میلان۔ میں نے عدمِ نفرت اور ہمدردی کہا، اِس لیے کہ ابتدا میں میرے احساسات یہی تھے۔ عدم نفرت اِس لیے کہ میرے لیے یہ سوال نہ تھا کہ وہابیت پسند کی جائے یا نہ کی جائے؟ سوال تو یہ تھا کہ نفرت کی جائے یا نہ کی جائے؟ اِس لیے کہ وہابیت کے بارے میں میری خاندانی دنیا میں اصل، اِباحت نہ تھی بلکہ حذر، یعنی نفرت، تقبیح، تکفیر، اور انسان جس قدر بھی مذہبی اور غیر مذہبی بُرائیوں کا تصور کر سکتا ہے، اُن سب کا پیکر و مجسمہ، وہابیت تھی۔ بس میری ابتدائی اور بسیط حالت اِس بارے میں نفرت و بغض کی تھی نہ کہ محبت و عدمِ محبت کی۔ میں خالی الذہن نہ تھا کہ میلان و عدمِ میلان کی صورت پیش آتی۔ میرے تو ذہن کے معمور ہونے کا بہت سے بہتر سامان موجود تھا، اور وہ انتہا درجے کی نفرت تھی۔ اس لیے اِس بارے میں مَیں جو کچھ بھی سوچ سکتا تھا، وہ اِس درجے کے بعد کا تھا، نہ کہ اِس سے پیشتر کا۔

حقیقتاً میں سوچتا ہوں، تو اس بارے میں والد مرحوم کا تعصب، حد درجے تک پہنچا ہوا تھا، اور میں حیران ہوں کہ اُسے کیوں کر کسی لفظ و جملے میں محدود کروں، یہ پہلے بتفصیل کہہ چکا ہوں کہ کس طرح اوائلِ عمر سے یہ عصبیت اُن میں جاگزین ہوئی اور کس طرح مدت العمر اُن کی تمام تصنیف و تالیف، وعظ و مباحث کا تنہا مرکز و مطمحِ رہی ہے۔ مجھے اپنے بچپن کی پُرانی سے پُرانی مسموعات جو یاد آتی ہیں، اُن میں وہابیت کا ذکر موجود پاتا ہوں۔

شب و روز اس کا چرچا گھر میں بھی رہتا تھا اور باہر بھی۔ والد مرحوم کے جو خدام اور مرید تھے، وہ بھی اِسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور یہ قدرتی تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں میرا تخیل یہ تھا کہ وہابی کوئی خاص طرح کا ایک بڑا ہی مکروہ اور قابل نفرت مخلوق ہے! میں اپنے ذہن میں اُس کا تصور یوں کرتا تھا کہ ایک قبیح صورت انسان جس کا آدھا چہرہ کالا ہے اور پیشانی پر بہت بڑا گھٹا ہے۔ یہ اس لیے کہ حافظ صاحب کی زبانی سنتے تھے کہ دل کے کفر اور بغضِ رسول کی وجہ سے وہابیوں کا آدھا منھ کالا ہوجاتا ہے اور اُن کی ایک علامت یہ ہے کہ لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے پیشانی پر ایک بہت بڑا گھٹا بنالیتے ہیں! ہمارے دیوان خانے میں اِس بارے میں خاص مصطلحات اور اسما تھے۔ دنیا کی ہر مکروہ اور خبیث چیز اِسی لقب سے پکاری جاتی تھی۔ مثلاً حافظ جی کہتے تھے "شب کو اِس قدر وہابی تھے کہ نیند نہ آئی"۔ یعنی مچھر بہت تھے۔ دیوان خانے میں کتابوں کے صندوق پڑے تھے۔ اُن کے نیچے "وہابی" چلے جاتے تھے اور پیندے میں سوراخ کر دیتے تھے، یعنی چوہے! چنانچہ بڑی جدوجہد کے ساتھ "وہابیوں" کو پکڑا جاتا تھا اور ہم لوگ یوں حساب کرتے تھے "آج دو وہابی مارے گئے! ایک بہت بڑا وہابی بھاگ گیا!"

نہیں معلوم کون غریب تھا، لیکن ایک بڑا ہی بدصورت آدمی تھا۔ ایک آنکھ سے کانا، دوسری میں بھی جالا، چہرے پر شاید فالج بھی گرا تھا، ایک طرف سے لب ٹیڑھے تھے، رنگ بالکل سیاہ، رستے میں کبھی کبھی ہم حافظ صاحب کے ساتھ سڑک پر جاتے، تو اِس غریب کی طرف اشارہ کرکے وہ کہتے "دیکھو،

وہ خبیث وہابی کھڑا ہے!" مجھ پر اُس کی خوفناک صورت کا واقعی بڑا ہی دہشت انگیز اثر پڑتا۔ مجھے یاد ہے، کئی مرتبہ میں نے نیند میں ایسے ہی خوفناک "وہابی" کو دیکھا اور ڈر کے رونے لگا!

معصومانہ سوال

ایک دن مجھے یاد ہے، جمعے کے دن وعظ سے آ کے والد مرحوم حسبِ معمول دیوان خانے میں بیٹھے تھے۔ قاعدہ تھا کہ وعظ کے بعد آدھ گھنٹے وہاں بیٹھ کے پھر زنان خانے میں آتے تھے۔ زور زور سے باتوں کی آواز آنے لگی۔ میں دوڑا ہوا گیا۔ ایک شخص پگڑی باندھے، بڑی ڈاڑھی، دو زانو بیٹھا بڑے ادب سے باتیں کر رہا تھا، لیکن والد مرحوم اُس پر گرج رہے تھے، اور تمام لوگ اِس طرح خوں ریز نظروں سے اُسے گھور رہے تھے کہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کا خون پی جانا چاہتے ہیں۔ اُس نے بھی خطرہ محسوس کر لیا تھا، اسی لیے ڈرتا اور کانپتا بھی جاتا تھا۔ دروازے کے قریب فضل کریم ایک پنجابی مرید بیٹھے ہوتے تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا، کون ہے؟ اُنھوں نے کہا، وہابی ہے! اب میں بڑے تعجب سے دیکھنے لگا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ آدھا منھ کالا نہیں ہے۔ لب بھی ٹیڑھے نہیں ہیں، آنکھیں بھی دونوں ہیں۔ چہرہ بھیانک بھی نہیں ہے۔ معاملہ میری نظر میں اتنا اہم اور سنجیدہ تھا کہ جوں ہی والد اپنے کمرے میں آ کر بیٹھے، میں نے کہا، یہ وہابی تھا؟ اُنھوں نے کہا، ہاں۔ میں نے کہا مگر اُس کا چہرہ کالا نہیں تھا۔ اُنھوں نے کہا، ہاں یہ کالک ایک ہی مرتبہ نہیں آجاتی۔ جب کبھی آدمی بگڑتا ہے، تو دل پر ایک سیاہ نقطہ

لگ جاتا ہے۔ پھر جب وہ اور بگڑ جاتا ہے تو دوسرا نقطہ لگتا ہے، یہاں تک کہ پورا دل کالے نقطوں سے بھر جاتا ہے۔ پھر بھی اگر وہ باز نہ آئے، تو تمام نقطے مل جاتے ہیں، اور دل کالا ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کالک منھ پر آجاتی ہے۔ "کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوبِہِمْ!"

اب تک یہ پوری بات اُن کی یاد ہے!

جب ذرا اور بڑے ہوئے، تو والد مرحوم کے وعظ اور گھر کی باتوں کو بھی خوب سمجھنے لگے۔ ہمیشہ وہابیوں کے عقائد کا رد رہتا تھا۔ کوئی بات کہی جائے، وہ فوراً یاد آجاتے تھے۔ گریز یوں ہوتا تھا کہ "مگر وہابی یوں کہتے ہیں" پھر اُن کا رد کیا جاتا تھا۔ رد ایسے الفاظ پر مشتمل ہوتا تھا، جس کے صاف معنی اُن پر تلعّن اور اُن کی تکفیر کے تھے۔ ہم نے سینکڑوں مرتبہ والد مرحوم سے سُنا کہ اُن کا کفر، یہود و نصاریٰ کے کفر سے بھی اشد ہے۔ یہود و نصاریٰ بھی اپنے پیشواؤں کے منکر نہیں ہیں۔ یہ خبیث تو خود اپنے پیغمبر کے منکر ہیں!

ہم ابھی بہت ہی چھوٹے تھے، اتنے کہ اُردو کی مبادیات پڑھتے تھے، لیکن مولوی اسماعیل، سیّد احمد بریلوی "تغویۃ الایمان" (تقویۃ الایمان) وغیرہ کے ناموں سے خوب واقف ہو گیے تھے، کیونکہ ہمیشہ سامنے آتے تھے۔ سینکڑوں مرتبہ ہمارے سامنے والد مرحوم اِن لوگوں کے حالات بیان کرتے اور ہم سُن سُن کر اچھی طرح شناسا ہو گیے تھے۔ تقویۃ الایمان کو وہ تقریر و تحریر میں "تغویۃ الایمان" کہتے تھے۔ اُن کا جو نسخہ ہے، اُس کی لوح پر اُنھوں نے چاقو سے ایک نقطہ چھیل دیا ہے! وہ یہ لطیفہ بھی بطور اولیاء اللہ کی کرامت کے بیان کرتے تھے کہ جب مولوی اسماعیل نے "تقویۃ الایمان" لکھی، تو خود اُن کے مسودے میں کتاب

کے نام میں ایک نقطہ رہ گیا تھا!

بُہتانِ عظیم!

اس بارے میں اُن کا بیان یہ تھا کہ جب شاہ عبدالعزیز مرحوم نے اپنی تمام جائداد اپنے اور عزیزوں میں تقسیم کر دی، باقی کے لیے بھی وصیت نامہ لکھ دیا، اور مولوی اسماعیل کے لیے کچھ بھی نہ رہا، تو اب دنیا کی طلب دل میں سمائی، اور یہ ڈھنگ نکالا کہ پیری مریدی کا ایک نیا کارخانہ جمایا جائے! سیّد احمد بریلوی، ٹونک کی فوج میں ایک اَن پڑھ سپاہی تھے۔ اُن سے سازش کرکے اُنھیں پیر بنایا۔ مولوی عبدالحی، شاہ صاحب کے داماد، کہ وہ بھی بیٹی کے محروم رہ جانے سے برداشتہ خاطر تھے، وہ بھی شریک سازش ہو گئے، اور صورت یہ قرار دی کہ "خدا کی دین میں کسی کا کیا لینا دینا ہے۔ ہم نواسے اور داماد تھے، مگر محروم رہ گئے، اور شاہ صاحب کا تمام باطنی فیض، ٹونک کے اس سپاہی کو مل گیا!" آدمی (یعنی مولانا اسماعیل شہید) ذہین اور لسّان تھا۔ بہت جلد لوگوں میں ایک غلغلہ مچا دیا۔ لوگوں نے جب دیکھا کہ ایک معمولی اَن پڑھ آدمی کو شاہ صاحب کے نواسے نے پیر مان لیا ہے، اُس کی پالکی پکڑ کے، جوتی بغل میں داب کے دوڑتا ہے، اور علانیہ اپنی محرومی اور اُن کی فیض یابی کا اقرار کرتا ہے، تو اس سے لوگوں میں بڑا ہی رنگ جما اور ہر طرف سے چاندی سونے کی بارش ہونے لگی۔ اِسی زمانے میں "صراطِ مستقیم" کتاب لکھی اور اُس میں سیّد احمد کو ولایت سے بھی بڑھا کر نبوّت تک پہنچا دیا، اور ساری باتوں میں آنحضرتؐ سے تشبیہ دی، گویا پورا آنحضرتؐ کی ریس اور مقابلہ کر دیا تھا۔

مُہر میں "اِسمُہٗ احمدُ" نقش کرایا۔ لوگوں سے کہتے کہ جو شخص مرید ہوتا ہے، اُسے فوراً کشف و مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے۔ لوگ اِس شوق میں آتے اور مرید ہوتے۔ چالاکی یہ کی تھی کہ ڈیوڑھی پر مولوی اسماعیل موجود رہتے۔ وہ نوواردوں کے کان میں جاتے ہوئے کہہ دیتے کہ جو شخص صدقِ دل سے مرید ہوتا ہے، اُن کی پہلی ہی توجہ میں فائز المرام ہو جاتا ہے۔ ہاں جو شخص خدانخواستہ ولدالزنا ہو، اُسے خُبثِ ولادت کی وجہ سے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اب وہ غریب جاتا اور مرید ہونے کے بعد نکلتا۔ نظر تو اُسے خاک آیا تھا، لیکن اب وہ سوچتا کہ اگر کہتا ہوں کہ کچھ نظر نہ آیا، تو سب کہیں گے کہ یہ ولدالزُنا ہے، اِس ڈر سے وہ کچھ نہ کہتا، اور جب لوگ 'مبارک مبارک کی صدائیں بلند کرتے، تو سَر جُھکا کر خاموش رہ جاتا! جب اِس طرح خوب رنگ جم چکا، تو اب موقعہ آیا کہ جو اصل شیطنت اِس تمام کارخانے سے مقصود تھی، اُسے عمل میں لایا جائے۔

وہ کیا تھی؟ یہ بھی ایک مشکل کہانی ہے۔ یہ گویا ہندستان میں وہابیت کی تولید و شیوع کی تاریخ قرار دی گئی تھی، اور زیادہ تر مقصود اِس سے یہ تھا کہ ہندستان کی وہابیت کا شجرۂ نسب بآسانی نجدی وہابیت سے ملا دیا جائے۔

شاہ ولی اللہؒ

اِس کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ شاہ ولی اللہ مرحوم کو، جو عین محمد بن عبدالوہاب نجدی کے ظہور و شیوعِ عقائد کے زمانے میں حرمین میں مقیم تھے، اُس کی "کتاب التوحید" ملی اور اِس کی وجہ سے اُن کے خیالات میں بھی ایک گونہ فتور رہا۔ وہ اِس فتنے کو

اپنے ہم راہ ہندستان لائے۔

اُن کی کتابوں میں مولوی اسماعیل کو "کتاب التوحید" ملی اور اندر ہی اندر دینِ جدید کے اس فتنے کو مفید مطلب سمجھ کر اُسے محفوظ کر لیا۔ اب جب سید احمد کی پیری خوب جم گئی، تو یکایک پلٹا کھایا، اور پیری مریدی اور تصوف و ولایت کی جگہ، جو پہلے "صراطِ مستقیم" کے پیرایہ میں آچکی تھی، اب "رسالہ التوحید" "تقویۃ الایمان" کے روپ میں نکالی گئی اور شرک و بدعت کے نام سے تمام اسلامی عقائد و اعمال کو بیخ و بُن و بُنیاد سے اُکھاڑ دیا۔

جب دیکھا کہ دینِ جدید کی وجہ سے پیری مریدی کا رنگ پھیکا پڑنے لگا ہے اور علمائے اہلِ سنت کی مقاومت روز بروز بڑھتی جاتی ہے، تو جلبِ زر کی نئی راہ پیدا کرنے اور لوگوں کی توجہ، فتنے کی طرف سے ہٹانے کے لیے جہاد کا غلغلہ بلند کیا گیا، اور سید احمد کی امامت کا اعلان کیا گیا۔ اِس پر خوب ہُن برسنے لگا۔ جوق جوق احمق دام میں پھنسنے لگے۔ ہزاروں رُپیہ کی ہُنڈیاں آنے لگیں، اور مجاہدین کا غول کے سکھوں سے لڑنے کے لیے روانہ ہوئے۔ سکھوں سے کیا لڑنا تھا۔ خود مسلمانوں کو مشرک و بدعتی بنا کر دینِ جدید کا فتنہ پھیلانا تھا۔ سرحد میں پہنچ کر خود مسلمانوں سے لڑنا شروع کر دیا۔

آخر جب غیرت مند سرحدی مسلمان جوش میں آئے اور سلطان محمود خاں غیرت دینی سے آمادۂ مقابلہ ہوا، تو جان بچا کر بھاگنا چاہا، مگر اُس نے مہلت نہ دی اور سب کا قلع قمع کر دیا۔ مریدوں نے سوچا کہ پیروں کا قتل تو خود مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہوا ہے۔ جہاد و شہادت کی جگہ مسلمانوں کے ہاتھ سے ہلاکت

نصیب ہوئی۔ اب کسی طرح بنانی چاہیے؟ تب یہ سازش کی کہ سکھوں سے ایک فرضی لڑائی کا افسانہ گھڑا! اور مسلمانوں کے لوٹنے کے لیے یہ مشہور کیا کہ سکھوں سے لڑتے ہوئے میدانِ جہاد میں سیّد احمد اور مولوی اسماعیل، شہید ہوتے، لیکن اب وہ پھر زندہ کیے جائیں گے اور بھیجے جائیں گے "تاکہ سکھوں سے پنجاب کو نجات دلائیں" چنانچہ کچھ دنوں کے بعد سرحد کے ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھال میں بھوسہ بھر کے ایک ڈھانچا تیار کیا گیا اور سیّد احمد کے کپڑے پہنا کر مشہور کیا گیا کہ وہ زندہ سلامت مشغولِ مراقبہ ہیں۔ اور اِس طرح پھر از سرِ نو اپنی دُکان جمالی!

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ شاہ ولی اللہ مرحوم بھی دامن بچا نہ سکے، اگرچہ اُن کی زندگی میں اُن کی خاص تصنیفات زیادہ شائع نہیں ہوئی تھیں، اور جیسا کہ اُن کے محرم راز شاگرد مولانا محمد عاشق نے لکھا ہے، خاص خاص لوگ اُن کے خاص ذوق و مشرب سے واقف تھے، تاہم حجۃ اللہ البالغہ اور تفہیماتِ الٰہیہ پر لوگوں کی نظریں پڑ چکی تھیں، اور گو اُن کی صولتِ علم اور ذی تصوّف و طریقت کی وجہ سے زیادہ فتنہ نہ اُٹھ سکا، تاہم لوگوں کے دلوں میں گرہیں پڑ چکی تھیں۔

والد مرحوم کہتے تھے کہ جب اُن کے انتقال کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیز کی سجادہ نشینی کی مجلس ہوئی، اور شاہ فخر الدین مرحوم نے اُن کے سر پر پگڑی رکھی، تو کان میں کہا تھا "تمہارے خاندان کی چادر پر ایک دھبا لگ چکا ہے اپنی سعی و ہمّت سے اُسے دھو ڈالنا!" یہ شاہ ولی اللہ کی طرف اشارہ تھا، اور مشہور تھا کہ اُن کو اپنے ذوق تفنّن میں اعتزال کی طرف بھی میلان رہا ہے!

قلبِ حقیقت

یہ پوری داستان دراصل اِس تمام طبقے کا مشترک مشرب تھا، جو مولانا اسماعیل شہید کی تحریک کے خلاف سرگرم ہوا تھا۔ اِن کے مسلک اور سیّد صاحب کی تحریک کی نسبت ایسے ہی واقعات گھڑے گئے تھے، چنانچہ میں نے پھر مولوی فضل رسول بدایونی کی "سوطُ الرحمان" اور مولوی علی حیدر ٹونکی کی "سبیل الرحمان" دیکھی، تو اُس میں بھی بجنسہٖ یہی داستان پائی۔

قلبِ حقیقت اور تمویہِ واقعات کی یہ بڑی سے بڑی مثال ہوسکتی ہے، کہ سیّد صاحب اور مولوی اسماعیل شہید کی نسبت کہا جائے کہ سلطان محمود کے ہاتھوں وہ شہید ہوئے۔ یہ تو ایک مسلّم تاریخی واقعہ ہے جس کو اُس عہد کے اور نیز اُس کے بعد کے انگریز مورخین اور سیاحوں نے بھی بطور تاریخی حقیقت کے لکھا ہے کہ اُن کی شہادت بالاکوٹ کے معرکے میں ہوئی، جبکہ رنجیت سنگھ کا فرنچ سپہ سالار کھڑک سنگھ کی معیت میں حملہ آور ہوا تھا۔ کھڑک سنگھ کے حکم سے اِن دونوں کی تجہیز و تکفین کی گئی۔ کھڑک سنگھ نے سیّد صاحب کی نعش پر اپنا کشمیری دوشالہ ڈالا، اور اُن کا مزار اب تک دربند ضلع ہزارہ میں موجود ہے۔

حقیقتِ واقعہ

بلاشبہ اُن کی شہادت کے بعد سرحد کی مقیم جماعت میں سے بعض غلاۃ اِس وہم میں پڑ گئے تھے، جیسا کہ خوش عقیدہ لوگوں کا ہمیشہ قاعدہ رہا ہے

کہ سید صاحب کے بعض عزم وجوش کے کلمات کو بطور پیشین گوئی کے قرار دیں، اور اُس کی تکمیل کے لیے اُن کی رجعت کا عقیدہ تراشیں۔ مشہور ہے کہ سید صاحب نے ٹونک سے چلتے ہوئے اپنے گھر کے لوگوں سے کہا تھا کہ اگر دنیا بھر تم سے کہے کہ سید احمد قتل ہو گیا، مگر پنجاب میں سکھوں کی حکومت باقی رہے، تو تم ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ ماننا۔ مجھے خدا نے پورا یقین دیا ہے کہ دنیا سے نہیں جا سکتا، مگر پنجاب کو دارالاسلام بنا کر، قطع نظر صحتِ واقعہ کے، عزم ویقین کی ایسی ہی باتیں ہیں، جو ہر صاحبِ عزم کے دل میں قدرتی طور پر پیدا ہوا کرتی ہیں۔ اِن کو واقعات کے رنگ میں دیکھنا، صحیح نہیں ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ شاید مولوی ولایت علی صادق پوری بھی اِن دو وہموں میں مبتلا ہو گیے تھے: ایک رجعت، دوسرے روایاتِ ظہورِ مہدی کا اُن پہ انطباق، لیکن یہ ایک محدود جماعت کا خیال تھا۔ اِسے تمام وہابیوں کی طرف منسوب کرنا، صریح ناانصافی ہے۔

یہ بھی مشہور ہے کہ چند چالاک اور دنیا پرست آدمیوں نے اپنے ذاتی اغراض سے واقعی ایک پُتلا بنایا تھا، اور کچھ دنوں تک یہ بات مشہور رہی تھی کہ سید صاحب شہید نہیں ہوئے اور بدستور زندہ وسلامت موجود ہیں، لیکن یہ بھی چند چالاک آدمیوں کی کارروائی تھی، اور بہت جلد کھل گئی۔ ایسے واقعات ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔ اِن کو وہابیت یا مولوی اسماعیل مرحوم کی جماعت سے کیا تعلق ہے؟

بہرحال، بچپن میں جو تاریخ وہابیت کی ہمارے دل پر نقش ہو گئی تھی

وہ یہی تھی ۔ وہابیوں کا دشمن اسلام ہونا، خاصۃً آنحضرتؐ سے اُنکا بغض، آنحضرتؐ کی تحقیر، اولیاء اللہ سے دشمنی، تمام عقائد اسلامیہ سے انکار، اور اس طرح کی صدہا باتیں تھیں، جو بطور یقینیات کے کہی جاتی تھیں اور ہمیں اُن میں کوئی شک نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بات کہ وہابی، رسول اللہؐ کے منکر ہیں، ایک ایسا مسلّم واقعہ تھا، جو بلا کسی تمہید و استدلال کے ہمیشہ بولا جاتا تھا، گویا اس بارے میں کسی رد و کد کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

ہمیں اُس وقت یقین تھا کہ وہابی اُن لوگوں کو کہتے ہیں، جو اوّل تو نبیؐ کی فضیلت کے قائل ہی نہیں، اگر قائل ہیں بھی، تو صرف اتنے جیسے چھوٹے بھائی کے لیے بڑا بھائی۔ معجزات کے بھی منکر ہیں۔ ختم نبوّت کے بھی قائل نہیں۔ آنحضرتؐ سے تو اُن کو ایک خاص بغض ہے۔ جہاں کوئی بات اُن کی فضیلت و منقبت کی آئی اور اُنھیں مرچیں لگیں۔ مجلس میلاد کے اِس لیے منکر ہیں کہ اس میں آنحضرتؐ کے فضائل بیان کیے جاتے ہیں۔ قیام کے اِس لیے منکر کہ اس میں آنحضرتؐ کی تعظیم ہے۔ درود پڑھنے کو بھی بُرا جانتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یا رسول اللہؐ مت کہو، کیونکہ رسول اللہ کی یاد اُنھیں کیوں پسند آنے لگی! جہاں کوئی بات رسولؐ کی فضیلت، اولیاء اللہ کی منقبت، بزرگانِ دین کی بزرگی کی کہی جائے یا کی جائے، فوراً اُسے شرک و بدعت کہہ دیتے ہیں، اِس لیے کہ اُنھیں اِن سب سے بغض و کینہ ہے، اور اُن کی توہین و تذلیل اُن کو خوش آتی ہے! بحیثیت مجموعی وہابیوں کے بدترین خلائق ہونے، کافر ہونے، کافروں میں بھی بدترین قسم کے کافر ہونے میں کسی رد و کد کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔

وہابیت کے متعلق یہ فضا تھی جس میں میں نے پرورش پائی۔

"وہابیت" سے واقفیت

یہ پہلا موقعہ ہے کہ ذہن کے سامنے وہابیوں کے بارے میں سوالات آئے، اور وہ جو ایک یقین کی حالت تھی، اُس میں حرکت ہوئی۔ اب خود بخود آہستہ آہستہ جیسے میں ایک نئے راستے میں بڑھ رہا ہوں، مگر رکاوٹ کے ساتھ، قدم رُک رُک کر اور ڈرتے ڈرتے اُٹھتے ہیں۔ میں سوچنے لگا کہ اگر وہابیوں کے ایسے ہی خیالات ہیں، تو وہ کیوں اِتنے بُرے ہیں؟ اِس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض باتیں اُن کی ٹھیک بھی ہیں۔

اِس حالت کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ تفتیش و جستجو کا شوق پیدا ہوا اور اِس طرح میں پہلی مرتبہ اپنی ذاتی رائے و فکر سے ایک معاملہ پر غور کرنے لگا۔ میں نے تقویۃ الایمان دیکھی۔ گھر میں اُس کا جو نسخہ والد مرحوم کا تھا، وہ بہت پرانا کلکتے کا چھپا ہوا اور بہت ہی بُرے چھاپے کا تھا، جیسا کہ کلکتے کی بہت پُرانی چیزیں نہایت خراب ٹائپ کی ملتی ہیں۔ مجھے وحشت ہوئی، لیکن میں نے پڑھا۔ پھر مجھے ایک اور رسالہ بمبئی کا چھپا ہوا "نصیحۃ المسلمین" مولوی خُرّم علی کا ملا۔ اُس کے آخر میں ایک نظم بھی تھی۔ اُسی وقت کی پڑھی ہوئی، مجھے اب تک یاد ہے ؎

خدا فرما چکا قرآں کے اندر ۔۔۔ مرے محتاج ہیں پیر و پیمبر

جو خود محتاج ہوئے دوسروں کا ۔۔۔ بھلا اُس سے مدد کا مانگنا کیا!

مجھے اِس سے بڑی دلچسپی ہوئی۔ اب وہ وقت آتا جاتا تھا کہ آنکھیں کھلتی جاتی تھیں۔ مطالعے کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جاتا تھا۔ گھر سے باہر بھی درس کا سلسلہ شروع

ہو چکا تھا۔ رفتہ رفتہ میں بہت سی کتابیں دیکھ گیا، اور اب وہابیوں کے رد کے رسالے بھی جو مکان پر موجود تھے، میں دیکھنے لگا، اور گو اچانک رائے میں انقلاب ہو جانا دشوار تھا، خصوصاً ایسی انتہائی سلبی حالت جو پہلے تھی، تاہم سلب سے ایجاب تک آتے تک اگر مختلف ٹکڑے کر کے اُس کی ڈگریاں قرار دی جائیں، تو میں اب اِس ڈگری پر تھا کہ نفرت و وحشت بالکل جا چکی تھی۔ وہ بھیانک اور ہولناک تصوّر جو عجیب المخلوق وہابیوں کا دل پر نقش ہوا تھا، اب مٹ چکا تھا، اور ایک ایسی حالت پیدا ہو گئی تھی، جس کو ہمدردی اور میلان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

بے رحمی

اُس زمانے کی یہ بات مجھے یاد ہے کہ جب کبھی حسبِ معمول وہابیوں پر لے دے ہوتی، تو مجھے اچھا نہ معلوم ہوتا۔ میں بے اختیار کوئی نہ کوئی جملہ اُن کی موافقت میں کہہ دیتا۔ ایک مرتبہ ایک بڑا مجمع ایک مسکین شخص کو پکڑ کر ہمارے یہاں لایا۔ باہر دیوان خانے میں حافظ صاحب ایک جج کی طرح بیٹھے اور ملزم پیش ہوا۔ خوفناک الزام جو اُس پر لگایا گیا تھا، وہابیت کا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ جھوا بازار میں کوئی مسجد ہے۔ یہ وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں لوگوں نے شب برات کا حلوا تقسیم کیا اور اِسے بھی دیا۔ مگر اِس نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا، یہ بدعت ہے۔ جب بحث بڑھی تو لوگ پکڑ کے یہاں لے آئے۔ بڑا شور مچ رہا تھا۔ ایک مجرم کی طرح وہ ڈرا، سہما، وسطِ مجلس میں بیٹھا تھا اور لوگ اُس پہ گرج رہے تھے۔ حافظ صاحب مرحوم اِس بارے میں بڑے پُر جوش مجاہد تھے۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ وہابیوں کا علاج تمہیں معلوم نہیں۔ تم لوگ بحث

کرنے لگتے ہو۔ ان کا علاج جوتا ہے! اور یہ کہتے ہوئے گو بدبخت حریف سامنے موجود نہ ہو، لیکن وہ اپنے جوتے کی طرف ہاتھ اس طرح لے جاتے تھے، گویا اُتار کر ایک اسلحۂ جہاد کی طرح استعمال میں لانے کے لیے بالکل تیار ہیں! اُنھوں نے یہ اسلحہ بارہا استعمال بھی کیا تھا، اور اس کے کارنامے نہایت فخر کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے۔ ایک مثنوی بھی کبھی کبھی شوق میں آکر پڑھتے تھے، جو بڑی فصیح و بلیغ تھی۔ ایک شعر اُس کا مجھے اب تک یاد ہے:

وہابی بے حیا جھوٹے ہیں یارو
تڑاتڑ جوتیاں تم اِن کو مارو!

"تڑاتڑ" کے لفظ پر بہت زور دیتے تھے، گویا اس شعر میں جس عمل کی تلقین کی گئی ہے، اُس کی ساری اسپرٹ اسی لفظ میں مضمر ہے! چنانچہ وہ اِس موقع پر بھی پوری طرح تیار تھے کہ اِس حسن اتفاق سے پورا پورا کام لیں۔ اِس غریب نے صورتِ حال محسوس کر لی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس وقت مجھے اِس قدر رحم اُس پر آیا تھا کہ میں کہہ نہیں سکتا۔ میں بار بار سوچتا تھا کہ خدایا، اِس کا کیا قصور ہے؟ اِس نے کیا کیا ہے کہ اِس طرح لوگ اسے مارے ڈالتے ہیں؟

اساتذہ سے مباحثہ

سال بھر کے بعد میں ایک مستقل ذاتی فکر و رائے کے قریب پہنچ چکا تھا، اور علانیہ بحث و گفتگو میں اپنے خیالات ظاہر کرنے لگا تھا۔ والد مرحوم کے علاوہ اور جن اساتذہ سے پڑھنے کا اتفاق ہوا، وہ بھی تقریباً اِس بارے میں بہت ہی سخت

تعصب رکھتے تھے، تاہم ایسا ہوا کہ درس کی صحبتوں میں ہمیشہ میرے اعتراضات وسوالات کا میلان اسی طرف رہنے لگا، خصوصاً درسِ فقہ وحدیث میں۔

مباحث خلافیہ میں اِن لوگوں کے بحث واستدلال کا ایک خاص اسلوب ہے۔ اور خاص مقدار ہے، اور وہ مدّتوں سے درس وتدریس میں برابر چلی آتی ہے۔ نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے۔ احادیث مابہ النزاع اور مباحثِ فقہیہ ومباحثِ اصول، اِن سب میں چند بندھی ہوئی بحثیں ہیں اور وہی ہمیشہ دُہرائی جاتی ہیں، لیکن اب جبکہ فکرو نظر کی راہ مجھ پر کھُل چکی تھی، اور ذہن، تقلیدی بندشوں سے روز بروز آزاد ہوتا جاتا تھا، یہ بحثیں میری کیا تشفی کرسکتی تھیں۔

مسئلہ تقلیدِ ائمہ، تعین والتزام، انحصارِ تقلید در ائمہ اربعہ، ادعائے اجماعِ مرکب، سدِ بابِ اجتہاد ومنعِ نظر واحتجاج علی الاطلاق، مسئلہ اجماع، شرائطِ اجماع، توسیع مصالحِ مرسلہ، شرائطِ روایت ودرایت، ترجیحِ قیاس، انکار ترجیحِ صحاح وصحیحین، مسئلہ قراۃ فاتحہ خلف الامام، تامین، رفع الیدین، نفاذ قضاء قاضی ظاہراً وباطناً، نقضِ طہارت از قہقہہ وغیرہ مباحث ومسائل پر اساتذہ سے بڑی سرگرم بحثیں رہنے لگیں۔

مولوی نذیر الحسن مرحوم بڑے گویا اور قواعد منطقیہ سے خوب تقریر میں کام لینے والے آدمی تھے۔ درس کی تقریریں خوب منجھی ہوئی تھیں، لیکن اُنھیں بارہا تقریباً ہار ماننا پڑی۔ نور الانوار میں انحصار مذاہب اربعہ اور اجماعِ مرکب کی بحث ایک ہفتے تک جاری رہی۔ تین اساتذہ اکٹھے ہوگئے تھے اور بڑی بڑی تیاریاں کرکے صبح کو آتے تھے، لیکن میری تشفی نہیں کرسکتے تھے۔

مولوی محمد ابراہیم، جو بڑے مستعد مدرس تھے اور اُن کو استحضار بلا کا تھا، صفحوں کے صفحے کتابوں کے برزبان یاد تھے، اُنھوں نے، مجھے یاد ہے، مسئلۂ اجماع اور ایک مرتبہ قرأۃ فاتحہ میں بڑے زور لگائے اور خاص طور پر مطالعہ کیا۔ ہمارے ہی یہاں سے فتح القدیر اور دیگر شروحِ ہدایہ اور شقائق النعمان نکلوا کے دیکھتے رہے۔ مولوی عبدالحی مرحوم فرنگی محلی کا امام الکلام بھی لائے لیکن میرے اعتراضات بند نہ کرسکے۔

اِن فرعی مسائل میں تو واقعی میں محض اپنی قوّتِ بیانیہ کی مشق کیا کرتا تھا، یا قواعد منطق و مناظرہ کی، لیکن اصول میں تو واقعی تشفی و طمانیتِ نفس چاہتا تھا، مگر نہیں ملتی تھی۔ حقیقت اجماع، التزام و تعیّن تقلید، سدِّ باب اجتہاد مطلق بلکہ اجتہاد فی المذہب اور اجتہاد منتصب، اور قواعد ترجیحاتِ اقیسہ پر نصوص بجحتہ قیاس جلی، یا تعارض، یا عدم تفقّہ راوی، یا ترجیح مذہبِ راوی بر روایت وغیرہ ذالک میں میرا دل شکوک و اضطراب سے لبریز تھا، اور میں واقعی برہان و یقین کے لیے تشنہ تھا، مگر کوئی بات دل میں اٹکنے والی نہیں ملتی تھی۔

میں نے درس میں محدود نہ رہ کر بطورِ خود اِس باب میں بھی مطالعہ جاری رکھا، اور جن جن کتابوں پر اساتذہ نے زور دیا، اُن کو تو خاص طور پر محنت سے پڑھا۔ والد مرحوم نے ہمیں ابن نجیم کی "اشباہ والنظائر" بھی پڑھائی تھی، گو پوری نہ ہوئی۔ اِس نے تو اور طرح طرح دروازے شکوک و اضطرابات کے کھول دیے۔ فتح القدیر، عینی شرح ہدایہ، بحر الرائق، شرح سفر السعادۃ شیخ دہلوی، عینی علی الکنز، جواہر نیرہ شرح قدوری، شرح معانی الآثار، مختصر مشکل الآثار،

(اُسی وقت حیدر آباد سے چھپ کر آئی تھی) منار کی تمام شرحیں جو مل سکیں، تفسیر احمدی ملا جیون، اور اور بہت سی شرحیں وغیرہ میں دیکھتا اور مشکلات، جو پیش آجاتیں، اساتذہ سے حل کراتا، اور مسائل کا درس، درسیات کی جگہ عام وسعت اختیار کر لیتا، تاہم مجھے یاد نہیں کہ اِن تمام مسائل میں اُس وقت دل کو اطمینان حاصل ہوا ہو۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ حقیقت کچھ اور ہے اور یہ جو کچھ ہے، محض بحث و رائے کا ایک طلسم ہے، جس میں اُلجھ کر بسا اوقات رہ جاتے ہیں اور مجبور ہو کر قدم روک لینا پڑتا ہے، لیکن حقیقت سامنے نہیں آتی۔

والد سے بحث

خود والد مرحوم نے، مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ بیضاوی پڑھاتے ہوئے ضمناً قرأۃ فاتحہ کی بحث چھیڑی اور ایک بہت مفصل تقریر کی۔ زیادہ تر وہی نظریے اور دلائل تھے۔ روایت کی بنا پر بڑا زور وہی ابو ہریرہ کی مشہور روایت پر تھا کہ "اقرأبہا فی نفسک" اور فی نفسک سے استدلال یہ کیا جاتا تھا کہ قرأۃ باللفظ والصوت سے منع کیا اور قرأۃ نفسی کا حکم دیا۔ پھر قرأۃ نفسی کے یہ معنی کیے جاتے تھے کہ نفس کا تخیل و تصور۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس وقت بھی میرا ذہن یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ صدر اوّل کی زبان، فلسفہ و منطق کی زبان نہ تھی۔ میں نے معترضین کی طرف منسوب کر کے عرض کیا کہ کہا جائے گا کہ آنحضرتؐ کے ارشاد کا یہ مطلب کہاں ہے؟ عربی میں نفس کا اطلاق ایسے موقعوں پر تو ذاتِ خاص پر ہوتا ہے، جیسے خود آپ

یا فارسی میں کہتے ہیں، خود، چنانچہ نفسہ وانفسکم وغیرہ کا مطلب، فلسفے کا مصطلحہ نفس نہ ہوگا، بلکہ یہی ہوگا کہ اُس کی ذات، اور تمہارے ذوات، مثلاً کہیں گے "جاء بنفسہ" تو یہ مطلب تو نہ ہوگا، جو اس حدیث میں بتلایا جاتا ہے۔ پس اقرأ فی نفسک تو معترضین کے لیے مفید ہے نہ کہ قائلین کے لیے۔ اِس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ فی نفسک یعنی اپنے اندر پڑھ لے۔ مقصود یہ تھا کہ پکار کر نہیں پڑھنا چاہیے۔ اس طرح آہستہ آہستہ پڑھنا چاہیے، جیسے آدمی اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے۔

والد مرحوم ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھنے لگے، اِس لیے کہ جہاں تک میرا خیال ہے، یہ بالکل نیا اعتراض تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اب خود دیکھا تو معلوم ہوا کہ اتنی صاف اور قطعی بات، فریق ثانی کی کسی کتاب میں بھی موجود نہیں ہے، البتہ مولوی عبدالحی مرحوم نے آہستہ پڑھنے پر اس سے استدلال ضرور کیا ہے، مگر پھر بھی یہ اعتراض نہیں کیا، حالانکہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عربی زبان میں قطعاً وہ معنیٰ نہیں ہو سکتے، جو ابن ہمام وغیرہ کہتے ہیں۔ والد مرحوم نے کہا کہ اپنے آپ سے کہنے کا کیا مطلب ہوا؟ یہی مطلب ہوا کہ اپنے ذہن میں تصوّر کرے۔ میں نے کہا، تصور کا تو یہاں کچھ بھی ذکر نہیں ہے۔ صرف اقرأ موجود ہے اور اعتراض یہ ہوگا کہ قرأۃِ صوتی اور قرأۃِ نفسی کی جو تقسیم اب کی جاتی ہے، یہ اُس وقت کہاں تھی؟ مگر اِس پر اُنھوں نے توجہ نہ کی، اور اِسی پر زور دیتے رہے کہ مقصود یہ ہے کہ ویسی قرأۃ نہ کی جائے، جیسی آہستہ یا پکار کے کی جاتی ہے، اور وہ تیسری چیز یہی ہے جو ہم کہتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ اعتراض دفع نہ ہوا، لیکن میں زیادہ اصرار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ایسے معاملات اور پیش آتے تھے۔ اگر سوچ سوچ کر اُن تمام باتوں کو یاد کروں، تو ایک بڑا دفتر ہو جائے گا۔ اس زمانے میں یہ چیز یہاں تک ذہن پر چھا گئی تھی کہ بارہا اِن مسائل پر بطور رسائل کے بہت کچھ لکھ ڈالا۔ جس قدر تقریر پڑھتا یا سُنتا تھا، اُس سب پر بترتیبِ اعداد، اعتراضات قلم بند کرنے لگتا۔ ایسے بہت سے کاغذات اب بھی نکل آتے ہیں۔ اِس میں شرح سفرُ السعادۃ کا ایک نسخہ میرے پاس تھا۔ وہ اب مجھے ملا، اور میں نے دیکھا تو تمام حاشیہ سیاہ ہے۔ فیروز آبادی علامہ ابنِ قیم کے شاگرد تھے۔ اِس سے اُن کے مسلک کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ سفرُ السعادۃ یا صراطِ مستقیم اُنھوں نے زاد المعاد سے اخذ کر کے لکھی ہے، اس میں شک نہیں کہ اپنے باب میں بہترین مختصر متن ہے۔ شیخ نے اُس کی شرح صرف اس لیے لکھی کہ حنفیت کا انتصار اور اُس کے ابواب و تراجم کا رد کیا جائے، اور اِس میں شک نہیں کہ بڑا ہی زور لگایا ہے۔ نہیں معلوم کیوں؟ مجھے اُس وقت یہ خبط ہوا کہ اُس کی جلد توڑی اور دفتری کو دے کر مکرر اِس طرح بندھوائی کہ ہر دو ورق کے درمیان ایک سادہ ورق آگیا، اور اُس پر اعتراضات اور اُن کے دلائل کا رد لکھنا شروع کیا۔ اصل کتاب چونکہ فارسی میں ہے، اس لیے یہ بھی فارسی میں۔ مقدمے میں اُنھوں نے جہاں بابِ تقلید میں مسلکِ متقدمین و متاخرین کی دو قسمیں وضع کر کے اور اپنے زمانے کے لیے آخر الذکر کی ترجیح پر زور دیا ہے، یعنی کتبِ فقہیہ متاخرہ پر امتناع و اکتفا بتقلیدِ محض، اور پھر اِس کے وجوہ بیان کیے ہیں، میں نے صفحہ بصفحہ اُن پر اپنے اعتراضات و شکوک جمع کیے تھے۔

اب اُن کتابوں کا بھی پوری طرح شوق ہوا، جو ان مسائل پر بطریق مباحثہ و مناظرہ لکھی گئی ہیں۔ بڑا ذخیرہ گھر میں موجود تھا بعض اُردو کتب جدل و بحث، جو نہیں تھیں، حاصل کر کے دیکھنے لگا۔ ظفر المبین کے رد میں فتح المبین اور نصرۃ المجتہدین لکھی گئی ہے۔ پھر اس کا جواب الکلام المتین یا کسی ایسے ہی نام سے دیا گیا ہے، اور اس سلسلے میں فریقین کی متعدد کتابیں نکلی ہیں، اسی زمانے میں میں نے منگوا کر دیکھیں اور فتح المبین کے حاشیے پر جا بجا اعتراضات لکھے۔ اسی زمانے میں معیار الحق دیکھی، اور اس کا جواب ارشاد الحق، مولانا ارشاد الحق رامپوری کا، اور مجھ پر معیار کی سنجیدہ اور وزنی بحث کا بہت اثر پڑا، اور صاحب ارشاد الحق کا علمی ضعف صاف صاف نظر آگیا۔

حیلے بہانے!

اسی زمانے میں ایک پورا کتب خانہ ہاتھ آگیا۔ اس میں اشاعۃ السنۃ لاہور اور نصرۃ السنۃ بنارس کی تمام پرانی جلدیں تھیں۔ انھیں بھی دیکھا۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی کتابیں سب سے پہلے اسی زمانے میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بہت سی ان مباحث کی وہ کتابیں جو غدر سے پہلے اوائلِ شیوعِ نزاع میں لکھی گئیں، اور جو سب والد مرحوم کی کتابوں میں تھیں، میں نے نکالیں اور دیکھیں۔ والد مرحوم سے یہ تو کہہ نہیں سکتا تھا، کہ یہ کتاب دیکھنا چاہتا ہوں، کیونکہ وہ صرف درسیات کے انہماک پر زور دیتے تھے، اسی لیے طرح طرح کے حیلے بہانے پیدا کر لیتا تھا، مثلاً کتابوں کو دھوپ لگانی چاہیے۔ بہت دنوں سے صندوق کھُلے نہیں ہیں، یا والد نے کوئی خاص کتاب نکلوائی

چاہی۔ اِس طرح موقع نکال کے ایک ایک کتاب کو دیکھا، کیونکہ کوئی مرتّب فہرست نہ تھی۔

شاہ ولی اللہ کا مسلک

اِنہی مباحث نے ایک بڑا دروازہ مطالعے کا کھولا۔ آگے چل کر یہ میری زندگی کے خاص مؤثرات میں سے ثابت ہوگا۔ اِن مباحث میں شاہ ولی اللہ مرحوم کا اکثر ذکر آتا تھا۔ والد مرحوم اِسی خاندان کے شاگرد تھے۔ اور اِس خاندان کا تذکرہ ہمیشہ سُننے میں آتا تھا، اِس لیے شاہ صاحب کے نام سے ابتدا ہی سے میں آشنا ہوگیا تھا، مگر کوئی خاص کشش نہ تھی۔ اِن مباحث کے سلسلے میں میں نے "عقد الجید" اور "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" گھر کی کتابوں میں تلاش کر کے نکالی اور دیکھی۔ انصاف کی ایک عبارت میں "اِنَّ" اور "اَنْ" کی بحث بھی چھڑ گئی تھی۔ اِس کا موقعہ ٹھیک یاد نہیں، اِس لیے میں نے بڑی دلچسپی سے اِس کا مطالعہ کیا۔ شاہ صاحب کا اسلوب اِن دونوں رسالوں میں ایک خاص طرح کا واقع ہوا ہے، اور ایک ظاہر بین نگاہ ابتدا میں اُن کا اصلی مشرب نہیں پا سکتی۔ حجۃ اللہ کے باب "سببِ اختلاف" میں یہ زیادہ کھلتا ہے اور مقدمہ "فصوص" بدور بازغہ اور تفہیمات الٰہیہ میں تو بالکل ہی پردہ اُٹھا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقد الجید اور انصاف سے دونوں فریق استشہاد کرتے ہیں۔ ابتدا میں مَیں بھی کچھ ٹھیک اندازہ نہ کر سکا، لیکن جوں جوں مطالعہ بڑھتا گیا اور اُن کی دیگر تصانیف سے ذوق ہوتا گیا، اُن کا مسلک نمایاں ہوتا گیا۔ اوائل میں مَیں نے یہ دو رسالے اور دیگر رسائلِ تصوّف اور قرۃ العین مطالعہ کی تھیں۔

سرسیّد کی تقلید کا دَور

یہ زمانہ تھا اور ذہن و دماغ اِس عالم میں کہ اچانک ایک نئی راہ سامنے آئی۔ میرا اشارہ سرسید کے مصنّفات کی طرف ہے۔ چونکہ اِس واقعہ نے میرے عقائد و افکار کی زندگی پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے، اس لیے میں زیادہ تفصیل سے بیان کروں گا۔

والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ گمراہی کی موجودہ ترتیب یوں ہے کہ پہلے وہابیت، پھر نیچریت۔ نیچریت کے بعد تیسری قدرتی منزل، جو الحادِ قطعی کی ہے، اُس کا وہ ذکر نہیں کرتے تھے، اِس لیے کہ وہ نیچریت ہی کو الحادِ قطعی سمجھتے تھے، لیکن میں تسلیم کرتے ہوئے اِتنا اضافہ کرتا ہوں کہ تیسری منزل، الحاد ہے، اور ٹھیک ٹھیک مجھے بھی پیش آیا۔ سرسیّد مرحوم کو بھی پہلی منزل، وہابیت ہی کی پیش آئی تھی۔

اصل یہ ہے کہ عقائد و فکر کے توسیع و تطوُّر کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ تقلید کی بندشوں سے پاؤں آزاد ہوں۔ وہابیت اِس زنجیر کو توڑتی ہے۔ اب اگر اِس کے بعد آزادیٔ فکر، بے قیدی و مطلق العنانی کی صورت اختیار کرلے، تو بلاشبہ یہ نہایت مضر صورتیں بھی اختیار کرسکتی ہے۔

زندگی کے اِس حصے میں میری دماغی حالت حسبِ ذیل تھی۔

(۱) تقلید و رسوم کی بندشیں ٹوٹ چکی تھیں۔

(۲) تقلید آبا و اجداد کے تمام نقوش اگر مٹ نہیں چکے تھے، تو بہت مدّھم پڑ چکے تھے۔

(۳) لیکن آزادیٔ فکر نے ابھی کوئی مطمئن حالت حاصل نہیں کی تھی۔ شکوک و

شبہات نئے نئے اُٹھ رہے تھے۔ گردوپیش میں اُس کے دفع کی قوت نہ تھی، بلکہ ضعف کی وجہ سے اور برانگیختگی ہو رہی تھی۔ اکثر حالتوں میں شکوک فتح مند رہتے تھے۔ مطالعے کی وسعت انھیں بڑھا رہی تھی اور نئے نئے میدان بھی کھل رہے تھے۔

(۴) طبیعت قدرتی طور پر پوری طرح کسی نئی حالت کے لیے تیار و منتظر تھی۔

سرسیّد کی تصنیفات جب نظر سے گزریں، تو بالکل ایک نئی دنیا نظر کے سامنے آ گئی۔ طبیعت چونکہ موجودہ و سابقہ حالات سے بالکل متوحش ہو چکی تھی، اور ماحول میں کوئی غالب مؤثر موجود نہ تھا، اِس لیے قدرتی طور پر اِس نئے عالم کی دلفریبیوں نے مسحور کر لیا۔ جوں جوں بڑھتا گیا، مسحوریت بھی بڑھتی گئی، حتیٰ کہ اب ایک مسمریزم کے معمول کی طرح میری دماغی فعالیت بالکل عامل کے قبضے میں تھی۔ تقریباً چھ مہینے کے اندر میں نے سرسیّد کی تمام کتابیں دیکھ ڈالیں، اور اچانک ایسا معلوم ہوا کہ ایک بے حد عجیب و مدہش اور بلند تر پُر عظمت عالم میں آ گیے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بالکل ایک مخمور دماغ کی سی حالت رہنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک عجیب و غریب خزانہ قبضے میں آ گیا ہے۔ اُس پر فخر تھا، غرور تھا، اور اُس کے سامنے فکر و عقائد کی تمام پچھلی باتیں ہیچ نظر آتی تھیں۔ میں نے "ہیچ" کہا، لیکن یہ بھی ابتدائی احساس تھا۔ بعد کو یوں ہوا کہ حقارت کی جگہ اُن کی ذلت کا احساس ہونے لگا۔ اِس خیال سے شرم محسوس ہوتی تھی کہ چھ مہینے پہلے میرے ایسے عقائد تھے، اور تعجّب ہوتا تھا کہ کیوں ایسے دقائق سے اب تک محروم رہا! اب معاملہ، تقلید و عدم تقلید، وہابیت و حنفیت سے گزر چکا تھا، اور ایک ایسی بلندی پر اپنی جگہ محسوس ہوتی تھی، جہاں سے یہ تمام جماعتیں، یہ تمام عقائد و افکار، اور یہ تمام

جھگڑے بالکل حقیر دکھائی دیتے تھے، خواہ حنفی ہوں، خواہ غیر مقلد، شیعہ ہوں یا سنّی، ماتریدی ہوں یا اشعری۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھی اسلام کی اصلی حقیقت، یا سرسید کی اصطلاح میں "ٹھیٹ" اسلام سے آشنا نہیں۔ قرآن کے اصلی حقائق و معارف اور مذہب کی اصلی تعلیمات تو وہ ہیں جن کے چہرے پر سے تیرہ سو برس بعد اِس مجدّدِ اعظم (جیسا کہ میری اُس وقت کی بول چال تھی، یعنی سرسیّد) نے پردہ ہٹایا ہے!

دماغی سرشاری

میرے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ اُس زمانے کی دماغی سرشاری اور قلبی مخموری کی پوری تصویر کھینچ سکوں۔ میں ایک بُت کی طرح سرسیّد کی پوجا کرتا تھا۔ اُن کی عظمت میرے دل کے ریشے ریشے میں رچ گئی تھی۔ اُن کا وجود میرے ذہن میں فضائلِ انسانی کا ایک مکمل نمونہ تھا، جس کی طرف ایک شائبۂ نقص بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا تھا! بارہا حسرت ہوتی تھی کہ "یالیتنی کنت معہٗ!" [1] میں سوچتا کہ اگر وہ اس وقت موجود ہوتے، تو میں کس طرح تمام علائق ترک کر کے اُن کے پاس چلا جاتا، اور کس طرح اُن کی پرستش کرتا!

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ انسان، تقلید سے کبھی باز نہیں آتا۔ ترکِ تقلید ہی کے نام پر وہ جن شخصوں کی عزت کرتا ہے، اُنہی کی تقلید شروع کر دیتا ہے۔

---

[1] اے کاش میں اُن کے ساتھ ہوتا!

میں نے سرسیدؔ سے سب سے بڑی چیز، جو اُس وقت پائی تھی، وہ یہی ترکِ تقلید تھی۔ مفسّرین کی، فقہاء کی، محدثین کی، متکلمین کی، تمام علما کی، تیرہ سو برس کے تمام اجماعی عقائد و مسلّمات کی اور اُن کروڑوں اور اَن گنت مسلمانوں کی، جو تیرہ صدیوں میں گزر چکے، تاہم میں خود سرسیدؔ کا نہ صرف مقلّدِ اعمیٰ تھا، بلکہ تقلید کے نام سے پرستش کرتا تھا!

میں اِس قیمتی علم پر نازاں تھا کہ توحید کے معنیٰ نہ صرف توحیدِ فی الذّات کے ہیں، بلکہ توحیدِ فی الصفات کے بھی، یعنی جو شخص، خدا اور اُس کے کلام کو مان کر پھر کسی دوسرے انسان کے قول کو قرآن ہی کی طرح بلا دلیل واجب التسلیم سمجھتا ہے قولاً یا فعلاً، تو وہ بھی شرک کا مرتکب ہے۔ اِسی طرح شرک فی صفۃِ النبوّۃ، شرک فی صفۃِ القرّان وغیرہ ترکیبیں میری زبان پر چڑھی ہوئی تھیں، اور میرا خیال تھا کہ یہ نہایت قیمتی تعلیم مجھے سرسیّد سے ملی ہے!

لیکن کبھی ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آتا تھا کہ سرسید اِس سے کیوں مستثنیٰ ہو جائیں گے؟ اُن کے مجتہدات کے تسلیم و اِدعان میں اِس درجہ استغراق اور اُس کے نقص و ضعف سے اِس درجہ مبرّا ہونے پر یقین کا مل، کیوں شرک فی صفۃِ القران نہ سمجھا جائے؟

ایک نئی بلا!

تفسیر القرآن اور تہذیب الاخلاق اور دیگر رسائل کے مباحث، شدّتِ تاثّر و اِستلِذاذِ طبع سے مجھے تقریباً حفظ ہو گئے تھے، اور اب بحث و مباحثے کا رُخ

بالکل بدل گیا تھا میرے اساتذہ کو اب ایک نئی مصیبت پیش آئی۔ پہلے وہابیت سے مقابلہ تھا، اب یہ ایک دوسری بلا تھی۔ اِس کی رسم و راہ سے وہ بے خبر نہ تھے، اِس لیے مقابلہ بہر حال ہوتا تھا، لیکن یہ اسلحہ بالکل نئے تھے۔ اِس کے بچاؤ کے لیے وہاں کوئی ڈھال نہ تھی۔ اعتراضات نئے، دلائل و براہین نئے، نتیجہ یہ نکلا کہ میری تشفّی یا دفعِ اعتراضات تو بڑی بات ہے، اس سوال کا فیصلہ کرنا اُن کے لیے دشوار ہو گیا کہ میرے عقائد اُن کی معلومہ تقسیمات کے مطابق گمرہی کی کس قسم میں داخل ہیں؟ عموماً اِسے کبھی اعتزال سے اور کبھی دہریت سے تعبیر کیا جاتا تھا!

البتہ خدا بخشے مولوی نذیر الحسن مرحوم، جنھوں نے گو سرسید کی تصنیفات دیکھی نہ تھیں، مگر سُنے سُنائے عقائد معلوم تھے، اِسے نیچریت سے تعبیر کرنے لگے، اور پھر انھیں تعبیر کے لیے ایک قسم ہاتھ آ گئی۔ میرے ہاتھوں وہ سخت عذاب میں تھے۔ سوءِ اتفاق سے اِسی زمانے میں شرحِ مواقف کے کچھ اسباق والد مرحوم سے اور باقی اِن سے جاری تھے۔ باب آیا، ضرورت و دلائلِ نبوت کا، اور اِن کا یہ حال ہو گیا کہ چیختے چیختے تھک جاتے، کتاب زمین پر پٹک دیتے، اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے، مگر میرے اعتراضات اپنی جگہ سے نہ ہلتے۔ میری وجہ سے اساتذہ کو خاص طور پر عقائد و کلام پر توجہ ہو گئی اور بڑی محنت سے مطالعہ کرنے لگے۔ بڑی چیز اُن کے پاس تفسیر کبیر تھی۔ خوب خوب مطالعہ کر کے آتے تھے اور درماندہ ہو کر رہ جاتے تھے۔ تاہم یہ ضرور تھا کہ اب تک اِس کو محض طبیعت کی کاوش اور بحث و اعتراض عادت سے تعبیر کیا جاتا تھا، یہاں تک نوبت نہ پہنچی تھی کہ سمجھا جاتا، میرے عقائد بھی ایسے ہی ہیں۔

بھائی مرحوم کی ذہنی حالت

اُس وقت کے خیالات عجیب تھے۔ مقتضائے عمر سے ہم بھائیوں میں ایک طرح کا علمی تناقض بھی تھا۔ درس میں، مطالعے میں، جمعِ کتب میں، تلاشِ معلوماتِ جدیدہ میں۔ بھائی مرحوم اِس کوچے سے نا آشنا تھے۔ نئی کتابوں کے مطالعے کا اُنھیں بھی پورا شوق ہو چکا تھا، لیکن سر سیّد کی مذہبی تصنیفات نہ دیکھی تھیں، اور نہ شوق تھا۔ اِس اعتبار سے وہ ایک بڑی محفوظ و مطمئن حالت میں تھے۔ وہ خاندانی عقائد کا بالکل مجسمہ تھے، اور اپنے عقائد رسوم کے خلاف ٹھیک ٹھیک وہی عصبیت رکھتے تھے، جو والد مرحوم سے انھیں ملنی چاہیے تھی۔ ملنی تو مجھے بھی چاہیے تھی، لیکن میرے لیے قضا و قدر نے دوسرا ہی سامان رکھا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اُس وقت مجھے اِس خیال سے خوشی ہوتی تھی کہ روشن خیالی کا جو "بابِ معرفت" مجھ پر کھلا ہے (اِن خیالات کو میں روشن خیالی سے تعبیر کیا کرتا تھا) اُس سے بھائی بالکل محروم ہیں، اور یہ ایک ایسی مزیّت ہے جس کے وہ سہیم و شریک نہیں ہیں!

ذہانت سے والد کا خوف

بھائی مرحوم کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میرے خیالات میں دہابیت کی طرف میلان پیدا ہو چکا ہے۔ وہ اِس پر بگڑتے بھی تھے اور ایک دو بار والد مرحوم کے سامنے بھی اُنھوں نے اِس کا اشارہ کر دیا تھا۔ اُس وقت تک والد مرحوم کو میرے عقائد و خیالات کی بابت یقین کے ساتھ کوئی بدگمانی نہیں ہوئی تھی، مگر اِس خیال کی بنیاد پڑ چکی تھی،

کہ اِس کی طبیعت ہر طرف دوڑنے لگی ہے، اور خیالات محفوظ نہیں ہیں۔ کئی بار اُنھوں نے فرمایا بھی تھا "مجھے اِس کے آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ بہت زیادہ ذہانت، انسان کے لیے بسا اوقات گمرہی کا ذریعہ ہو جاتی ہے۔ میں اِس کی ذہانت سے ڈرتا ہوں!"

پھر بعض اشخاص کے حالات سُناتے تھے، جو ذہانت وطباعی کی وجہ سے ہر طرف خیال دوڑانے لگے اور بالآخر دین و دنیا سے کھوگیے۔

ذہانت کے پیچھے دہریت

مجھے یاد ہے، اِسی سلسلے میں ایک دن مولوی عبدالرحیم گورکھپوری کے حالات سُنائے۔ یہ شاہ عبدالعزیز مرحوم کے بڑے پُرانے شاگرد تھے، اور — والد مرحوم کہتے تھے — کہ نانا مرحوم جب شاہ صاحب سے پڑھنا ختم کر چکے تھے، تو یہ نئے نئے درس میں شریک ہوئے تھے، لیکن اُس وقت بھی اِن کی ذہانت وطبّاعی کا یہ حال تھا، کہ شاہ صاحب کے حلقۂ تلامذہ میں، جو اُس وقت علمی جماعتوں کا خلاصہ و عطر تھا، کوئی شخص اِن کی ٹکّر کا نہ تھا۔ معقولات کے حافظ تھے، اور ہنگام درس ایسے ایسے اعتراضات اور ایسے ایسے نُکتے اور پہلو تراشتے تھے کہ شاہ صاحب کو بھی اعتراف کرنا پڑتا تھا۔

یہ حال دیکھ کر شاہ صاحب کہا کرتے تھے، مجھے تمہاری ذہانت اور طبّاعی کے پیچھے دہریت کھڑی نظر آتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دلّی سے کلکتہ آئے اور یہاں انگریزوں کی نوکری کرلی۔ پھر اُن کی زبان اور علوم کا شوق ہوا، اور چند دنوں کے بعد کھُلّم کھُلا مُلحد و دہری ہوگیے۔ خدا کے وجود پر ایک سو سترہ اعتراضات

ایسے کیے تھے، جن کی نسبت دعویٰ تھا کہ تمام دنیا کے عقلا بھی اکٹھے ہو جائیں، تو بھی جواب نہیں دے سکتے۔ غرضکہ ذہانت و دانشمندی، موجب ہلاکت ہوئی اور سرے سے ایمان و یقین ہی کھو بیٹھے!

غدر سے پہلے ایک عجیب ہستی

یہاں مولوی عبدالرحیم کا استطراداً ذکر آگیا ہے! تو چند کلمے اور کہہ دینے چاہیے۔ یہ بھی اُن لوگوں میں سے ہیں، جنھوں نے غدر سے بہت پہلے محض اپنی رسائی ذہن و فکر سے دنیا کا علمی انقلاب محسوس کیا، اور نئے علوم سے آشنا ہوئے۔ نیز یورپ کی زبانیں سیکھیں اور اس حد تک قابلیت حاصل کی، جو آج باوجود نئی تعلیم کے عموم و رواج کے کم یاب ہے۔

عام طور پر یہ "عبدالرحیم دَہری" کے نام سے مشہور رہیں، لیکن میں نے بہت جستجو کی، بجز شہرتِ عام کے کوئی تحریری ثبوت اُن کی دہریت کا نہیں ملا۔ معلوم نہیں، صحیح معنوں میں دہری بھی تھے، یا یہ بھی لوگوں کی اختراع ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی کی آنکھوں سے دیکھا جائے، تو ابوالفضل، فیضی، اور نہیں معلوم اور کتنے عہدِ اکبری میں بھی دہری تھے، لیکن وہ جیسے دہری تھے، اُس کا حال ہمیں معلوم ہے۔

عموماً ایسا ہوا ہے کہ جہاں ایک شخص نے شاہ راہِ عام سے باہر قدم اُٹھایا یا مذہبی عقائد کے باب میں استدلال و احتجاج کی کوئی نئی شکل اختیار کی، یا اُس طرح کا مشرب، جیسا سرسید وغیرہ کا تھا، تو عام طور پر اُسے دہریت ہی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ معتزلہ کی نسبت بھی ایسے ہی خیالات ظاہر کیے گئے تھے، پس

عجب نہیں کہ مولوی عبدالرحیم کا بھی یہی حال ہو، اور عقلیات کے اشتغال و انہماک کی وجہ سے دہری مشہور ہو گئے ہوں، یا ممکن ہے اس کی کچھ اصلیت ہو۔ بہر حال ان کی جو تصنیفات پائی جاتی ہیں، اُن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔

مولوی عبدالرحیم "دہری"

جیسا کہ اوپر گزرا، شاہ صاحب کے شاگردوں میں ہیں اور مولانا اسماعیل شہید کے ہم درس۔ کلکتے میں نیا نیا فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تھا، اس میں بحیثیت مدرس کے ملازم ہو گئے۔ اور ڈاکٹر مارٹن وغیرہ، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں ہندستان کے یورپین علما میں بہت ممتاز لوگ تھے اور فارسی کی بھی بہت اچھی استعداد رکھتے تھے، اُن کی صحبت رہی۔ اسی وجہ سے نئے علوم کا بھی شوق ہوا، اور انگریزی اور لاطینی (جو اُس وقت تک یورپ کی کلاسیکل زبان ہونے کی وجہ سے ضروری سمجھی جاتی تھی) سیکھی۔

انگریزی میں ایسی عمدہ استعداد پیدا کر لی تھی کہ مشہور رہے، پردے کی دوسری جانب وہ بٹھا دیئے جاتے تھے۔ اور انگریزی میں تقریر کرتے تھے۔ اور اس طرف بڑے بڑے قابل انگریز بیٹھتے تھے، اور مقرر کی شخصیت کی نسبت دھوکہ کھا جاتے۔ سب کہتے کہ یہ یقیناً کوئی انگریز بول رہا ہے۔ اُن کا لب و لہجہ اس درجہ فصیح اور مثل اہل زبان کے تھا۔ ساتھ ہی لیٹن بھی ایسی ہی فصاحت سے بولتے تھے۔

عربی، فارسی، ترکی، پشتو، اور ہندستان کی زبانوں میں بھی یہی حال تھا۔

ایک مجلس میں کئی عرب، ایرانی، انگریز، افغانی جمع ہو گئے تھے۔ اس کا حال

صاحب "تحفۃ العالم" نے لکھا ہے۔ وہ ایک ہی مجلس میں عرب سے بالکل عرب کی طرح، ایرانی سے (یعنی مصنف تحفۃ العالم سے) بالکل ایرانی لب ولہجے میں، انگریز سے ٹھیک ایک انگریز کی طرح، اور افغانی سے ایک افغانی کی طرح باتیں کرتے تھے، اور تمام مجلس کا یہ حال تھا کہ نقشِ تصویر تھی! والد مرحوم بھی نقل کرتے تھے کہ اُن کی عربی و فارسی تقریر ایسی فصیح ہوتی تھی کہ شاید ہی کسی ہندستانی کی ہوگی۔

ریاضی و ہندسے کے بہت بڑے ماہر تھے۔ ایک بہت ضخیم کتاب، ریاضیات میں جدید تقسیم و اضافات کے ساتھ عربی میں لکھی ہے، جو فورٹ ولیم کالج پریس میں چھپی اور میرے پاس موجود ہے۔ "جامع العلوم"۔ جامع العلوم اِس لیے کہ اِسی طرح تمام علوم کے ضبط کا ارادہ تھا اور شروع ریاضی سے کیا تھا۔

پرنس اعظم شاہ ابن ٹیپو سلطان کی فرمائش سے، جان مارش کلاک کی ہسٹری آف انڈیا کا نہایت ہی فصیح اور بامحاورہ فارسی میں ترجمہ کیا اور بپٹسٹ مشن پریس میں بڑے اہتمام سے نستعلیق ٹائپ میں چھپی ہے۔ باوجود عربی الفاظ سے اجتناب کے اور انگریزی ترجمے کے، عبارت بڑی چُست اور شگفتہ ہے۔ ایک فارسی میں پند نامہ، جس میں گلستاں کے طرز پر چھوٹے چھوٹے پند لکھے ہیں اور عربی الفاظ سے اجتناب کا التزام کیا ہے، یہ بھی چھپ گیا ہے۔

ایک رسالہ، عربی میں جرِ ثقیل پر ہے اور اس میں جدید علم میکانک کے اصول ضبط کیے ہیں۔ میکانک کی جگہ منجنیق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ دیباچے میں لکھا ہے کہ ہم نے عبارت کی صحتِ قراۃ کے لیے انگریزی کی علاماتِ قراۃ استعمال کی ہیں۔ پھر پورے پنکچوایشن کو نقل کیا ہے، اور میں نے "کامے" کا اُلٹا استعمال

سب سے پہلے اِسی میں دیکھا۔ بعد کو بمبئی میں منشی غلام محمد نے ایک رسالے میں یہ صلاح دی اور لکھا کہ داؤ کے اشتباہ سے بچنے کے لیے اِسے منقلب کر دینا چاہیے۔ پھر سر سیّد مرحوم بھی اِسی طرح تہذیب الاخلاق میں استعمال کرنے لگے۔

علومِ جدیدہ کے داعی

لوگ یہ سُن کر تعجّب کریں گے کہ سر سیّد سے بہت پہلے مسلمان علما میں انگریزی زبان اور نئے علوم کی ترویج کے کتنے ہی حامی و دُعات گزر چکے ہیں۔ مولوی عبدالرحیم اِن سب میں مقدّم ہیں۔ اِن کا زمانہ تو لارڈ میکالے کا زمانہ ہو گا۔ تقریباً اِسی زمانے میں لارڈ میکالے نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی قدیم پالیسی سے اختلاف کیا، اور اپنی مشہور تاریخی یادداشت پیش کی، جس میں قدیم مشرقی السنہ و علوم کی جگہ انگریزی زبان اور نئے علوم کی ترویج پر زور دیا تھا۔ مجھے ایک رسالہ مولوی عبدالرحیم کا فارسی میں ملا، "عرض داشت در بابِ ضرورت ترویج زبانِ انگریزی و علومِ فرنگ"۔ یہ دراصل ایک سوال کا جواب ہے، جو اُس وقت حکام نے تعلیم کے باب میں شائع کیا تھا۔ مقصود اِس سے یہ ہو گا کہ جہاں تک ممکن ہو، اہلِ ہند کی خواہشیں بھی اِس باب میں معلوم کی جائیں۔

اُس وقت اِن مسائل کو کون محسوس کرنے والا تھا، لیکن ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے اور مسلمانوں میں مولوی عبدالرحیم، دو شخص کلکتے میں تھے، جنھوں نے اِس پر توجہ کی۔ راجہ رام موہن رائے کی عرض داشت بنام لارڈ وارن ہسٹنگز مشہور ہے، لیکن مولوی عبدالرحیم کا حال لوگوں کو معلوم نہیں۔ اِنھوں نے انگریزی

زبان اور نئے علوم کی تحصیل و ترویج کے موضوع پر ایسی جامع بحث کی ہے، جیسی کہ اب کی جاسکتی ہے۔ تمام وجوہ و دلائل، جو بعد کو بحث میں آئے، وہ سب اِس میں موجود ہیں۔ یہ اُمید بھی ظاہر کی ہے کہ اب ہندستان کی قسمت، انگریزوں سے وابستہ ہوچکی ہے، اور وہ وقت دور نہیں کہ تمام بقیہ حصص بھی کابُل تک انگریزوں کے قبضے میں آجائیں گے۔

ایک عمدہ بات یہ ہے کہ انگریزی کی ضرورت پر صرف علمی حیثیت سے نظر ڈالی ہے، اور صرف اِس لیے ہندستانیوں کے لیے اُسے ضروری سمجھتے ہیں کہ علوم میں انقلاب ہوچکا ہے۔ علومِ قدیمہ اب تحقیقاتِ جدیدہ کے مقابلے میں تقویمِ پارینہ کا حکم رکھتے ہیں، اور ہندستانیوں کے لیے بھی ترقی و تقدّم کی صرف یہی ایک راہ ہے کہ اِن علوم کی تحصیل کریں۔

یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمانوں نے یونانی علوم اپنی زبان میں منتقل کر لیے تھے، لیکن اب ایسا ممکن نہیں ہے، اِس لیے کہ اوّل تو اُس وقت حکومت تھی، جو اب مفقود ہے۔ ثانیاً یونانی علوم ایک خاص حد تک پہنچ کر اور مدوّن ہو کر ختم ہو چکے تھے، جن کا انتقال ممکن تھا۔ لیکن یورپ کی تحقیقات جاری ہیں اور محدود ذخیرہ نہیں، جو منتقل کر لیا جاسکے۔ سائنٹفک سوسائٹی کے بعد سر سیّد کی بھی سب سے بڑی دلیل، انگریزی زبان کی تحصیل و ترویج کے لیے یہی تھی۔ رسالے میں خطاب لارڈ وارن ہسٹنگز سے ہے۔

اِن تمام کتابوں میں ویسے ہی حمد و نعت طرح طرح کے اسلوب میں موجود ہیں، جیسے کہ قدیم کتابوں کی رسم رہی ہے۔ ایک فارسی مثنوی، پرنس اعظم شاہ

کی فرمائش سے لکھی ہے، شاہ نامے کے وزن پر، ٹیپو سلطان کا معرکہ نظم کیا ہے۔
اس کا نام "صولتِ ضَیغَم" ہے۔ ضَیغَم اِس مناسبت سے کہ لارڈ ڈلہوزی نے ٹیپو سلطان
کو دکن کا شیر کہا تھا۔ ایک اور نثر میں بھی خاندان میسور کی تاریخ ملی، جس میں
حیدر علی کے حالات تفصیل کے ساتھ جمع کیے ہیں اور نہایت اہتمام سے تصاویر
تیار کر کے کتاب میں شامل کی گئی ہیں۔

عجیب لطیفہ!

مشہور ہے کہ جب مدراس جاتے ہوئے مولانا اسماعیل شہید اور سیّد صاحب
کلکتہ آئے، تو مولانا اسماعیل نے مولوی عبدالرحیم سے ملنا چاہا، اِس لیے کہ اِن کی
"دہریت" کا بڑا غلغلہ تھا اور شاہ صاحب کے درس میں یہ مولانا اسماعیل کے
ہم درس رہ چکے تھے، لیکن باوجود بڑی کوشش و اہتمام کے یہ منھ چھپاتے
رہے۔ وہ ایک دروازے سے مکان میں داخل ہوں، تو یہ پچھواڑے سے
فرار کر جائیں۔ معلوم نہیں کہاں تک یہ بات صحیح ہے؟ ڈاکٹر محمد جعفر نے
سیّد صاحب کے حالات میں ایسا ہی لکھا ہے۔

خیالات کا طوفان

لیکن یہ بہت مشکل تھا کہ ایک ایسا اعتقادی استغراق، جیسا مجھ پر
طاری تھا، باوجود کوشش کے زیادہ عرصہ تک مخفی رہ سکے۔ زیادہ تر اِس
وجہ سے بھی کہ بھائی مرحوم کو کد بھی ہو گئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ دنوں کے بعد

والد مرحوم کو معلوم ہو گیا کہ سرسیدؔ کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں، اور اُن کا رنگ مجھ پر اثر کر رہا ہے۔ مجھ سے دریافت کیا، تو میں نے یہاں تک تسلیم کیا کہ بعض کتابیں شوقیہ میں نے دیکھی ہیں، لیکن اُن کی تشفی نہ ہوئی، اور وہ اِس گمان میں حق بجانب تھے۔

میرا حال یہ ہو گیا تھا کہ کسی طرح بھی اپنے خیالات کے طوفان کو روک نہیں سکتا تھا۔ بے اختیار زبان، دل کی ترجمانی کرتی تھی۔ صبح سے شام تک بیسیوں باتیں ایسی پیش آتی تھیں کہ بے اختیار میری رائے ظاہر ہو جاتی تھی، اور اِس سے میرے دلی خیالات کا پتہ چل جاتا تھا۔ گھر کی عظمت و تقدس کی زندگی اور اِس کی رسوم و طرق اب مجھ پر اتنے گراں ہو گئے تھے کہ میں کسی طرح بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ گرد و پیش میرے دل کے لیے ایک زخم کی طرح تکلیف دہ تھا، جس کی آہ چھپ نہیں سکتی تھی۔

اب یہ ہوا کہ میں کھلے طور پر ان چیزوں کی مخالفت کرنے لگا۔ کم سے کم اپنے ساتھ یہ سلوک پسند نہ کرتا اور سختی سے اِس کے خلاف رائے بھی دے دیتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب یہ بات بالکل تسلیم کر لی گئی کہ میرے عقائد "بگڑ" چکے ہیں، اور میں اپنے خاندان سے منحرف ہوں!

گھر کی زندگی سے بے زاری

اِس کے بعد میری گھر کی زندگی ایک بہت ہی ناگوار حالت میں متغیّر ہو گئی۔ والد مرحوم، جن کا غیظ و غضب کم حرکت میں آتا تھا، لیکن جب آتا تھا، تو بہت ہی شدید ہوتا تھا، اب میری طرف سے روز بروز متغیّر ہونے لگے۔

اور اُن کی ناراضی کے طوفان پوری شدّت کے ساتھ مجھ پر سے گزرنے لگے۔
اُس وقت اوائل عمر کا جوش میرے اندر بھی پوری طرح کام کر رہا تھا۔ اِس قدر فہم اور ضبط کہاں تھا کہ اُن کی ناراضگی کے وجوہ پر غور کر سکتا اور سمجھتا کہ اُنھیں اِس کا ہر طرح حق حاصل ہے۔ مجھ پر زیادہ تر اِس حالت کا یہی اثر پڑتا کہ طبیعت میں اور زیادہ ضِد اور تغلّب بڑھ جاتا اور صرف یہ سوال شب و روز سامنے آتا کہ میرے ذاتی خیالات میں کسی کو دخل دینے کا کیا حق ہے؟
اب میری زندگی کے لیے ایک دائمی تکلیف و اذّیت شروع ہو گئی تھی۔ پہلے صرف اپنے محسوسات کی تکلیف تھی اور اب خارج میں بھی ایک ایسی مقاومت موجود ہو گئی، جس کے مقابلے کا میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بجز خاموشی اور برداشت کے اور کوئی راہ نہ تھی۔

تقیّہ نہیں!

اُس زمانے میں صرف مجھ سے بڑی ہمشیر تنہا ایک عزیز تھیں جو نہ صرف ہمدردی کرتیں، بلکہ میرے خیالات سے بھی متفق تھیں۔ والد کی نظر پھر جانے کی وجہ سے اور سب بھی ناپسند کرتے تھے۔ یہ حالت بہت جلد دور ہو سکتی تھی، اگر میں ایک مرتبہ بھی یہ کہہ دیتا کہ میرے خیالات ایسے نہیں ہیں، یا تھے اور اب اُن سے رجوع کرتا ہوں، لیکن ایک لمحے کے لیے بھی کبھی اِس صریح کذب گوئی اور تقیّے کا خیال نہیں گزرا۔ ہمیشہ یہی خیال ہوا کہ جب واقعی میرے خیالات ایسے ہی ہیں اور والدِ مرحوم اِس پر برآشفتہ ہیں، تو بجز اِس

کے کوئی چارہ نہیں کہ یا تو گھر چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں اور یا اِس بِما آشفتگی کو جھیل لوں۔

والدِ مرحوم کے ساتھ معاملت کی جو عادت، طفولیت سے پڑ چکی تھی، وہ اِس وقت بھی رہی، یعنی ہم لوگ اُن کی کسی بات کے قطع کرنے، یا جواب دینے، یا رُو در رُو مقابلہ کرنے کے عادی نہ تھے۔ وہ کتنے ہی غیظ و غضب میں زجر و ملامت کرتے، میں سُن لیتا اور گردن جھکائے خاموش رہتا۔

شفقتِ پدری

ایک دن مجھے رات کو کھانا کھانے کے بعد اُنھوں نے جاتے ہوئے روک لیا، اور بہت ہی نرمی و ملائمت سے جو اُن کے خاص محبّت و شفقت کے وقتوں کا انداز ہوتا تھا، میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "کیا بات ہے؟ کیوں تو گم صُم رہتا ہے، اور کیوں اِن خیالات میں پڑ گیا ہے؟ کھل کر کیوں نہیں کہتا؟"

میں حسبِ عادت خاموش رہا۔ جب اُنھوں نے بہت اصرار کیا، تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور میں نے صرف اِتنا ہی کہا کہ نہ میں گمراہ ہوں، نہ وہابی ہو گیا ہوں، نہ نیچری ہوں، نہ اپنے خاندان سے منحرف ہوں، جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے، البتہ بہت سی باتوں پر میرے دل کو اطمینان نہیں ہے۔ اور جس سے اطمینان ملتا ہے، اُس سے لیتا ہوں!

خاندانی ریاست سے دست برداری

اُنھوں نے پوچھا "مثلاً کس سے؟" میں نے کہا، بہت سی باتیں سرسید کی کتابوں میں میرے دل کو لگیں، اور میں اُنھیں پسند کرتا ہوں۔ آپ کی جانشینی کے لیے اور خاندانی منصب قائم رکھنے کے لیے بھائی موجود ہیں۔ مجھے لوگوں کے ہاتھ پاؤں چومنے اور پیر بنانے سے تکلیف ہوتی ہے۔ میں اپنے کو اِس لائق نہیں سمجھتا، اور میری التجا ہے کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے!

بس اس پر پھر اُن کی ناراضگی شروع ہوگئی، اور میں کچھ دیر سُننے کے بعد خاموش چلا آیا۔ اِسی زمانے میں بمبئی کے سفر کا اتفاق ہوا۔ بمبئی پہنچتے ہی میں سخت بیمار ہوگیا۔ ایک نامعلوم درد کوٹھے کے پاس محسوس ہوا تھا اور کوئی تشخیص نہیں ہو سکتی تھی۔ آخر خود والدِ مرحوم نے تشخیص کیا کہ یہ دجع الورک ہے، اور کئی مہینے کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوا۔ کامل دو ماہ تک چت لیٹا رہا تھا۔ اِس بیماری کے زمانے میں والدِ مرحوم کا قلب اِس درجہ متاثر ہوا کہ وہ پچھلی ناراضگیاں بھول گئے اور اس کے بعد کچھ دنوں تک وہ حالات پیش نہ آئے، جو گھر میں پہلے روز پیش آتے تھے، تاہم میرے خیالات کا حال بدستور تھا۔

"مجتہد فی المذہب"

اِسی زمانے میں میں نے ایک کتاب لکھنی شروع کی، جس کے ناتمام اوراق، اُس عہد کی یادگار اب تک موجود ہیں۔ سرسید کے اجتہادات کا ذوق یہاں تک

بڑھ گیا تھا کہ ایک مکمل اور مرتب سلسلۂ اصول و فروع اُس کی بنا پر میں نے قرار دے لیا تھا۔ اور بطور استخراج و استنباط بہت سی نئی نئی چیزیں پیدا کی تھیں۔ اُس وقت دماغ کے لیے یہی سب سے بڑا مشغلہ تھا۔ فقہا کی تقسیم کے مطابق اگر سرسید مجتہد مطلق تھے، تو میں گویا مجتہد فی المذہب کا درجہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

بہت سے اصول، بہت سے مسائل، بہت سے فروع ایسے تھے کہ اُنھوں نے بالتصریح کچھ نہیں لکھا ہے، لیکن اُن کے اصول و مقدمات سے اُن کا استنباط ہو سکتا ہے، یا اُسی مسلک پر تاویلیں کی جا سکتی ہیں۔ میں یہ سب کچھ کرتا رہتا تھا اور اپنے ذہن میں میں نے بہت جلد ایک مکمل اصول و فروع کا ذخیرہ مدوّن کر لیا تھا۔ اب دو باتوں کا خیال ہوا: ایک تو یہ کہ اس مسلک کو بترتیبِ عقائد و اصول مدوّن کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ سرسیّد کے علم کلام پر ایک ریویو لکھا جائے۔

مولوی چراغ علی مرحوم نے تہذیب الاخلاق اشاعت سوم میں بجواب سوال و استفسار سرسیّد نے ایک بڑا سلسلہ "العلوم الجدیدۃ والاسلام" کا شروع کیا تھا۔ جس میں قدیم علمِ کلام کی تدوین اور علوم یونانیہ کی ترویج کی تاریخ بیان کی ہے۔

مجھے یہ نام بہت مناسب معلوم ہوا، اور اسی نام سے ایک کتاب لکھنا شروع کی۔ اس کے دو حصے کیے: پہلے حصّے کا موضوع یہ قرار دیا کہ انقلابِ علوم اور اس لیے نئے علم کلام کی ضرورت پھر اس باب میں ہندستان اور ہندستان سے باہر جس قدر مواد فراہم ہو چکا ہے، اُس سب کا ذکر اور اُس سب پر مسلک

سرسید کی ترجیح کے وجوہ، اور اثباتِ ترجیح کے بعد اس پر ایک مکمل تبصرہ۔
دوسرا حصہ گویا سرسیّد کے علمِ کلام کا ایک مکمّل متن تھا، اور ارادہ کیا تھا کہ
تمام ابواب عقائد و اصول قرار دے کے انھیں سرسیّد کے مسلک پر مرتب کیا جائے۔

شیخ محمد عبدہ اور "المنار"

اس زمانے میں مصر و بلادِ اسلامیہ کے نئے لٹریچر کا بھی خوب مطالعہ کر چکا
تھا، اس سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ کیوں کر "المنار" اور شیخ محمد عبدہ اور دیگر مشاہیر
مصر و شام کے حالات سے واقفیت ہوئی۔ "المنار" برابر دیکھتا تھا۔ شیخ محمد عبدہٗ
کی "کتاب التوحید" اور دیگر مضامین پڑھ چکا تھا۔ "المنار" میں تفسیر کا سلسلہ
بھی جاری تھا۔ نئے قسم کی تاویلات کی بعض کتابیں اور بھی نظر سے گزر چکی تھیں،
مثلاً شیخ محمد صدرالدین قازانی وغیرہ کی تصنیفات۔ پس اِس کتاب کے حصۂ اوّل
میں یہ بات دکھلائی تھی کہ یہ تمام کوششیں جو ہوئی ہیں، اُن سب میں بمقابلۂ
علومِ جدیدہ اگر کوئی علمِ کلام اور جدید دفاعِ مذہب و اسلام میں کامیاب
ہو سکتا ہے، تو وہ صرف سرسیّد کا علمِ کلام ہے۔

مولانا شبلی اور سرسیّد

لطف کی بات یہ ہے کہ اِس کے لیے میں نے مولانا شبلی مرحوم کو بھی ایک
خط لکھا اور نئی تصنیفات اِس بارے میں دریافت کیں، حالانکہ وہ خود اِس زمانے
میں اپنی کتاب علم کلام جدید لکھ رہے تھے، اور گو اِس باب میں اُن کا مسلک

اصولاً سرسیّد سے الگ نہ تھا۔ لیکن وہ تمام نئے مسائل' ابن رشد، ابن آمدی، ابن مسکویہ، راغبِ اصفہانی، امام غزالی اور معتزلہ وحکمائے اسلام کی نسبت سے تسلیم کرنا پسند کرتے تھے۔ سرسیّد کی نسبت پسند نہ تھی۔ اُنھوں نے مجھے لکھا:

"مرا دردے سخن گفتن نہ شاید"

محسن الملک اور سرسیّد

پہلا حصہ اُس وقت تقریباً مکمل کر لیا تھا۔ نواب محسن الملک مرحوم، اوّل دن سے اصولاً سرسیّد سے متفق بلکہ اُن کے پیرو رہے۔ تہذیب الاخلاق اوّل میں اُنھوں نے ایک بہت بڑا سلسلۂ مضامین تفسیر کے موضوع پر لکھا تھا اور تقریباً ایک نئی تفسیر کے لیے وہی مقدمات قرار دیتے تھے، جو سرسیّد کے ہیں، لیکن جب سرسیّد کی تفسیر نکلی، تو اُن کے بے باکانہ اجتہاد اُن پر شاق گزرے۔ وہ ایک حد تک بین بین راہ پسند کرتے تھے۔ اِس پر اُنھوں نے سرسیّد سے اپنے مشہور مکاتبات کا سلسلہ شروع کیا۔ جس میں سے دو مکتوب مع جواب کے "التحریر فی اصول التفسیر" کے نام سے سرسیّد نے چھاپ دیئے۔

اِس کے بعد جب تہذیب الاخلاق بار سوم نکلا، تو مکاتبات کا مزید سلسلہ جاری ہوا۔ شاید اُنھیں خیال ہوا کہ باوجود اپنے بیان کردہ اختلافات کے سرسیّد سے جو اصولی اتفاق رکھتے ہیں، اُس کے وجوہ ظاہر کریں۔ اِس غرض سے اُنھوں نے کسی دوست کے اعتراضات، جواب کے لیے مہیا کیے اور ایک سلسلۂ مضامین، مکاتیب ہی کے سلسلے میں اِس عنوان سے لکھنا شروع کیا، کہ

"تحریر ایک دوست کے جواب میں" اس میں اُنھوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرسید کے جو خیالات نئے سمجھے جاتے ہیں، وہ اصولاً نئے نہیں ہیں۔ پچھلے مسلمانوں کے بھی ایسے خیالات رہے ہیں۔ زیادہ تر اس میں اُنھیں اِخوانُ الصفا اور کتبِ مِلَل و نِحَل سے اقوالِ معتزلہ کے استناد کا موقعہ ملا۔

میں نے جب یہ مضمون دیکھا، تو مجھے اور بہت سے قدیم اقوال، سرسیّد کے ذوق کے یاد آگئے، اور اِس تحریک سے ذہن اس طرف گیا کہ کیوں نہ اِس موضوع پر ایک زیادہ بڑی کتاب مرتب کی جائے؟ لوگوں کو جو وحشت، سرسید کے اختراع اور جدّتِ خیال سے ہوتی ہے، وہ بھی دور ہو جائے گی۔ پھر اِسی سلسلے میں خیال ہوا کہ اس رنگ کی سب سے بڑی جماعت، معتزلہ کی ہے۔ فی الحقیقت اُن کا ظہور اور اُن کے خیالات کا نشوء ٹھیک اُنھی ظروف و احوال میں ہوا، جو اِس وقت سرسیّد اور اُن کے رفقاء کو پیش آئے ہیں۔ اِس وقت یورپ کے نئے تمدن اور علوم سے مقابلہ ہے۔ اُس وقت قدیم علوم سے تھا۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ اُس وقت مسلمان، صاحبِ حکومت و تمدّن تھے اِس لیے اجتماعی دفاع اس درجہ منفعل نہ تھا، جس قدر موجودہ عہدِ تنزل میں ہے، اور اِس لیے معتزلۂ قدیم میں جتنی اسلامی فعّالیت نظر آتی ہے، اُس سے معتزلۂ جدید خالی ہیں۔ بایں ہمہ عقائد کی نسل دونوں کی ایک ہے۔

معتزلہ کی طرف رغبت

بہرحال معتزلہ کی طرف انتقالِ ذہنی ہوا اور پھر اُن کا اعتراف و اعتقاد

روز بروز بڑھتا گیا جس قدر اُن کے اقوال و افکار مطالعے میں آتے، اُن کا مسلک مرغوب و مالوف نظر آتا۔

اب شوق ہوا کہ ایک کتاب، معتزلہ کے حالات میں لکھی جائے اور چونکہ عہد متاخر میں اشاعرہ کے شیوع و تسلّط نے اُن کے تمام مدوّنات و کُتب معدوم کر دیے ہیں، اِس لیے کوشش کرنی چاہیے کہ جستہ جستہ جس قدر اقوال و آراء متفرق طور پر مل جاتے ہیں، تفحّص و جستجو سے یکجا کیے جائیں، اور کوشش کی جائے کہ عقائد و مسائل کا ایک مکمل سلسلہ مرتب ہو جائے۔ چنانچہ اب تمام تر ہمت "المعتزلہ" کی ترتیب میں مشغول ہو گئی۔

اس کتاب میں بڑے مطالعے اور بحث کی ضرورت تھی۔ واقعی معتزلہ کی ہستی تقریباً مٹا دی گئی ہے۔ زیادہ تر اب اُن کے اقوال ہمیں اِس ذریعے سے مل جاتے ہیں کہ مخالفین رد کرتے ہیں، اور بغرضِ ردّ انھیں مجبوراً نقل کرنا پڑتے ہیں۔ صرف چند ایسے مسائل ہیں، جن میں ناطرفدارانہ اُن کی شکل نظر آسکتی ہے۔ خود اُن کی تصنیفات بالکل ناپید ہیں۔ چند چیزیں جو اب نکل آئی ہیں، وہ بھی اُس وقت غیر مطبوعہ تھیں، مثلاً سیّد شریف مرتضیٰ کی کتاب الامالی، قاضی عبدالجبا کی ......[ہ] وغیرہ۔ البتہ اُس وقت ایک اچھی کتاب، ڈاکٹر آرنلڈ نے دائرۃ المعارف حیدر آباد کے پریس میں چھپوا دی تھی، یعنی ابوبکر یحییٰ کی کتاب "المِلل وَالنِّحَل" تا باب المعتزلہ والاعتزال۔ پس جس قدر بھی اِس کتاب سے مدد مل سکتی

ہ مسودے میں جگہ خالی ہے۔

تھی، حاصل کی اور وہ مواد بھی جمع کیا جو ہر علم و فن کی کتابوں میں بلا تعینؐ و آثار کے بکھرا ہوا ہے۔

مجھے زیادہ مقدار میں یکجا مواد جس کتاب سے مل گیا' وہ مقریزی کی تاریخِ مصر ہے۔ باوجودیکہ اِس کا کوئی گمان نہیں ہوتا تھا۔ مقریزی نے تو تاریخ مصر میں احاطۂ موضوع اور جامعیت فنون کا عجیب ثبوت دیا ہے۔ دنیا بھر کی کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جسے وہ مصر میں نہیں ڈھونڈتا' اور پھر پوری تاریخ اُس کی بیان نہیں کرتا۔ مصر میں مذاہب و طوائف اسلامیہ کے شیوع کا بھی ایک باب باندھا ہے' اور اُس میں اعتزال و معتزلہ کا اتنا اچھا اور ایک حد تک ناطرفدارانہ بیان موجود ہے کہ کتبِ مِلَل و نِحَل میں بھی نہیں مل سکتا۔ اقوال و آثار کا بڑا مواد' تفسیرِ کبیر میں بھی ہے۔ امام صاحب باوجود اشعریت کے پُر جوش نقیب و داعی ہونے کے یہاں معتزلہ سے کوئی خاص کاوش نہیں رکھتے' اور اُن کے اقوال و توجیہاتِ آیاتِ مبہمہ نہایت بے لاگ طریق پر نقل کر دیتے ہیں۔ بسا اوقات بے اختیار داد بھی دینے لگتے ہیں اور اظہارِ تحسین سے باز نہیں رہ سکتے۔ علی الخصوص ابو مسلم اصفہانی کی تفسیر و توجیہ بے شمار مقامات میں نقل کی ہے۔ کہیں اُن کو "حکماء اسلام" کے لقب سے ملقب کرتے ہیں، کہیں "نظار و عقلاء" لقب دیتے ہیں۔ کوئی سورۃ بمشکل ایسی ہوگی، جس کی تفسیر اِس نقل و حکایت سے خالی ہو۔

امام ابن حزم کی "المفصّل" بھی اُس وقت چھپ کر نکلی تھی۔ شہرستانی' شہرزوری' تاریخ الحکماء قفطی وغیرہ موجود تھیں۔ تمام کتبِ تفسیر و عقائد و اصول میں بھی بطریقِ رد اقوال کی کمی نہیں ہے' اگرچہ اُن کی صورت بہت کچھ محرّف ہو گئی

ہے۔ میں کچھ عرصے تک مواد فراہم کرتا رہا۔ اور پھر ترتیب شروع کر دی۔ مولانا شبلی سے بھی میں نے مواد و مآخذ کی نسبت دریافت کیا تھا، لیکن اُنھوں نے مایوس جواب دیا، البتہ تاریخ الحکماء جمال الدین قفطی کی نسبت لکھا کہ یورپ میں چھپ گئی ہے، اور میں نے فوراً منگوالی۔

کتاب کی ترتیب یہ تھی کہ ابتدا میں ظہورِ اسلام، آغازِ اختلاف، ظہور طوائف و فِرَق، اِس کے اجتماعی اسباب، معتزلہ کا ظہور، اُسکا نشو و نما اور اُس کے مختلف دور، اِس کے بعد اعتزال کی تفصیلی تاریخ، پھر اکابر معتزلہ کے تراجم۔

یہ پہلا حصّہ تھا۔ دوسرے حصے میں اصولِ معتزلہ پر مفصّل تبصرہ اور اُس کی ترجیح، پھر تمام ابوابِ عقائد و اصول قرار دے کر متفرق عقائد و اصولِ معتزلہ کی اِس طرح تبویب و ترتیب کہ ایک کتابِ عقائد و اصول وجود میں آجائے۔ لیکن اِس کا ابھی پہلا حصّہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ ایسے حالات پیش آئے کہ اِس طرف سے طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔

سرسیّد کے "علوم و معارف"!

اِس کے علاوہ متعدد مسائل پر بتقلید سرسیّد طبع آزمائیاں کیں، مقصود یہ تھا کہ سرسیّد کے "علوم و معارف" (جیسا کہ اُس زمانے میں میری اصطلاح تھی) زیادہ مدلل طریق پر لکھے جائیں۔ بعض اشخاص سے حقیقتِ معجزات پر بحث چھڑ گئی۔ مجھے اُس زمانے میں سرسیّد کے مباحث بطریق تقریبات خوب مستحضر تھے۔ میں نے اِس مسلک پر ایک تحریر لکھنی شروع کی، جس میں نبوّت، معجزات، معجزے کے دلیلِ نبوّت نہ ہونے

کے دلائل، پھر معجزات کی حقیقت، خرقِ عادت کا شرعاً امتناع، لَاتَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللہ سے استدلال، فطرۃُ اللہ اور سنّۃ اللہ کا بھی قوانین مادیہ طبیعتہ میں استعمال وغیرہ وغیرہ مباحث تھے۔

بمبئی سے ایک رسالہ نکلنا شروع ہوا تھا۔ اُس میں عرصے تک نکلتی رہی (یعنی تحریر) پھر حکیم محمد حسن، شاہجہاں پور کے ایک طبیب تھے، اور میری اُس وقت کی تقریروں اور مشنریوں اور آریوں سے مباحثوں کے بڑے قدرداں، اُنھوں نے رسالے کی شکل میں چھاپ دیا۔

نشہ سال بھر رہا!

یہ نشہ سال بھر تک خوب زوروں پر رہا، لیکن اِس کے بعد ہی خُمار شروع ہو گیا۔ اچانک وہ منزل نمودار ہو گئی، جو اِس منزل کے بعد قدرتی طور پر پیش آنے والی تھی۔ عقائد وکلام کے انہماک، مذہبی عقائد وارکان کے بحث ونظر، اور اختلافات ومشارب کے مطالعہ ونظر کا نتیجہ یہ نکلا کہ طبیعت میں ازسرِ نو ایک نئے اضطراب کی ابتدا ہو گئی، گویا یہ درمیان کا سکون، جو سرسیّد کی تقلید سے پیدا ہو گیا تھا، محض ایک فریبِ ذہن تھا، اور اس کے نیچے دل کا کوئی اطمینان موجود نہ تھا۔

جوں ہی مسلکِ سرسیّد کی جدّت وغرابت کا اثر دھیما پڑا اور جو کیفیت ایک نئے نئے جوش کی سی پیدا ہو گئی تھی، جوں ہی وہ طبعی سکون کی حالت میں آ گئی، دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا، اور اپنی صحیح حالت محسوس کرنے لگا۔ سرسیّد کے مسلک نے پوری طرح تمام پچھلی خوش اعتقادیاں اور تقلیدی عقائد بیخ وبن سے

اُبھار دیے تھے اور ذہن کو وادیٔ مذہب میں ہر طرح کی آزادی و جولانی کا خوگر بنا دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شکوک و کاوش نے اور مزید وسعت اختیار کی اور سرسیّد کی انتہائی بلند پروازیاں بھی وہاں ساتھ دینے سے درماندہ رہ گئیں۔

سرسیّد کی رہنمائی

سرسیّد کی رہنمائی نے اِس منزل تک پہنچا دیا تھا کہ اہل مذاہب کے تمام دعاوی و عقائد اُس رنگ و شکل میں، جو عام طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں، محض وہم و خیال ہیں، اور اصلیت کچھ دوسری ہے۔

لیکن اب یہ منزل سامنے آ گئی کہ عقائد کے جتنے حصّے کو سرسیّد بھی منوانا چاہتے ہیں، وہ بھی وہم و خیال کیوں نہ ہو؟ وجودِ باری، ذات و صفات، بقائے روح، وحی و الہام، نبوّت، شرائع و ادیان، کیوں نہ یہ سب بھی ناقابلِ تسلیم و اعتراف ہوں؟

سرسیّد کے مسلک نے ان تمام عقائد کی حقیقت اِتنی نازک و باریک کر دی تھی کہ طبیعت کے لیے اُسے بھی نکال باہر کرنا کچھ گراں نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً قدیم خیالات کے مطابق وحی کی بابت جو تصوّر تھا، وہ اتنا وزنی اور ما فوقِ عقل تھا کہ دماغ، اعتقاد و اعتراف کے بعد پھر اُس سے انکار کرنا سہل نہیں سمجھ سکتا تھا۔

لیکن اب "روشن خیالی" تو یہ کہتی تھی کہ یہ سب جہل و اوہام کی اختراع ہے۔ اصلیت اِس سے زیادہ نہیں ہے کہ انبیاءِ کرام، جو بالفطرۃ نوعِ انسانی کے سب سے زیادہ ذکی، مُدرِک، صحیحُ الحواس و القویٰ، اور اشرف و افضل افراد

ہوتے ہیں، اُن کا نفسِ مُزکّیٰ ایسے حقائق کا ادراک کرتا ہے، جو عام انسان نہیں کر سکتے، یہی القاء و الہام ہے۔ اِسی کو وحی کہتے ہیں، اور اِسی کو چاہیں، تو زیادہ شاندار تعبیرات میں بھی بیان کر سکتے ہیں۔

نبوّت و وحی کی یہ حقیقت اِتنی نازک اور اَخف ہو گئی ہے کہ بجز خواہ مخواہ کی خوش اعتقادی کے اور کوئی چیز اِسے قائم نہیں رکھ سکتی۔ کیا چیز ایک دانشمند کو اِس سے باز رکھ سکتی ہے کہ وہ حقیقتِ نبوت کے اِس حد تک پہنچ کر پھر اس قریب اور سامنے کی سرحد پر نہ پہنچے کہ نبی زیادہ فطین و ذہین اور زیادہ فضائلِ اخلاقی رکھنے والوں کا نام ہے اور دماغ کی زیادہ صحیح ترکیب، اِدراک کے زیادہ بلند عمل، اور طبیعت ذہنیہ کی نہایت اعلیٰ تقویم و تعدیل کا نام ہے۔ اور اس کے بعد نبوّت جس قدر باقی رہ جاتی ہے، وہ معلوم ہے۔

فی الحقیقت خواہ حکمائے اسلام ہوں، مثلاً شیخ اور فارابی وغیرہ، یا موجودہ زمانے کے متکلمین ہوں جیسے سر سید، اِس بات میں وہ بھی اِسی سرحد پر ہیں، لیکن پیرایۂ بیان ایسا اختیار کرتے ہیں، جو معاملے کو زیادہ پریشان اور زیادہ غیر عامۃ الورُود بنا دیتا ہے۔ اِسی طرح تمام عقائد و اصول کا حال ہے، اور روشن خیالی و مذہبی تفلسُف ایسی کوئی واقعی درمیانی ہستی نہیں رکھتا۔ فکری وجود صرف دو ہی ہیں: انکار و اقرار۔ یہ تیسری راہ چاہتے ہیں، اور وہ محال ہے۔

گرہوں پر گرہیں

میرے سامنے اب سوالات کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا، مگر جواب کے لیے

کوئی صدا نہ تھی۔ جو اصول، جو مقدّمات، جو دلائل، جو شبہات، پرانے افکار و عقائد کے رد میں ہم استعمال کرتے تھے، کیوں اُن کا وار اِن چیزوں پر بھی نہ پڑے، جن کو مذہب کی اوّلیات قرار دے کر الگ رکھ دیا ہے، اور اس طرح رکھ دیا ہے، گویا چھونا منع ہے۔ اگر منع ہے، تو قدیم عقائد نے کیا قصور کیا تھا؟

اب اچانک میری زندگی منقلب ہو گئی۔ میرے اِضطراب و اِلتہاب کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک گُتھی سامنے آتی تھی، اُسے سُلجھانے لگتا تھا، لیکن سُلجھنے کی جگہ دس گرہیں اور پڑ جاتی تھیں۔ پھر ہر گرہ کے کھولنے میں دس اور نئی گرہوں کا مقابلہ پیش آتا تھا۔ ہر جواب بجائے خود ایک نیا سوال تھا، اور ہر جستجو کے یقین سے ایک نئے شک کی ہلاکت پیدا ہوتی تھی۔

اطمینانِ قلب ہلاک ہو گیا

میرا اطمینان یکسر ہلاک ہو گیا اور زندگی روز بروز ایک لاعلاج مرض کی شکل میں مبدل ہوتی گئی۔ ایک عام اور دائمی مصیبت، جو اس راہ میں پیش آتی ہے، اور ہمیشہ پیش آتی ہے، یہ ہے کہ اِس حالت کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کاوش و جستجو، مزید غور و تفکّر، اور مطالعہ و نظر کے سوا اور کوئی علاج نظر نہیں آتا۔ جوں جوں شکوک بڑھتے ہیں، سوالات اُمنڈتے ہیں، طبیعت اور زیادہ نظر و تفحّص میں مبتلا ہوتی ہے، اور دماغ کا عمل، ایک بے رحم تیزی کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے، اور فی الحقیقت اسی حالت سے اور زیادہ تشنگی اور ہلاکت بڑھتی ہے گویا نسخہ، مرض کی نئی نئی ترقیوں کا موجب بن جاتا ہے۔ یہی حالت مجھے پیش آئی اور

میں ہمہ تن داغ ہو گیا۔

سرسید کی تقلید کا ثمرہ

پچھے یک سالہ دور میں عملی زندگی نہایت ضعیف پڑ چکی تھی۔ تھوڑا بہت تسمہ جو لگا رہا تھا، وہ بھی اب کٹ گیا۔ سرسید کے مسلک کا سب سے پہلا اثر، اعمال ہی پر پڑا تھا۔ جب اِس بات کا استغراق بڑھ گیا کہ تمام واجبات و فرائضِ شرعیہ اُن اُن مصالح اور حکمتوں پر مبنی ہیں اور مقصود صرف اُن اُن فوائد کا حصول ہے، تو پھر ظاہر ہے کہ طبیعت میں ادائے فرض کا کوئی جذبہ باقی نہیں رہتا۔ اہلِ مذاہب کے تشدد اور تاکیدات بالکل ایک طرح کی عدالتی تنبیہات معلوم ہونے لگتی ہیں۔ کیونکہ تعلیل یوں سامنے آتی ہے کہ ایک قانون کو قائم رکھنے کے لیے اور عامۃ الناس میں اس کا رعب داب قائم رکھنے کے لیے تاکید و تشدّد کی ضرورت ہے، ورنہ فی نفسہ وہ کوئی شئی نہیں۔ لازمی نتیجہ اِس کا یہ نکلتا ہے کہ طبیعت میں مذہبی اعمال کا ولولہ و جوش باقی نہیں رہتا، اور یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ بہر حال مقصود تو کچھ اور ہی ہے اور یہ تمام وسائل ہیں۔

بچپن کا کھیل — نماز!

بچپن سے ہماری تربیت نہایت گہری مذہبی فضا میں ہوئی تھی اور چھ سات برس کی عمر ہی سے مذہبی اعمال پر تشدّد شروع ہو گیا تھا۔ طفولیت میں ہمارا بڑا کھیل یہ تھا کہ والد کے پیچھے نماز کی صف میں کھڑے ہو جائیں۔ اِس کے بعد حکماً و جبراً اِس کی پابندی کرائی گئی۔

ٹھیک صبح چار بجے والد مرحوم ہمیں اُٹھاتے تھے اور مجال نہ تھی کہ پہلی آواز پر اُٹھ نہ بیٹھیں۔ "جاؤ وضو کرو" یہی پہلی آواز تھی، جو روز آنکھ کھول کر ہم سُنتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کئی مرتبہ میں نے اِس کی تعمیل یوں بھی کی تھی کہ جاڑوں میں صرف منھ پر ایک چُلّو ڈال کے چلا آیا تھا! پھر صبح کی طرح اور تمام نمازوں میں بھی ہماری حاضری لازمی تھی، ایسی لازمی کہ بجز سخت بیماری کے اور کوئی عذر اِسے معاف نہیں کر سکتا تھا۔

جب ذرا عمر زیادہ ہوئی، تو مسجد جانے کا حکم ہوا۔ صبح اور ظہر گھر میں والد مرحوم کے پیچھے پڑھنی پڑتی تھی، اور عصر و مغرب مسجد میں۔ حافظ صاحب ہمراہ ہوتے تھے۔ ابھی بمشکل دس برس کے پورے ہوئے ہوں گے کہ ہمیں باقاعدہ حلقے میں بٹھایا گیا، علی الخصوص جمعرات کی شب کا حلقہ، جو عشا کے بعد منعقد ہوتا تھا۔ بعض اور اشغال، جو غیر معمولی طور پر گاہ گاہ مثلاً ختمِ خواجگان، اِس میں بھی ہمیں شریک کیا جاتا تھا، اور حکماً ہمیں بٹھایا جاتا تھا۔

مجھے اب بھی وہ ختم کی مجلسیں اِس طرح یاد آتی ہیں جیسے کل کی بات ہیں۔ پانچ سو دانے بادام کے یا کبھی ایک سو گِنے ہوئے وسط میں رکھے جاتے تھے۔ ہم حلقہ باندھ کر بیٹھتے تھے۔ ایک جانب خود والد موجود ہوتے تھے، اور طریقہ یہ تھا کہ ہر شخص ایک ایک مٹھی اُٹھا لیتا اور اُس کے دانوں پر شمار کرتے ہوئے کلماتِ ختم کا اعادہ کرتا۔ ہر کلمہ کا ایک ایک دَور ہوتا اور ہر دَور پر ایک ڈھیری "یا مُسبّبُ الاَسباب"، "یا مُقلّبُ القلوب"، "یا مُفتّحُ الابواب" وغیر ذالک تقسیم ہو جاتی!

معصوم خواہش

مجھے بارہا خیال ہوتا تھا کہ ایک مٹھی جیب میں کیوں نہ ڈال لوں! اس کا دفعیہ یوں کر دیا گیا تھا کہ یہ تمام باوام کڑوے ہیں، مگر مجھے اس پر یقین نہ تھا۔ جس زمانے میں ترکوں یونانیوں میں جنگ چھڑی ہے، والد مرحوم ہر جمعرات کی رات ختم کی مجلس منعقد کیا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، جس دن تھسلی کی فتح کی خبر آئی، ٹھیک جمعہ کا دن تھا۔ اُس دن سے پھر ختم کی صحبت ختم کر دی گئی۔

سحر خیزی

خاندانی زندگی اور زندگی کے اوّلین مشہودات و مسموعات کا طبیعت پر جو اثر پڑتا ہے، وہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ حقیقتاً طبیعت کے حکم میں داخل ہو جاتا ہے۔ علمائے اخلاق اِسی کو ارث معنوی کہتے ہیں۔ والد مرحوم کی عادت تھی کہ دو ڈھائی بجے شب کو اُٹھ جاتے اور تہجّد کے بعد اشراق تک برابر جائے نماز پر بیٹھے رہتے۔ ہم لوگ چونکہ سویرے سے سو جاتے، کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ پچھلی پہر آنکھ کھل جاتی۔ اِسی زمانے میں بارہا ایسا ہوا کہ میں بچپنے کے شوقِ محاکات میں بستر سے اُٹھ بیٹھا اور وضو کر کے والد مرحوم کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ مجھے اِس میں ایک بڑی تفریح اور دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔ تہجد کی رکعات کے بعد وہ کبھی مراقبے میں رہتے، کبھی اقعاء کی نشست میں بیٹھ جاتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اونچی آواز میں کچھ پڑھنے لگتے، یا بعض عربی و فارسی اشعار زبان پر جاری ہو جاتے۔ مجھے اُس وقت رات

کے سناٹے میں یہ آواز بڑی بھلی لگتی اور جی چاہتا سُنتا رہوں۔

ابتدا میں والد مرحوم نے روکا اور کہا "سو جاؤ" لیکن میں برابر اُٹھتا رہا اور چند روز کے بعد گویا یہ بات بھی معمولات میں داخل ہو گئی۔ ایک دو مرتبہ میں نے اُن سے سوالات بھی کیے کہ فلاں چیز، جو ابھی آپ نے پڑھی، کیا ہے اور کس غرض سے ہے؟ اِس پر وہ میرے فہم کے مطابق بہت سی باتیں بیان کرنے لگتے اور میں بیٹھ کر سُنتا۔ بچپن میں آپس میں رشک و مُنافست بہت ہوتی ہے۔ اچھی باتوں میں بھی اور اگر بُرائیاں ہوں، تو اُن میں بھی۔ مجھے دیکھ کر بھائی اور بہنیں بھی اُٹھنے لگیں اور پھر تو ایسا ہو گیا کہ دو بجے اُٹھنا، گویا گھر کا ایک معمول ہو گیا۔ کئی مرتبہ میری منجھلی بہن نے دن کا سبقِ گلستاں، جو کسی وجہ سے رہ گیا تھا، اِسی وقت یاد کر لیا۔ مجھے یاد ہے کہ اِسی وقت کی ایک نشست میں بُوستاں کی یہ حکایت، بہن کے سبق میں آئی تھی:

شب یاد دارم کہ چشمم نہ خفت
شنیدم کہ پروانہ با شمع گفت

شاعرانہ طبیعت

شب کی پچھلی پہر کا وقت اور فی الواقع شمعدان کی موجودگی اور پروانوں کا ہجوم، ہر طرف چھایا ہوا سناٹا، والد مرحوم کا خاص لہجے میں اشعار کو دہرانا، اور ایک حالتِ تواجد میں بار بار پڑھنا، اِن سب باتوں کا میرے دل پر بڑا ہی اثر پڑا تھا، اور ایک ایسی کیفیت آئی تھی کہ آج تک میں اُسے محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اُس وقت ٹھیک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اِسی سامنے کے شمعدان اور اُڑتے ہوئے پروانوں میں

یہ مکالمہ ہو رہا ہے۔ میں اِس طرح شمع کی طرف دیکھتا رہا گویا اُس کی آواز سُننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ والد مرحوم پر بھی اُس وقت بڑی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ سبق جاری نہ رہ سکا، اور وہ دیر تک محویت کے عالم میں یہ شعر دہراتے رہے:

تو بگریزی از پیش یک شعلہ خام

من استادہ ام تا بسوزم تمام

اِن حالات کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ آگے چل کر مذہبی اعمال و وظائف، زندگی کے امورِ عادیہ میں داخل ہو گیے۔ سحر خیزی کی جو عادت بچپن میں پڑی تھی، وہ داخلِ فطرت ہو گئی۔ کچھ ہو، چار بجے کے بعد بستر پر لیٹے رہنے میں اذیت محسوس ہونے لگی۔ نماز بالکل ایسی بات ہو گئی، جیسے معیّن اوقات کی غذا۔

تہجّد

قدیم مذہبی خیالات میں جب جنبش ہوئی، تو بے اطمینانی کا رجحان، افکار و عقائد کی طرف تھا۔ اعمال پر اُس کا کوئی اثر نہیں پڑا، بلکہ جوں جوں رسوم و بدعات کی طرف سے بے چینی بڑھتی گئی، فرائض و اعمال کی طرف رغبت زیادہ ہوتی گئی۔ اِن میں سے ایک غیر معمولی اور خاص بات کی طرح پچھلے پہر اُٹھنے اور تہجّد سے جو شوق ہو گیا تھا، وہ برابر قائم رہا، اِس طرح نہیں، کہ اہتمام و التزام کے ساتھ، مگر یہ ضرور تھا کہ جب کبھی شب کو جلد سو گیے اور آنکھ کھل گئی اور زیادہ سستی بھی نہ معلوم ہوئی، تو یہ مشغلہ بہت دل پسند ہوتا تھا کہ اُٹھ کر وضو کریں۔ کم سے کم دو ہی رکعتیں پڑھ لیں اور پھر یا مطالعہ یا لکھنے میں مشغول ہو جائیں۔ بارہا میں بعض آدمیوں سے فرمائش

کرتا تھا کہ مجھے پچھلی پہر اُٹھا دیں۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ اوپر کی منزل اور اپنا کمرہ چھوڑ کر مکان کے نچلے حصے میں سوتا رہا، اس لیے کہ وہاں ایک شخص شمس الدین سوتا تھا، اور وہ بے چارہ ایک بجے سے اُٹھ کر اپنے بعض وظائف میں، جو بطور ایک خاص عمل کے والد مرحوم نے بتلائے تھے، لگ جاتا تھا۔ میں اُس سے کہہ دیتا اور وہ مجھے دو یا تین بجے اُٹھا دیتا۔ یہ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس شوق میں کوئی زُہد و عبادت کا خیال محسوس ہوتا ہو یا یہ خیال ہو کہ ایسا کرنا بڑے ہی ثواب و فضیلت کی بات ہو گی۔ بس طبیعت کی اُفتاد ہی کچھ ایسی پڑ گئی تھی کہ یہ باتیں اچھی معلوم ہوتی تھیں، اور اِن میں دل کو لذت ملتی تھی۔ بلا شبہ یہ والد مرحوم کی خاص تربیت کا نتیجہ تھا۔

مسلکِ سیّد کا اثر

جب نئی روشن خیالی کی ہوا لگی اور سر سیّد مرحوم کا رنگ چڑھا، تو اگرچہ اِس کا اثر صرف عقائد و افکار ہی کے دائرے میں محدود نہ تھا، بلکہ اعمال پر بھی پڑتا تھا۔ اب صوم و صلوٰۃ کی حقیقت ہم وہ نہیں سمجھتے تھے، جو عام لوگ سمجھتے ہیں۔ ہمارا معیارِ اعمال و احکام اب فلسفیانہ و حکیمانہ تھا! تاہم عملی طور پر کوئی اثر ایسا نہیں پڑا جس سے اعمال کی پابندی و مزاولت متاثر ہوتی۔

سر سیّد کا ایک مضمون، اوقاتِ نماز پر بھی ہے اِس میں اُنھوں نے زور دیا ہے کہ نماز کے اصلی اوقات تین ہی ہیں، جو قرآن میں آئے ہیں: قرآۃُ الفجر، دُلوکُ الشّمس، اور غسق اللّیل۔ اِن ہی تین وقتوں میں آنحضرت پانچوں نمازیں پڑھتے تھے۔ اور یہ بہتر ہے

لیکن ضروری نہیں۔ قیام و حضر میں بھی بلا عذر اگر ظہریں و عصریں پڑھ لی جائیں، یعنی تین وقت میں پانچ نمازیں پڑھی جائیں، تو مضائقہ نہیں سفر و عذر کی بنا پر جمع بین الصلاتین کی رخصت تو پہلے ہی سمجھ میں آ چکی تھی، اور منع و نسخ کی توجیہات بالکل دل کو نہیں لگتی تھی۔ ترمذی والی روایتِ شاذ بھی معلوم تھی، لیکن یہ عام و مطلق حکم بالکل نیا اجتہاد تھا، مگر ہم اپنے جوشِ تقلیدِ سرسید میں اس کے اتباع پر بھی مجبور رہتے۔

چنانچہ ایک شارح کی طرح میں نے بارہا اس پر تقریریں کیں۔ اور نئی نئی دلیلیں تراشیں، مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن کی عادت کے رسوخ کی وجہ سے خود عمل کبھی نہیں کیا طبیعت اس طرف راغب ہی نہیں ہوتی تھی کہ ظہر و عصر ملا کر پڑھیں۔ مسجد میں جاتے۔ ظہر، ظہر کے وقت، عصر، عصر کے وقت پڑھتے تھے۔ سرسید کے مسلک میں آ کر اب سُنَن و نوافل کی بھی وہ تاکید نہ رہی تھی، بلکہ اُن کے اصول کے بموجب تو بس فرائض کا پڑھ لینا کافی تھا۔ جہاں تک بحث مباحثے کا تعلق ہے، ہم اس کے بھی پورے مؤید تھے۔ خوب خوب بحثیں کرتے تھے۔ اعتقاد بھی یہی تھا، لیکن مجھے یاد نہیں کہ عملاً کبھی سنن و نوافل میں کمی کی ہو۔

عقائد و اعمال پر ضرب

لیکن اب جو دور شروع ہوا۔ اُس کی ضرب بیک وقت عقائد اور اعمال، دونوں پر لگی۔ اور یہ پہلا موقع ہے کہ عمل میں ضعف شروع ہوا۔ اِدھر عقائد، تشکیک و اضطراب کے سیلاب میں بہ رہے تھے۔ اُدھر عملی زندگی کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ کچھ دنوں تک تو یہ حالت رہی کہ باوجود کامل ذہنی انقلاب کے بطور عادت و رسم کے معمولی اعمال جاری رہے۔ کوئی کیفیت اور دل کا اٹکاؤ باقی نہ رہا تھا، لیکن

وقت پر عادۃً ہر بات یاد آجاتی تھی۔ صبح اُٹھتے، تو گو نہ مذہب پر اطمینان رہا تھا، نہ مذہب کے مبادیات و اساسات پر، حتیٰ کہ اُس خدا کے وجود پر بھی، جس کے لیے عبادت کی جاسکتی ہے، تاہم طبیعت اِس درجہ عادی ہوچکی تھی کہ بلا نماز پڑھے رہا بھی نہ جاتا تھا، گویا پہلے فقدانِ عمل میں معنوی فقدان ہوا اور اِس کے بعد صوری۔

چند دنوں کے بعد شک و اضطراب نے انکار تک رسائی پیدا کرلی، تو اب ذہن نے پوری جدوجہد، طبیعت کے مقابلے میں شروع کردی۔ صاف نظر آنے لگا کہ نہ صرف فعلِ عبث ہے بلکہ ایک سخت فریب و ریا ہے۔ ایک عمل جس پر ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی یقین نہیں، اُسے اہلِ یقین کی طرح کرنا، خود اپنے ساتھ فریب کھیلنا ہے۔ یہ نہیں ہوا، جیسا کہ معمولی حالات میں ہوتا ہے، کہ تدریجی رفتار کے ساتھ عمل سے ترکِ عمل تک پہنچے ہوں، بلکہ چند دنوں کی فکر و کشمکش کے بعد ایک دن شب کو آخری فیصلہ کرلیا اور صبح سے نماز ترک کردی۔

رات، جو صدی کے برابر تھی!

اللہ اللہ! مجھے وہ رات آج تک یاد ہے اور ہمیشہ یاد رہے گی۔ ایک رات، جو اپنی اذیت، اپنی کشمکش، اپنے واقعات کے اعتبار سے ایک سال، ایک قرن، بلکہ ایک پوری عمر کے برابر تھی! اُس وقت گویا میں آخری فیصلہ کرنے والا تھا۔ ایک مستغرق یقین کی جگہ ایک بے رحم انکار میرے حصے میں آنے والا تھا۔ اُس شب کے واردات میں نے ایک مرتبہ قلم بند کیے تھے۔ وہ اگر مل گئے، تو میں آپ کو دے دوں گا۔

تمام شب کشمکش و تذبذب میں کٹ گئی۔ بڑا سخت مقابلہ رہا، یعنی اپنا تمام سرمایہ کھو چکا تھا،

لیکن پھر بھی ایک آخری خفیف سا لگاؤ باقی تھا۔ وہ بھی اتنا قوی نکلا کہ اُس کے توڑنے کے لیے ذہن کو اپنی ساری قوت خرچ کر دینی پڑی۔ صبح کے قریب میں نے فیصلہ کر لیا۔ ٹھیک صبح صادق کا وقت تھا۔ میں جب سونے کی کوشش کرنے لگا، تو دل میں ایک سخت ناقابلِ دفع یاس و حسرت پیدا ہوئی، ایسی جیسے کسی مایوس وِداع کے بعد پیدا ہونی چاہیے۔ ایسا محسوس ہوا گویا ایک بڑی محبوب متاع جاتی رہی ہے اور پھر واپس نہیں ملے گی!

خیال آیا کہ یہی وقت تھا جب میں خدا کے حضور کھڑا رہتا تھا اور ذوق و شوق سے نماز پڑھتا تھا، لیکن اب بجز آنکھیں بند کرنے کی کوشش کر رہا ہوں! آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور دیر تک روتا رہا! جب جذبات سکون پذیر ہوئے، تو ذہن نے ملامت کی کہ یہ وہی رسم و عادت کا ضعف ہے۔ یہ رسم و عادت کی الفت ہے۔ یہ وہی زنجیر ہے جس کے ٹوٹنے پر دماغ کی اصلی آزادی حاصل ہو جائے گی! میں نے پھر جد و جہد سے یہ جذبہ دور کرنا چاہا۔ سورج نکل آیا، مگر میں نے نماز نہیں پڑھی۔ دن بھر یہ حالت رہی کہ کبھی ملامت کا احساس جاگ اُٹھتا اور کبھی دماغ میں توہمات سے آزادی کا تمرّد غرور محسوس ہوتا!

اس کے بعد بالالتزام نماز ترک کر دی۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد عید آ گئی۔ اس میں شرکت ناگزیر تھی، چنانچہ دوگانہ عید پڑھا، لیکن پھر اِس پر سخت ندامت ہوئی اور یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ اِس سے بھی اجتناب کرنا چاہیے!

انکار و الحاد

شک و اضطراب نے جس طرح انکار و الحاد تک ارتقا کیا، اُسے مختصراً مگر ترتیب

کے ساتھ بیان کرنا چاہیے۔

اعتزالِ قدیم وجدید کے ذوق نے طبیعت میں یہ بات راسخ کر دی تھی، کہ مذہبی عقاید کا صحیح مقام، تطبیقِ عقل و نقل کے ساتھ ہے، اور یہ خیال بطورِ اصلِ اصول کے ذہن نشین ہو گیا تھا کہ وہی مذہبی اعتقاد صحیح ہے، جو عقل اور معلوماتِ مادّیہ کے مطابق ہو، علم و حقائق، قوانین قدرت، سُننِ فطریہ، یہ تمام الفاظ، نوک زبان تھے، اور ابنِ رُشد اور سر سیّد کی طرح پورا اعتقاد تھا کہ قرآن بھی اِسی کا داعی ہے اور فِطرۃَ اللہِ الّتی فطرَ النّاسَ علَیھا، اور سنّۃُ اللہ سے مقصود، یہی لاز آف نیچر اور قوانینِ مادّیہ ہیں، لیکن اس وادی میں سیر و نظر جب زیادہ بڑھی، تو معاً دوسری منزل سامنے آ گئی۔ دماغ، جو اِس معیارِ اعتقاد کا خوگر ہو چکا تھا، اِس حد پر قانع نہیں رہ سکتا تھا، جو اِس مسلک کے زعیم خواہ مخواہ بلا کسی دلیل کے قرار دے دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اساساتِ ادیان و شرائع اِسی محک کے سامنے خود بخود آ گئے اور جب کسے گئے، تو دماغ نے محسوس کیا کہ ٹھیک نہیں اُترتے۔ اِس طرف تو ذہن نہیں گیا کہ یہ کسوٹی ہی سرے سے غلط ہے لیکن عقائد کے اِذعان و یقین کا خاتمہ ہو گیا۔

اب پوری طرح شک نے جگہ پکڑ لی اور اپنے فہم و نظر کے مطابق از سرِ نو مذہب اور علومِ مذہب کا مطالعہ شروع کیا۔ اِس نے ایک دوسری مصیبت پیدا کر دی، یعنی خود مذاہب بھی باہم دگر نزاع اور صرف خلافِ تعدّد نہیں بلکہ خلافِ تضاد، اور بجائے رفعِ اختلاف اور دعوتِ یقین کے خود نفسِ مذہب کا موجبِ نزاع و خلاف اِس طرح ہو جانا کہ تاریخ جمعیتِ بشریہ میں اِس سے بڑھ کر کوئی انسانی نزاع نہیں ملتی۔ یہ قطعی ہے کہ حقیقت و صداقت میں نہ تو تعدّد ہو سکتا ہے

نہ اختلاف، اور اگر ایسا ہے، تو مختلف و متضاد صدائیں، حقیقت نہیں ہوسکتیں۔

اِس سے بھی سخت تر میری مصیبت تھی، یعنی ہر دین و تشریع کے متبعین کے داخلی اختلاف اور تعدّد و تحزّب پر نظر ڈالتا تھا، تو اُس وقت بجز اختلاف و نزاع کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ مذاہب خود مختلف، ہر مذہب میں پھر اختلاف و نزاع۔ اِن کے فروع و شُعَب میں بھی مزید تفرقہ و انشقاق، کیونکر نزاع و اختلاف کا یہ مکمل سلسلہ حق و صدق ہوسکتا ہے؟

اسلام کا اندرونی اختلاف

مجھ پر اسلام کا اندرونی اختلاف سب سے زیادہ شاق گزرتا تھا، اور نفسِ دین و وحی کے بعد اس سے زیادہ شک و انکار کی طرف لے جانے والی اور کوئی چیز نہ تھی، اِس بارے میں جس قدر پچھلے اصولِ وضعیہ، رفعِ اختلاف اور وجوہِ ترجیح و انتخاب کے لیے پیشِ نظر رہتے تھے، اور موجبِ اطمینان بھی ہو جاتے تھے، وہ ایک ایک کرکے اب آئے اور گرد و غبار کی طرح اُڑ گیے۔ کوئی بات بھی وزنی اور ٹھہرنے والی سامنے نہ آئی۔ اِس زمانے میں المعتزلہ کی ترتیب کی وجہ سے بکثرت کتب و مقالات کا مطالعہ کر چکا تھا اور کر رہا تھا۔ عقائد و کلام میں بھی نظر نسبتہً بڑھ چکی تھی۔ اور یہ بات سب سے بڑی آفت ہو گئی تھی کہ جس قدر بھی آگے بڑھتا تھا، تاریکی بڑھتی جاتی تھی اور روشنی ناپید تھی۔ اِسی زمانے میں میں نے ادیانِ مشہورہ کی طرح اسلامی مذاہب کا بھی بقدرِ امکان مطالعہ کرنا چاہا، لیکن اب مطالعہ و نظر ہی اِس زہر کی تیزی بڑھا رہا تھا، جس کا جام میرے ہاتھ میں تھا!

میرے خیالات کو ترتیب کے ساتھ اِن سوالات میں بیان کیا جا سکتا ہے:

(۱) اصحابِ اَدیان و شرائع کے مبادیات، مثلاً وجودِ باری، بقائے روح، اور معاملاتِ مَعاد، ہم کیونکر اِس کا یقین حاصل کر سکتے ہیں اور کیوں ماورائے احساس کے اعتراف پر مجبور ہوں؟

(۲) لیکن اگر حقیقت، اثبات میں ہے اور دین و شریعت، من جانب اللہ ہے، تو اُس میں اختلاف و تعدّد کیوں ہے، اور کیوں تمام نوع و عَرض پر ایک ہی دعوت نہیں بھیجی گئی؟

(۳) پھر ایک مذہب کے مان لینے کے بعد بھی نزاع و کشاکش سے نجات نہیں ملتی، کیونکہ پھر وہی یکساں دعاوی کا تزاحُم موجود ہے۔ خود اِس مذہب کی اصلیت و صداقت، متخالف دعووں میں گم ہو گئی ہے، اور ایک ایک مذہب کے پیرو، بے شمار مذہبوں میں بٹ گیے ہیں۔ اسلام میں سب سے پہلے بڑے بڑے اصولی مذاہب ہیں، مثلاً شیعہ، سنی، معتزلی، اہلُ الظواہر وغیر ذالک۔ پھر اِن کے بھی بکثرت فروع و شعُب ہیں۔ اصولی، اخباری، اشعری، حنبلی، اور مذاہبِ فقہیہ و کلامیہ۔ ایک ہی دعویٰ اور بے شمار زبانیں۔ کون سا یقینی ذریعہ ہے کہ ایک کو مان لیں اور سب کو پسِ پشت ڈال دیں؟ دعاوی یکساں، دلائل تقریباً یکساں، پیش کردہ ثمرات یکساں، جزم و اعتقاد یکساں، اور قطعی ذریعۂ ترجیح مفقود۔ ٹھیک جس طرح ایک مسیحی صرف اپنے ہی کو مستحقِ نجات سمجھتا ہے، اُسی طرح برہمن اور اُسی طرح ایک مسلمان۔ یقین کیوں کر حاصل کیا جا سکتا ہے؟ اِس کے بعد یکایک دوسرا سمندر موجیں مارنے لگتا تھا۔ خود یقین کیا ہے؟ اور یقین کیونکر حاصل ہو سکتا ہے؟

خود اُس کے وسائل اور براہین میں بھی وہی اختلاف و نزاع موجود۔

زندگی کیا ہے؟

خیالات کی بے قیدی و وحشت پھر اچانک ایک دوسری وادی کی طرف رہنمائی کرتی تھی، اور اِن تمام گوشوں سے ہٹ کر بالکل ایک نئے گوشے میں قدم پہنچ جاتے تھے۔ خود زندگی کیا ہے؟ اور زندگی کا مقصد کیا ہے؟ کیوں کر وہ یقین حاصل کیا جائے، جو زندگی اور زندگی کے مقاصد اُسی طرح واضح کر دے، جس طرح تمام محسوسات؟ ایک چیز تو یقینی ہے، یعنی وجود کے مان لینے کے بعد کیونکہ اس طرف سے بھی اطمینان نہ تھا، ہمارے محسوسات قطعی اور یقینی ہیں، اور اِس طرح ہمارے اندر یقین و علم کا اگر کوئی واسطہ رکھا گیا ہے، تو وہ احساس ہی ہے۔ پھر کیوں ایک اتنی اہم حقیقت، محسوسات سے الگ ہو کر آتی ہے، اور کیوں محسوسات میں نہیں ہے؟ صحیح یاد ہے کہ ایک دن میں نے ابن رشد کی کشف الادلہ دیکھی اور مجھے اِس درجہ وہ حقیر و ناچیز نظر آئی کہ اپنی پچھلی رایوں پر سخت تاسف ہونے لگا۔ ایک زمانے میں میں اُسے علم و حکمت کا سب سے بڑا سرچشمہ سمجھتا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ دنیا کی گمرہی اور تاریکی کا سب سے بڑا سرچشمہ، عامۃ الناس کا جہل نہیں ہے بلکہ خواصِ اہلِ مذہب کا ادعائے علم و حکمت، اور اوہامِ مذہبی کو نظریاتِ فلسفہ کی طرح ظاہر کرنے کی کوشش۔ میں نے ابن رشد کا استدلال بقائے روح پر پڑھا اور اُس کے صرف ایک معنی سمجھ میں آئے یعنی روح کا وجود ہی نہیں ہے!

مایوس سکون

رفتہ رفتہ دماغ کے عجز نے انکار کی صورت اختیار کرلی اور صاف نظر آنے لگا کہ ادعائے حکمت اور روشن خیالی کے بعد ہم جو کچھ سمجھتے رہے، وہ بھی وہم وجہل تھا، اور روز بروز انکار میں جزم وصلابت بڑھتی گئی یہاں تک کہ اضطراب کی جگہ ایک طرح کا مایوس سکون پیدا ہوگیا، گویا مشکل حل ہوگئی ہے، اور وہ یہی ہے کہ کچھ نہیں ہے۔

یہ بات نہیں ہے کہ میں نے اس مایوسی کو آسانی سے قبول کرلیا ہو۔ میری حالت ٹھیک ایسی تھی جیسے ایک شخص قید سے بھاگنا چاہے اور ہزار جتن کرے کہ کسی طرح یہ ثابت نہ ہو کہ قید کی سزا دیدی گئی ہے، لیکن بالآخر اُسے فیصلہ کانوں سے سُننا پڑے اور ماننا پڑے کہ جیل خانہ ہے اور قیدی ہوں۔ یہ اعتراف کوئی خوش گوار اعتراف نہیں اور نہ اس میں اُس کی خواہش کو کوئی دخل، لیکن اعتراف ہے اور اس لیے ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اب انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ مجھے ابتدا میں صاف نظر آتا تھا کہ یہ موت ہے اور طبیعت پوری جدوجہد کرتی تھی کہ موت ثابت نہ ہو۔ عرصے تک میرا احساس یہ رہا کہ ایک محبوب ترین متاع مجھ سے چھینی جارہی ہے اور میں نہیں روک سکتا۔ میں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مقاومت اتنی قوی ہے جس کی فتح تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں!

دماغ کا احساس یہ تھا، گویا مجھ سے باہر کوئی قوی ہستی سرگرم انکار موجود ہے، اور وہ مجھے انکار کی طرف بُلا رہی ہے۔ میری دلیلیں، عجز واضطراب کے ساتھ، ایک ایک کرکے آتی ہیں اور وہ پوری بے رحمی کے ساتھ انھیں توڑتی جاتی ہے، حتیٰ کہ میرا دامن خالی ہوگیا اور اُس (ہستی) کے حربے ویسے ہی تیز اور غیر مسخر رہے۔ ایک بے بس اور

مایوس شکست میرے حصے میں آئی اور مجھے بالآخر اُس کے آگے گر جانا پڑا۔

بسا اوقات شب کو ایسا معلوم ہوتا کہ سچ مچ کوئی قوت میرا مقابلہ کر رہی ہے، مثلاً میں اِس مُہلک انکار سے بچنے کے لیے وجوہ و دلائل اختراع کرتا ہوں" لیکن معاً متقادم قوت ایک لفظ ایسا کہہ دیتی کہ تمام تر استدلال پریشان ہو جاتا ہے۔

رونے کا جوش

باوجودیکہ طبیعت، مذہب کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکی تھی، لیکن پھر بھی کئی بار ایسا ہوا کہ طبیعت میں کسی کے آگے گِر کر رونے اور التجا کرنے کا جوش اُٹھا کہ اگر سچ مچ کوئی حقیقت و روشنی ہے، تو وہ کیوں نہیں میری راہ کی تاریکی دور کر دیتی، اور اُس سے میں نے بارہا دعائیں بھی مانگیں گھنٹوں سجدے میں پڑا رہا۔ ایک مرتبہ پچھلی پہر تک میں اِسی عالم میں رہا اور گھر میں لوگوں کو کسی حادثے یا مرض کا گمان ہو گیا، مگر مصیبت دور نہ ہوئی اور مایوس فیصلہ روز بروز قریب آتا گیا۔

میری غذا بالکل کم ہو گئی تھی۔ بھوک جاتی رہی تھی۔ سولہ سترہ برس کی عمر میں نیند اُچاٹ تھی۔ اور اگر آتی تھی، تو نہایت ہی وحشت انگیز خوابوں میں کٹتی تھی۔ میں نے اُس زمانے میں جو خواب دیکھے، وہ میرے دماغی التہاب کا ٹھیک ٹھیک عکس تھے اور ذہن و خواب کے رشتے کو ٹھیک ٹھیک واضح کرتے ہیں۔

بے بسی اور وہ بھی کیسی؟

میں نے لق و دق صحرا دیکھا، جس میں نہ ایک درخت تھا اور نہ کہیں سایہ، اور نہ کوئی حدِ انتہا۔ اچانک ریگستان میں آندھی آئی اور میں اُس میں چھپ گیا۔ سمندر دیکھا۔ میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں اور موجیں مجھے اُچھال رہی ہیں!